ہمارا انقلابی ورثہ

# اٹک پار کی یادیں

رام سرن نگینہ

ترتیب و تعارف: احمد سلیم

ہمارا انقلابی ورثہ

# اٹک پار کی یادیں

رام سرن نگینہ

ترتیب و تعارف: احمد سلیم

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430

نام کتاب : اٹک پار کی یادیں

مصنف : رام سرن نگینہ

ترتیب و تعارف : احمد سلیم

پبلشرز : فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ، لاہور

فون:7249218-7237430

اہتمام : ظہور احمد خاں

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز

سرورق : عباس

اشاعت : 2009ء

قیمت : -/240 روپے

ہیڈ آفس : 18- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور

124- ٹیمپل روڈ لاہور

سب آفس حیدر آباد

52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدر آباد

022-2780608

# انتساب!

یہ مجموعہ معنون کرتا ہوں،

شہدائے ''پشاور'' کے نام۔۔۔ شہدائے ''ٹکر'' کے نام۔۔۔ شہدائے ''ہاتھی خیل'' کے نام۔۔۔ اور ہندوستان بھر کے سرفروش نوجوانوں کے نام۔۔۔

جنہوں نے اپنے شباب کی رعنائیاں قربانگاہِ حریت پر نچھاور کر دیں۔

جنہوں نے بھوکے، ننگے، محتاج اور ستم رسیدہ ہندوستانیوں کے لئے مردانہ وار گولیاں کھائیں، پھانسی پر چڑھے، سپردِ آتش ہوئے، جیل کی صعوبتیں برداشت کیں، مالی نقصان اُٹھایا۔

جنہوں نے اپنے گرم گرم خون سے نخلِ حریت کو سینچا۔

نگینہ سرحدی

# فہرست

## دوسرا حصہ: دستاویزات

# سلگتی جوانیوں کی رام کہانی

رام سرن نگینہ تحریک آزادی کے ہراول دستے میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے قریبی ساتھی اور پیروکار تھے۔ مولانا عبدالرحیم وحدت الوجود اور وحدت ادیان کو ماننے والے حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر سے وابستہ بزرگ تھے اور سیاسی کارکنوں خصوصاً غیر مسلموں کی عملی رہنمائی کے لئے فکر ولی اللہی کا سیاسی ترجمہ سوشلزم کی مروجہ اصطلاح ہی ہوتا تھا۔ یہ اصطلاح اُس وقت سب سے زیادہ پسماندہ اور زیر عتاب مسلمان آبادی کی بحالی اور قلیت ہونے کے باوصف دوبارہ حکمرانی کا واحد نسخہ بھی تھی۔ نیز مفت عالمی اشتراکی پروپیگنڈے کی سہولت کی وجہ سے مفلوک الحال عوام کو مقامی اور غیر ملکی غاصبوں سے نجات کا راستہ اسی میں نظر آتا تھا۔ نئے سرے سے اس فلسفے کو سمجھا کر سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بلاشبہ مظالم واستحصال کے شکار غیر مسلم بھی صرف اسی ذریعے سے غیر ملکی آقاؤں سے آزاد ہوسکتے تھے۔

رام سرن نگینہ اُن نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے بھوکے، ننگے، بے سروسامان ہم وطنوں کی حالت بدلنے کے لئے خود فاقہ کشی، قربانی اور جیلوں کی صعوبتوں کو گلے سے لگا کر پوری زندگی جدوجہد کرنے کا راستہ منتخب کرلیا تھا۔ انہوں نے آخری دم تک شادی نہ کی اور سیاسی آزادی کے حصول کی منزل، اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بے سروسامانی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔

رام سرن نگینہ اور اُن کے ساتھیوں کی سیاسی جدوجہد کا امتیازی وصف یہ تھا کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے محکوموں کے دلوں سے انگریز حکمرانوں کا رعب دور کیا۔ اس صوبے میں رائج جابرانہ قوانین برطانوی ہند کے زیر تسلط دوسرے صوبوں میں رائج نہ تھے اور اس صوبے میں کوئی عام شخص جیل کی رونگٹے کھڑے کردینے والی اذیتوں کے ڈر سے انگریز حاکموں کے خلاف حرف

شکایت بھی زبان پر نہ لاسکتا تھا۔ ویسے بھی کانگریس اور مسلم لیگ سمیت اکثر سیاسی تحریکیں عملاً عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے ہندو، پارسی سرمایہ دار اور مسلمان جاگیردار کو انگریز بہادر کا جانشین بنانے کے پروگرام کو ملک کی آزادی قرار دیتی تھیں۔ یہ رام سرن نگینہ جیسے گرم خُو سیاسی عناصر کی بے مثال جرأت اور قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ 1930ء میں قصہ خوانی کا پُر تشدد معرکہ برپا ہوا اور 1942ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک عافیت پسندی کے راستے سے ہٹ کر پُر تشدد انقلاب کی تحریک بن گئی جس سے کانگریس اور انگریز دونوں کے سیاسی تجزیے دھرے کے دھرے رہ گئے اور انتہا پسندوں کی پیش قدمی کے خوف سے انگریزوں کو عجلت میں ملک چھوڑنا پڑا۔ عدم تشدد پر کاربند کانگریس کی پُر تشدد تحریک کے ذریعے کامیابی کا دائیں بازو کے کانگریسی دانشوروں کے پاس اب تک کوئی تسلی بخش جواب دستیاب نہیں ہوسکا۔ ہندو مسلم فسادات اور پاک ہند جنگوں نے اہنسا کے ان دانشوروں کی پوزیشن اور بھی کمزور کردی۔

آج سے کوئی ربع صدی پیشتر میں نے مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی سیاسی جدوجہد پر مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ مولانا پر کام کرنے والوں میں اُن کے روحانی اور مسلمان سیاسی شاگردوں کے علاوہ بعض غیر مسلم بھی پیش پیش تھے۔ ان غیر مسلم پیروکاروں میں سرفہرست رام سرن نگینہ کا نام تھا۔ رام سرن نگینہ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی متعدد تحریریں بھی میرے ہاتھ لگیں جن سے میں نے تاریخی کتابیں مرتب کرنے میں خاصی مدد لی۔ ''تحریک خلافت و ہجرت'' اور پولیٹیکل کانفرنس پشاور 1945ء پر لکھی ہوئی رام سرن نگینہ کی کتابیں مطبوعہ کاپیوں کی صورت میں مل گئیں۔ بعض پمفلٹ اور ہینڈ بل بھی دستیاب ہوئے جو رام سرن نگینہ کی طرف سے تحریک کے لئے چھپوائے گئے تھے۔ اس مواد کو یکجا کر کے چھپوانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی پبلشر مارکیٹ میں اس قسم کی کتب کی فروخت کے بارے میں پُرامید نہیں ہے حالانکہ اس قیمتی تاریخی سرمائے کو محفوظ کرنے کے لئے میں غیر مشروط طور پر بلا معاوضہ پبلشر کے حوالے کرنے پر تیار تھا۔ اُدھر دہلی سے رام سرن نگینہ کے خطوط بھی آتے رہتے تھے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب پر کتاب کی اشاعت کے لئے انہیں تحریری مواد درکار ہے۔ بعض خطوط مل جاتے تھے اور بعض سنسر کی نذر ہو کر خفیہ فائلوں میں لگا دیئے جاتے تھے۔ تاہم پاکستان اور ہندوستان کے کشیدہ حالات کے باعث یہاں سے کچھ مواد بھیجنا ممکن نہیں ہوسکا۔ اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں

کہ زیرِ نظر کتاب میں بھی رام سرن نگینہ نے جو کچھ تحریر کیا، اس میں انہیں صرف اپنی یادداشت پر انحصار کرنا پڑا ہوگا۔

جنوری 1970ء میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے بارے میں اُن کے روحانی شاگرد اور سیاسی رفیق عمر فاروق خان ملک پوری (برادر حاجی فقیرا خان سابق ممبر لیجسلیٹو اسمبلی) کی کتاب سندھ ساگر اکیڈمی لاہور نے شائع کی۔ اس کی اشاعت میں زیادہ تر پروفیسر محمد سرور تلمیذ، مولانا عبیداللہ سندھی کی کاوشوں کو دخل تھا۔ بعد میں پروفیسر محمد سرور صاحب نے راقم سے اس بات کا اظہار بھی کیا تھا کہ مولانا صاحب پر مفصل مواد دستیاب ہو جانے کے بعد اُن پر زیادہ تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

1983ء میں پروفیسر محمد سرور صاحب کا انتقال ہو گیا اور ہم فلسفہ ولی اللہی کے ایک بلند پایہ عالم اور دانشور سے محروم ہو گئے۔

جو ریکارڈ میں جمع کر چکا تھا، اس کو پہلی بار تفصیل سے منظرِ عام پر لانے اور محفوظ کرنے کا اصل کریڈٹ جناب احمد سلیم صاحب کو جاتا ہے۔ وہ اپنی تلاش و جستجو کی وجہ سے جناب افراسیاب خٹک صاحب کے ذریعے مجھ تک پہنچے اور جلد ہی میری تین کتابیں چھپوا کر ملک بھر میں متعارف کرا دیں۔ اُنہی کی کاوشوں سے کتابوں کی مارکیٹ میں اس قسم کے تاریخی مواد کی مانگ پیدا ہوئی اور اس سلسلے کی تین مزید کتابیں لاہور کی الحمود اکیڈمی نے بھی چھاپ دیں۔ احمد سلیم صاحب کی شائع کردہ کتابوں کی وجہ سے پی ٹی وی پر ''وفا کے پیکر'' کے نام سے طویل دورانیہ کا ڈرامہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی جدوجہد آزادی پر ٹیلی کاسٹ کیا جا سکا۔ اس کے علاوہ نئی نسل کو اپنی اصل عوامی تاریخ کے انکشافات پر اتنی خوشی ہوئی کہ یکم مئی 2001ء کو اہلِ ہزارہ نے سردار محمد یوسف کی سرپرستی میں ایک بہت بڑی کانفرنس ظفر پارک مانسہرہ کے مقام پر منعقد کروائی جس میں راقم حقیر فقیر کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔ وہاں راقم کی کتابوں کے سٹال لگائے گئے اور ہزار ہا افراد سے کھچا کھچ بھرے اجتماع میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے حوالے سے راقم کو متعارف کروایا گیا۔ اجتماع میں ہر مکتبِ فکر کی مذہبی، سیاسی اور ترقی پسند جماعتیں شریک تھیں۔ ہزارہ کے مظلوم عوام مولانا کا پوتا ہونے کی وجہ سے راقم کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مولانا فدا الرحمان درخواستی سمیت کئی دیگر رہنماؤں نے بھی تقریریں کیں۔ ہر طرف مولانا

عبدالرحیم پوپلزئی امام حریت کے نام کے بینر لہرا رہے تھے۔ حکیم عبدالسلام ہزاروی، ملک امیر عالم اعوان، حاجی فقیرا خان، عمر فاروق خان ملک پوری کے ناموں کے بینر بھی آویزاں تھے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے پوسٹر بھی لگائے گئے تھے۔ ان میں راقم حقیر فقیر کا نام بھی تھا۔ سردار محمد یوسف بار بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے ہیں۔ اُن کی ذات میں سادگی کے باوجود حد درجہ کشش تھی جس نے ہر عام وخاص کو اُن کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ تمام ایم این اے اور ایم پی اے صاحبان اُن کے مداح تھے۔ پیر صاحب ولی رحمن سجادہ نشین ایم پی اے، طارق سواتی ایم پی اے اور سردار وجیہہ الزمان خان سابق وزیر صحت تو اُن کی عقیدت ومحبت میں بے حد سرشار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نواب زادہ وجیہہ الزمان جو نواب خان بدیع الزمان کے پوتے ہیں، آگے بڑھے اور اس حقیر فقیر کے لئے ایک صوفہ نما آرام کرسی لا کر سٹیج پر سردار محمد یوسف کے برابر میں رکھ دی۔ انہوں نے جب اصرار کر کے راقم کو وہاں بٹھایا تو راقم کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ خان بدیع الزمان خان کے زمانے میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، اُن کے مزارعین پر ظلم وستم بند کروانے ہزارہ گئے تھے۔ وہاں پر مولانا پر قاتلانہ حملے کروائے گئے۔ آج مولانا کی کرامت خود دیکھی کہ خان وجیہہ الزمان خان اعلیٰ اخلاق اور قابلیت کا نمونہ بن کر مزارعین اور غریبوں کی خدمت میں مصروف تھے۔ وہ سردار محمد یوسف کو ہی اپنا اصل سرپرست اور بزرگ قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں نے لاکھوں روپے خرچ کر کے حضرت امام حریت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اور دیگر مشاہیر آزادی کی یاد میں اتنے بڑے جلسہ عام کا انعقاد کیا تھا۔ ہر طرف سے دن بھر موٹریں، بسیں اور دوسری سواریاں جلسہ گاہ کی طرف آ رہی تھیں۔ راقم کو پہلے قراقرم ہوٹل اور پھر مشہور وکیل شاہنواز عاصم کے بنگلے پر ٹھہرایا گیا اور بہت زیادہ آؤ بھگت کی گئی۔ سردار محمد یوسف کا حلقہ قومی اسمبلی پاکستان بھر میں سب سے بڑا حلقہ ہے۔

راقم نے ''ہزارہ کے مظلوم عوام اور علامہ عبدالرحیم پوپلزئی'' کتاب مرتب کرنے کے لئے رام سرن نگینہ کے قلمی نوٹس اور رجسٹر سے بڑی مدد لی تھی۔ سردار محمد یوسف نے بازار میں موجود اس کتاب کی ساری کاپیاں خرید لیں۔ یہ سب دیکھ کر راقم کو جناب احمد سلیم صاحب بہت یاد آئے جن کی کوششوں کے سبب نصف صدی پرانی تاریخ بازیاب ہو سکی تھی۔

زیر نظر کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ واحد سیاسی کتاب ہے جس پر باچا خان نے اُردو

دیباچہ تحریر کیا ہے۔اس سے پہلے رام سرن نگینہ اپنی ایک اور کتاب ''سرخ پوش کسان'' پر مولانا عبدالرحیم پوپلزئی سے مقدمہ لکھوا کر چھپوا چکے تھے۔ چند سال قبل مرحوم بزرگ محترم انور خان دیوانہ کی کوششوں کی وجہ سے بھارت کی سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری برج موہن طوفان سے رام سرن نگینہ کی کتاب ''اٹک پار کی یادیں'' فوٹوسٹیٹ کروا کے منگوائی گئی۔ کتاب پر شری برج موہن طوفان کے دستخط بھی ہیں۔ جب برج موہن طوفان پاک انڈیا پیپلز فورم کے زیر اہتمام پاکستان آئے تو میری اُن سے بھی ملاقات کروائی گئی۔ برج موہن طوفان رام سرن نگینہ کے ساتھی رہے ہیں۔وہ اُنکے بہت معترف تھے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شری رام سرن نگینہ صوبہ سرحد کی دو شخصیات یعنی علامہ عبدالرحیم پوپلزئی اور خان عبدالغفار خان سے کس قدر قریب رہ چکے تھے۔وہ اُن کے جیل کے ساتھی بھی تھے۔

مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے ساتھ رام سرن نگینہ کی والہانہ عقیدت کا یہ حال تھا کہ جب مولانا پوپلزئی 18 فروری 1935ء کو فریضہ حج کی ادائیگی کے سلسلے میں روانہ ہونے لگے تو رام سرن نگینہ نے بھی پشاور سے نوشہرہ تک اُن کے ساتھ سفر کیا۔

اس کے بعد مولانا پوپلزئی کو 10 اپریل 1940ء کو فقیر ایپی کا وہ دردناک خط ملا جو راقم کے پاس محفوظ ہے تو مولانا اپنی 15 سالہ بیٹی کو بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتا چھوڑ کر فور بنوں کے دورے پر روانہ ہو گئے۔

رام سرن نگینہ یہاں بھی مولانا کے ساتھ تھے۔حالانکہ یہ دورہ اسلامی جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کو فقیر آف ایپی کی ہر ممکن مدد پر آمادہ کرنے کے لئے تھا۔مولانا صاحب نے مسجدوں اور دیگر مقامات پر جتنے لوگوں سے خطاب کیا اور فقیر ایپی کا ساتھ دینے کا قول و قرار حاصل کیا، رام سرن نگینہ اُن کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ بنوں میں ہی مولانا صاحب کو مقدمہ بغاوت میں گرفتار کر کے قید تنہائی کی تاریک کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔یہ قید بامشقت جس میں مولانا کو بیڑیاں بھی پہنائی گئیں تھیں، ان کی زندگی کی آخری قید تھی۔رام سرن نگینہ مولانا صاحب کی گرفتاری کے دوران اُن کا اشارہ پا کر روپوش ہو گئے۔ادھر مولانا کی گرفتاری کے بعد اُن کی بیمار بیٹی اللہ کو پیاری ہو گئی۔اُس زمانے میں مولانا کے اکلوتے بیٹے عبدالرؤف سخت بیمار ہوتے۔ڈاکٹر سی سی گھوش

(صدر کانگریس کمیٹی) علاج کے لئے آئے تو اندھیرا پا کر ''بتی جلاؤ''''بتی جلاؤ'' کہتے رہے اور بتی نہ ہونے کی وجہ سے مایوس واپس چلے گئے۔

بعد میں جب رام سرن نگینہ بھی قید ہو کر جیل پہنچے تو مولانا پوپلزئی کے ساتھ آخری بار جیل میں رہنا نصیب ہوا۔ اس دوران وہ وقت بھی آیا جب رام سرن نگینہ نے اپنے آئیڈیل مولانا پوپلزئی اور باچا خان کی تقلید میں رمضان المبارک کے روزے بھی رکھنے شروع کر دیئے۔ جنگ آزادی کے رہنماؤں سے اس قدر گہری عقیدت کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملیں گی۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئی

نبیرہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

مورخہ یکم مارچ 2005ء

# تعارف

دیر آید، درست آید کے مصداق، یہ کتاب بالآخر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ یادیں اور یادگاریں ہیں ان وطن پرست انقلابیوں کی، جنہوں نے اپنی بھرپور جوانیاں حتیٰ کہ بڑھاپا تک وطن کی آزادی کی نذر کر دیا۔ اٹک پار کی پُراسرار دنیا کا یہ پہلو نمایاں طور پر کبھی سامنے نہیں آیا۔ اس کا تفصیلی تعارف ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئی اپنے پیش لفظ ''سلگتی جوانیوں کی رام کہانی'' میں پیش کر چکے ہیں۔ میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ سلگتی جوانیوں کی یہ کہانی ابھی تک لکھی جا رہی ہے۔

زیر نظر کتاب دو بنیادی حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ غلّہ ڈھیر کسان تحریک کے روحِ رواں رام سرن نگینہ کی ان یادوں پر مشتمل ہے۔ جو واہگہ پار سے بھٹکتی، کسی طرح اٹک پار آ پہنچی ہیں۔ تین دہائیاں قبل یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر پوپلزئی کی عنایت سے اس کی ایک نقل ہم تک بھی پہنچی، ہم نے فوراً اس کی از سرِ نو اشاعت کا سوچا۔ ڈاکٹر پوپلزئی نے ہمیں ایک اور کتابچہ بھی عنایت کر رکھا تھا جو 1945ء میں منعقد ہونے والی پشاور پولیٹیکل کانفرنس کی تفصیلی روداد تھی، ہم اسے بھی دوبارہ شائع کرنا چاہتے تھے تاکہ آزادی کی جدوجہد کے اس پڑاؤ کو تحریک آزادی کے ریکارڈ کا حصہ بنایا جا سکے۔

جب ہم نے ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھا تو محسوس ہوا کہ انہیں ایک ساتھ شائع ہونا چاہئے لیکن یہ اندازہ بھی ہوا کہ کہیں کہیں خلاء رہ گیا ہے جسے پُر کئے بغیر بات واضح نہیں ہو گی۔ خالی جگہیں پُر کرنے کی اس مشق کے دوران کتاب موجودہ شکل اختیار کر گئی۔ پہلا حصہ کامریڈ رام سرن نگینہ کی کتاب کا متن اور دوسرا حصہ ان دستاویزات کا مجموعہ ہے۔ جن سے کہانی کو مکمل کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔

پہلے حصے میں کہیں کہیں لفظی تدوین کی گنجائش تھی جو میں نے کر دی ہے لیکن کوشش کی ہے کہ

متن میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آنے پائے چنانچہ چند لفظی تبدیلیوں کے سوا، پہلے حصے کا متن کتاب میں جوں کا توں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سے قارئین رام سرن نگینہ کے اصل طرز بیان کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

اپنی یادوں میں نگینہ نے صوبہ سرحد کی انقلابی سرگرمیوں خصوصاً سانحہ قصہ خوانی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ کہانی کا آغاز اس قبائلی جدوجہد سے ہوتا ہے جو پشتون سرزمین کے انقلابی قبائل نے انگریز سامراج کے خلاف شروع کر رکھی تھی۔ ان کی پیروی اور ہمنوائی میں کئی ہندو، مسلمان انقلابیوں مثلاً برج موہن طوفان، شری رام چندر، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، مولانا مقبول الرحمان سرحدی، شہید ہری کشن اور ان کا انقلابی خاندان پیش پیش رہے ہیں۔

بچپن سے ہی انقلابی سرگرمیوں کی طرف راغب ہو جانے والے رام سرن نگینہ نے سکول کی کتابیں پھینک کر اس وقت قصہ خوانی بازار کا رخ کیا جب وہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی پھر تو سلسلہ ہی چل نکلا اور انہیں قومی سکول سے نکال دیا گیا۔ جلد ہی انہوں نے کتابچہ "خون کا بدلہ خون" شائع کیا اور جیل پہنچ گئے جہاں انہیں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے نیاز حاصل ہوئے۔ جیل میں ان کی ملاقات نوجوان بھارت سبھا، صوبہ سرحد کے انقلابیوں سے بھی ہوئی۔

قصہ خوانی بازار کا قتلِ عام، جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے بعد سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن پشتون سرزمین پر یہ سلسلہ یہیں پر نہیں رک گیا، 31 مئی 1930ء کو سردار گنگا سنگھ کے دو معصوم بچوں کی شہادت اور اس کے ردِعمل میں عوامی احتجاج سے پشاور ایک بار پھر لالہ زار بن گیا۔

پھر جب 23 مارچ 1931ء کو لاہور سنٹرل جیل میں بھگت سنگھ، راجگورو اور سکھدیو کو پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا تو پورا پشاور سڑکوں پر اُمڈ پڑا جس میں جوان لڑکیاں اپنی چوڑیاں توڑ رہی تھیں۔ پشاور کے ایک نوجوان عبدالرشید اور ڈیرہ اسماعیل خان کے "پریتم خان" نے ان پھانسیوں کا بدلہ لیا اور خود بھی موت کے رسّوں پر جھول گئے۔

رام سرن نگینہ اپنی کتاب کی ایک ایک سطر میں پشاور کو یاد کرتے ہیں۔ وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے لیکن نگینہ حریت پسندوں کے اس تاریخی شہر کو جس طرح یاد کرتے ہیں، اس طرح شاید ہی کسی نے اپنے وطن کو یاد کیا ہو۔ یہ شہر ہندوستان میں ہندو مسلم یکجہتی کا بہت بڑا مرکز تھا، جہاں ہندو عورتیں مسلمان مجاہدوں کی پیشانی پر تلک لگاتیں اور مسلمان عورتیں ہندو جانبازوں پر

گلاب چھڑکتیں۔ ہندو لیڈر مسجدوں کے میناروں پر کھڑے ہو کر آزادی کے گیت گاتے اور مسلمان رہنما مندروں میں آ کر لوگوں کو دیش بھگتی کا درس دیتے۔

نگینہ 1931ء میں رہا ہوئے تو محلے میں نظر بند کر دیئے گئے۔ محلہ کیا ہوا، ایک چھوٹا سا جیل خانہ بن گیا۔ پشاور کے مشہور بازار کریم پورہ سے ملحق اس علاقے میں درجن بھر انقلابی نظر بند کئے گئے تھے، جن میں ایک انقلابی ماں لکو دیوی بھی شامل تھی۔ یہ نظر بند، کوئی نہ کوئی ترکیب لڑا کر محلے سے ادھر اُدھر ہو جاتے اور پولیس کی پریشانی کا باعث بنتے تھے۔

لاہور سے ''لال ڈھنڈورا'' نامی پوسٹر نکلنے شروع ہوئے تو پشاور کے انقلابیوں نے ''لال جھنڈا'' کے نام سے پہلا پوسٹر شائع کیا اور پھر یہ سلسلہ چاروں طرف پھیل گیا۔ اتوار کی ایک صبح ایسا ہی ایک پوسٹر چوک یادگار کے سائن بورڈ پر نظر آیا جس میں صوبے کے نوجوانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تمام کام کاج چھوڑ کر حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچم اٹھا لیں، خفیہ پوسٹر شائع کریں، بم بنائیں، ڈاکے ماریں، مفروروں کو پناہ دیں، باغی اڈے قائم کریں، خفیہ پریس تیار کریں۔ پوسٹر کے آخر میں لکھا تھا:

''یہ پریس کھریا مٹی اور گلیسرین سے بنایا جا سکتا ہے۔''

نگینہ ان پوسٹروں کی اشاعت اور پھیلاؤ میں پیش پیش تھے۔ اس لئے انہیں بے بس کرنے کے لئے پولیس نے ان کے بوڑھے باپ کو گرفتار کر لیا۔ ایک بار پولیس نے خفیہ پوسٹروں کی اشاعت کے سلسلے میں چند کم سن لڑکوں کو گرفتار کر لیا لیکن وہ بھی پولیس کے آلہء کار نہ بن سکے۔

اس طرح راولپنڈی سے پروفیسر راج تلک چڈھا ''بالشویک'' نامی پمفلٹ نکالا کرتے تھے۔ اسے پشاور پہنچانا اور تقسیم کرنا نگینہ کی ذمہ داری تھی، حتیٰ کہ وہ ان پمفلٹوں کو ایک بار کابل پہنچانے میں بھی کامیاب رہے۔

1938ء میں رام سرن نگینہ دو برس کی سزا پا کر پھر پشاور جیل پہنچے جہاں انہوں نے اپنے حقوق کے لئے 29 دن کی تاریخی بھوک ہڑتال کی اور اپنے مطالبات منوائے۔ قید و بند کا یہ سلسلہ 1947ء تک چلتا رہا۔ ان دنوں صوبہ سرحد سمیت ہندوستان کی جیلوں میں بیدزنی کے واقعات عام تھے جن میں سے کئی ایک کا ذکر نگینہ نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ قیدیوں پر تشدد اور ایذا رسانی کے مختلف حربے آزمائے جاتے انہیں پاگلوں کے ساتھ رکھا جاتا۔ مصنف نے ایسے متعدد

واقعات اپنی اس یادگار کتاب میں محفوظ کر دیے ہیں۔

سبھاش چندر بوس کے پشاور سے فرار میں مدد دینے کے جرم میں 24 مئی 1941ء کو رام سرن نگینہ ایک بار پھر دھر لیے گئے۔ ان سے پہلے ان کے چند ساتھی لالہ جوالہ داس دھون، کامریڈ دوارکا ناتھ باغی، چونی کاوش، میاں احمد شاہ بیرسٹر اور سردار سرن سنگھ پشاور سنٹرل جیل پہنچ چکے تھے۔ اس بار وہ عام حوالاتی نہیں بلکہ وائسرائے کے تحت مرکزی حکومت کے نظر بند ٹھہرائے گئے۔ جہاں ان کی ملاقاتیں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی سے بھی ہوتی تھیں۔ چند ہی روز بعد ایک رات انہیں اور میاں احمد شاہ کو اچانک پشاور سنٹرل جیل سے نکال کر ہری پور سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا جہاں سچ مچ کے شاہی مہمان کی طرف ان کی آؤ بھگت ہوئی۔

''نظر بندی'' کے عنوان سے انہوں نے اپنی اس نئی جیل یاترا کی دلچسپ داستان قلم بند کی ہے۔ کچھ عرصہ بعد مولانا پوپلزئی اور باچا خان بھی یہیں لائے گئے۔ اس بار یہ نظر بندی لگ بھگ پانچ برسوں تک پھیل گئی لیکن جب وہ رہا ہوئے تو قیدی ساتھیوں سے بچھڑنے کے غم میں ان کی آنکھیں نم تھیں۔

''غلام حسین'' کے عنوان سے ایک باب میں، فرنٹیئر کانگرس کمیٹی کے ہمہ صفت چپڑاسی کے اعلیٰ کردار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وہ بھی ہری پور جیل میں نگینہ کے ہمراہ قید رہا تھا۔ غلام حسین نے ریفرنڈم کے دنوں میں اپنی جان پر کھیل کر پہلے دو ہندو لڑکیوں کی جان بچائی۔ انہیں ان کے گھر تک پہنچایا اور پھر واپس دفتر آ کر دو ہندو کانگرسی ساتھیوں کی حفاظت کے لئے ساری رات جاگتا رہا۔ ہندو لڑکیوں کی جان بچانے پر نگینہ لکھتے ہیں۔

''اس نے آج اسلام کی عزت کو چار چاند لگا دیے تھے۔''

''تاریک دن، تاریک راتیں'' کتاب کا خاص باب ہے جس میں 1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات، ہندوؤں، سکھوں پر حملوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی جانیں بچانے کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بابو نام کا ایک غنڈہ کئی ہندوؤں کی جانیں بچانے میں پیش پیش تھا۔ حتیٰ کہ کئی مسلم لیگیوں نے بھی ہندوؤں، سکھوں کی حفاظت کی، اور ایسے ہی کئی دوسرے واقعات اس کتاب کا حصہ ہیں۔ اسے کئی برس پہلے پاکستان میں چھپ جانا چاہیے تھا بہر حال یہ کتاب تاریخ کا وہ ریکارڈ ہے جو اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ان دستاویزات پر مشتمل ہے جن کا کتاب میں درج بیشتر واقعات سے تعلق ہے۔ پہلی دستاویز، پشاور کی پولیٹکل کانفرنس کی روداد ہے جو 1945ء میں منعقد ہوئی۔ یہ روداد بھی رام سرن نگینہ نے قلم بند کی ہے اور اس کا مقدمہ فخرِ افغان خان عبدالغفار خان نے لکھا تھا جبکہ اس کا دیباچہ اس دور کے پشاور کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری لالہ افضل خان نے ''مدعائے تصنیف'' کے عنوان سے لکھا اور کہا کہ ''صوبے میں سیاسی بیداری کا چراغ جگمگا رہا ہے۔'' یہ دستاویز بھی برسوں پہلے ڈاکٹر عبدالجلیل نے عنایت فرمائی تھی جو اب اس کتاب کا حصہ بن کر محفوظ ہوگئی ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر قصہ خوانی کے شہداء کی یادگار پر پھولوں کی بارش کی گئی تھی۔

دوسری دستاویز میں قصہ خوانی کو ''لہو سے شرابور زمین'' کا نام دیا گیا ہے جبکہ تیسری دستاویز میں قصہ خوانی فائرنگ کے ساتھ (60) شہداء کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ یہ فہرست ایک مسلمان مجاہد آزادی اویس قرنی رودلوی نے مرتب کی ہے، جسے ہم ان کے شکریے کے ساتھ شاملِ اشاعت کر رہے ہیں۔ اسے آپ نگینہ کے قصہ خوانی والے ابواب کے تسلسل میں پڑھیں گے تو بات زیادہ بامعنی ہو جائے گی۔ اویس قرنی کا ایک اور تفصیلی مقالہ ''منجدھار میں چھوڑ دیا'' کتاب کی پانچویں دستاویز ہے جس کے بارے میں مصنف خود تذبذب کا شکار ہونے کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ''کانگریس کی پوری تاریخ میں اگر کوئی دھبہ نظر آتا ہے تو صرف یہی ہے کہ اس نے اپنی ایک خاص شاخ صوبہ سرحد کو وقت پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔'' بہرحال آپ خود پڑھیے اور فیصلہ کیجئے۔

چوتھی دستاویز شہید ہری کشن کی شہادت کی کہانی بیان کرتی ہے۔ ہری کشن جنوری 1908ء میں ضلع مردان کے ایک چھوٹے سے گاؤں غلہ ڈھیر میں پیدا ہوا۔ دسمبر 1930ء میں اس نے پنجاب یونیورسٹی کے کانووکیشن میں گورنر پنجاب پر گولی چلائی، گورنر بچ گیا لیکن سکھ تھانیدار چنن سنگھ مارا گیا۔ اسی غلہ ڈھیر سے بعدازاں سرخ کسان تحریک ابھری جس کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔ بھگت سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں راجگورو اور سکھدیو کی طرح ہری کشن کو بھی سزائے موت دے کر 9 جون کو میانوالی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ ہری کشن کے بارے میں یہ تحریر لاہور کے معروف صحافی رنبیر نے قلم بند کی ہے۔ غلہ ڈھیر کسان تحریک کے حوالے سے رام سرن نگینہ نے ''سرخ پوش کسان'' کے نام سے ایک الگ کتاب لکھی تھی جو ڈاکٹر عبدالجلیل کی کاوش سے

دوبارہ شائع ہوئی لیکن آجکل پھر نایاب ہے۔

''اٹک پار کی یادیں'' اور ان سے متعلقہ دستاویزات کا انتخاب بالآخر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ یہ کتاب ان شہیدوں اور آزادی کے متوالوں کی داستان ہے جسے بار بار دہرائے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ اور ایسی ہی اور کتنی داستانیں وقت اور تاریخ کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں، ضرورت ہے کہ ان پر سے وقت کی گرد جھاڑ کر انہیں از سرِ نو محفوظ کیا جائے۔ یہ ہمارا انقلابی ورثہ ہے جسے موجودہ پاکستان کی انقلابی تحریکوں کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ مستقبل کے پاکستان کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ بنایا جا سکے۔ اسی اُمید اور اسی جذبے کے ساتھ یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔

احمد سلیم

5 جون 2009ء

پہلا حصہ

# متن

# آزاد قبائل سے دیو بند تک

''پختونوں کا علاقہ ایک ایسا بارود خانہ ہے جہاں ادھ بجھی چنگاری بھی قیامت اُٹھا سکتی ہے!'' یہ الفاظ ایک انگریز مدبر نے اُس وقت کہے تھے جب انگریزی حکومت اٹک پار کی ٹیڑھی میڑھی وادیوں میں قدم رکھ رہی تھی۔ پٹھان فطرتاً آزادی پسند ہے۔ غلامی سے اُسے نفرت ہی نہیں چڑ بھی ہے۔ مغلوں کے خلاف پختونوں کی طویل جنگ اس امر کا زندہ ثبوت ہے۔ خوشحال خان خٹک کی ساری زندگی اورنگ زیب عالمگیر کی ملوکیت پرستی کے خلاف گذری۔ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کو برداشت نہ کر سکا، باوجود اس کے کہ اورنگ زیب ایک ایماندار، پرہیز گاری، متقی اور نیک بادشاہ تھا، وہ مسلمان بھی تھا لیکن آزادی اور غلامی کے سوال پر مذہب کا پاکیزہ جذبہ بھی اثر انداز نہ ہو سکا اور پھر جنگ 1857ء کے شعلے بلند ہوئے تو بھی پختون اس آگ میں کودے بغیر نہ رہ سکے۔ پشاور میں سر عام پختون فوجیوں کو محض اس بناء پر توپوں سے داغ دیا گیا تھا کہ وہ آزادی کے نعرے لگا رہے تھے اور ان فلک شگاف نعروں میں صرف فوجی یا شہر کے لوگ ہی شامل نہ تھے بلکہ ٹیڑھی ترچھی وادیوں، اونچے اونچے پہاڑوں اور خوفناک تنگ وادیوں کے پٹھان بھی مردانہ آزادی کے ترانے گاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے، جب انگریز نے اٹک کے اُس پار کے باشندوں کو اپنی گرفت میں لانا چاہا تو آگ اور زیادہ بھڑکی۔ شہر، گاؤں اور قبائل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والا پٹھان بظاہر انگریز کا غلام ہو گیا۔ لیکن آزادی کا جذبہ سینوں میں پھر بھی اُبھرتا رہا اور قبائل تک برطانوی ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ وہ بدستور آزاد رہے۔ کل بھی آزاد تھے اور آج بھی آزاد ہیں۔ وہاں نہ انگریز کا جادو چل سکا نہ مسٹر خان کا! نہ ہندو دھرم کے ٹھیکے داروں کی کوئی چال کارگر ہو سکی نہ فرقہ پرستی اپنے پاؤں جما سکی۔ اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعروں سے وہاں کی پُر امن فضائیں پراگندہ نہ ہو سکیں، نہ وہاں ننگی عورتوں کے جلوس نکالے گئے

اور نہ عورتوں، مردوں کو نیزوں پر اچھالا گیا، آزاد قبیلے لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت اور آتش زدگی سے بالکل محفوظ رہے اور آج بھی وہاں ہندو سکھ بستے ہیں، آج بھی انہیں مسلمانوں نے اپنی چھاتی سے لگا رکھا ہے۔ اُن کا ایک ہی نعرہ ہے ہم آزاد تھے، آزاد رہیں گے۔ پختونوں کے یہ آزاد قبیلے ہندوستان کی آزادی کے لئے بھاری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، آزادی ہند کی ابتدائی تجاویز انہی قبائل میں زیر بحث رہیں۔ مجاہدانہ سرگرمیوں کا آغاز پہلے یہیں سے ہوا۔ ''بالاکوٹ'' کا مقام کون بھول سکتا ہے جہاں سید احمد، مولانا محمد اسماعیل اور اُن کے کئی ساتھی جام شہادت کو پی گئے۔ سیّد احمد شہید متواتر چھ برسوں تک آزادی کی تحریک کو قبائل میں سرگرمی سے چلاتے رہے۔ شاہ عبدالعزیز نے کافی سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کی بجائے شمال مغربی صوبہ سرحد کو ہی محاذ جنگ بنایا جائے اور اس طرح سے افغانستان سے تعلقات استوار کئے جائیں۔ بالاکوٹ کی لڑائی آزادی کی سب سے پہلی لڑائی کہی جاسکتی ہے۔ سیّد احمد شہید کی شہادت کے بعد اُن کی جماعت کمزور پڑنے لگی، باہمی اختلافات نے جماعت میں انتشار پیدا کر دیا۔ لیکن قبیلوں میں آزادی کی جو جوالا بھڑک چکی تھی، وہ بجھ نہ سکی البتہ دب ضرور گئی اور پھر 1857ء میں دوبارہ چمک اُٹھی۔ 1857ء کی بغاوت کے ناکام ہونے پر سارے ملک کو صدمہ پہنچا لیکن یہ آگ بھی سینوں میں سلگتی رہی۔ اُنہی دنوں دیو بند کے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ کمر باندھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کو دیو بند اور آزاد قبائل میں روابط پیدا کرنے کے لئے مقرر کیا، شیخ الہند نے اس بات کا پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کسی بیرونی ملک کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی فوجی طاقت سے ہندوستان پر حملہ کر دے اور اس طرح انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔ دیو بند کے کچھ طالب علم چوری چھپے آزاد علاقوں میں چلے گئے اور وہاں کے لوگوں میں گھل مل گئے۔ اُدھر قبائل کے نوجوان بغرض تعلیم دیو بند آنے لگے۔ اُن دنوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیو بند اور آزاد قبائل میں ایک ایسا آسان راستہ ہے جس سے گذر کر پرستارانِ حریت افغانستان جا پہنچیں گے اور پھر کسی بیرونی ملک سے بات چیت شروع کر دیں گے۔ آزاد قبائل کے علاقوں میں کئی تربیتی کیمپ کھولے گئے جہاں ہندوستان سے آنے والے مجاہدوں کو جنگی سرگرمیوں سے واقف کرایا جاتا تھا۔ پروپیگنڈے کے مراکز بھی قائم کئے گئے۔ مولانا سندھی اور حاجی ترنگ زئی اس کام میں سب سے آگے تھے۔ انگریزی حکومت بھی ان

لوگوں سے غافل نہ تھی۔ اس کے مخبر اور جاسوس، مجاہدوں کے رنگ میں قبائلی علاقوں میں گھومتے تھے۔ ان ہی کم بختوں کی وجہ سے بعض اوقات کئی بڑے سرگرم وطن پرست موت کا شکار ہوئے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اٹک پار کے لوگ فطرتاً آزادی پسند واقع ہوئے ہیں اور آزادی کی داغ بیل اُن ہی کے ہاتھوں سے صوبہ سرحد کی سنگلاخ دھرتی میں پڑی۔ اس لئے ہمیں پٹھانوں کی لازوال قربانیوں پر ناز ہے۔ ذرا غور فرمایئے قبائلی علاقوں کی سرگرمیاں کہاں سے کہاں جا پہنچیں۔

آزادی کی تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلا گروپ چین گیا تھا اور اُس کے قائد صوبہ سرحد کے ایک پٹھان مولانا مقبول الرحمن سرحدی تھے۔ ان کا تعلق مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ صاحب سے تھا۔ دوسرا مشن ایک پنجابی مسلمان کی زیرنگرانی فرانس گیا جس کے ایک رکن شری رام چندر بھی تھے۔ یہ رام چندر امریکہ میں غدر پارٹی کے رکن اعلیٰ بھی بنے اور اخبار بھی نکالا۔ رام چندر، صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ لالہ ہر دیال اور مولانا برکت بھوپالی سے اُن کے گہرے انقلابی مراسم تھے۔ پیرس کے انقلابی اخبار سے بھی اُن کی وابستگی رہی۔ جب شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی کے مرتب کیے ہوئے انقلابی خاکے کی تکمیل میں ایک انقلابی مرکز قائم کیا تو اُس کا مرکزی دفتر دہلی میں رکھا گیا۔ اس کی آٹھ شاخیں تھیں۔ صوبہ سرحد کے لیے اُن کو منتخب کیا گیا اور آزاد قبائل کے لئے ترنگ زئی کو چنا گیا۔ قبائلی علاقہ میں بغاوت کا کام بڑے زور و شور سے شروع ہوا۔ دیوبند سے آزاد قبائل کا علاقہ باغی سرگرمیوں کا مرکز بنتا چلا گیا۔ مولانا شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے جو انقلابی مرکز قائم کیا تھا، اُس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی کے ذریعے افغانستان اور آزاد قبائل کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ کروایا جائے اور اس طرح سے ہندوستان انگریزی بربریت سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق کابل میں بھی ایک انقلابی مرکز بنا لیا گیا تھا جس کے سربراہ مولانا سندھی اور راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ حملہ کے لئے کوئٹہ، درہ خیبر اور اوگی کے مقامات کا انتخاب کیا گیا۔ اس موقع پر ایک خط ''غالب نامہ'' کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ غالب نامہ دراصل ترکی کے غالب پاشا کا وہ خط تھا جس میں ہندوستان کو ترغیب جہاد کی تلقین فرمائی گئی تھی۔ غالب نامہ مولانا محمد میاں انصاری کے ذریعے ہندوستان پہنچا لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے مولانا انصاری غالب نامہ کو آزاد قبائل میں لے گئے۔ وہاں اس کی خوب تشہیر ہوئی اور پختون جہاد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہی دنوں عہد نامہ غالب اور انور پاشا کے خطوط کا بھی

بڑا چرچا تھا۔ یہ خطوط بھی بغاوت کی تلقین پر مبنی تھے۔ لیکن اُس دور کا سب سے اہم چرچا ریشمی رومال سے ہوا جسے ''ریشمی رومال تحریک'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ریشمی رومال تحریک کو وہی اہمیت حاصل ہے جو 1857ء میں ''چپاتی'' اور کارتوس کو حاصل تھی اور یہ فخر بھی پختونوں کو ہی حاصل ہے کہ ریشمی رومال کی وابستگی بھی اُن ہی سے رہی ہے۔

ریشمی رومال ایک ایسا خوبصورت رومال تھا جس پر وہ ساری بغاوت درج تھی جو مولانا عبید اللہ سندھی نے کابل میں لکھی تھی۔ عبارت کی زبان عربی تھی اور اُسے ایک کاریگر نے رومال پر بُن دیا تھا۔ عبارت کے آخر میں امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان، امان اللہ خان، نصر اللہ خان اور عنایت اللہ خان کے دستخط بھی بُن دیئے گئے تھے۔ لیکن اِس پر زرد رنگ سے اُن کے دستخط بھی کروا لئے گئے تھے۔ یہ رومال ایک گز لمبا چوڑا تھا اور دلکش بیل بوٹوں سے بُنا گیا تھا۔ ریشمی رومال میں بغاوت کے لئے 19 فروری 1917ء کا دن منتخب کیا گیا تھا۔ اِس رومال کو ایک نومسلم عبدالحق لے کر پشاور آئے اور پشاور کے خان بہادر حق نواز خان کے حوالے کر دیا۔ پشاور سے یہ رومال سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے پاس پہنچ جاتا ہے لیکن شک کی بناء پر خان بہادر حق نواز خان انگریزی ستم کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اُدھر شیخ عبدالرحیم اپنے فقیرانہ بھیس میں اِس رومال کو اپنی پرانی میلی گدڑی میں سی رہے ہوتے ہیں کہ اچانک انگریزی فوج اُن کے مکان میں داخل ہو جاتی ہے۔ رومال اُن کے قبضے میں آجاتا ہے اور شیخ صاحب ایسے رفو چکر ہوتے ہیں کہ آج تک اُن کا پتہ نہیں ملتا۔ یہاں اس بات کا بھی تذکرہ ضروری ہے کہ شیخ عبدالرحیم مشہور لیڈر آچاریہ کرپلانی کے سگے بھائی تھے۔ وہ حضرت مولانا عبداللہ سندھی کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور انقلابی سرگرمیوں میں جُت گئے۔ ریشمی رومال کے پکڑے جانے سے بغاوت کا راز کھل گیا۔ باغی عنصر اِدھر اُدھر بکھر گیا لیکن آزاد قبائل کے مجاہد خاموش نہ بیٹھ سکے۔ غصے میں آکر قبائلیوں نے درگئی کے مقام پر جنگ چھیڑ دی۔ حاجی ترنگ زئی بھی انگریزوں سے ٹکرانے لگے۔ قلات اور لس بیلا کے مقامات پر بھی برسوں تک جم کر لڑائی ہوتی رہی۔ پکڑ دھکڑ کے باوجود بھی قبائل اور افغانستان میں انقلابی سرگرمیاں جاری رہیں۔ غازی امان اللہ خان ہندی انقلابیوں کے بڑے معاون ثابت ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان پر حملہ بھی کر دیا۔ صوبہ سرحد کے علاقہ کوہاٹ تک افغانیوں نے قبضہ کر لیا۔ انگریزی حکومت تڑپ اُٹھی۔ اُس نے سرِ تسلیم خم کیا۔ افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ کوہاٹ کا علاقہ

انگریزوں کو واپس دے دیا گیا اور پرانی سرحدوں پر ہی فیصلہ ہو گیا۔ بغاوت کا راز قبل از وقت فاش ہو جانے سے انقلابیوں کے حوصلے ٹوٹنے لگے لیکن پختون اب بھی انگریزوں کے خلاف ڈٹ کر کھڑا تھا۔ اُدھر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ کئی دیو بندی علماء مستقل طور پر آزاد قبائل میں ہی رہ گئے۔

قبائلی سرگرمیاں بڑھتی ہی گئیں۔ سرحد کا پٹھان اب انقلاب کے نشیب و فراز سے بخوبی شناسا ہو چکا تھا۔ آزاد علاقوں کے علاوہ وہ شہر اور دیہات کا پختون بھی انگریزی حکومت کے خلاف مردانہ وار کھڑا ہو گیا۔ قبائل میں تشدد کی لڑائیاں ہونے لگیں اور شہروں میں عدم تشدد کے اُصولوں کو اپنایا گیا۔ حاجی ترنگ زئی، خان عبدالغفار خان اور مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی بے لوث قیادت میں آزادی کی چھوٹی بڑی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ انگریز حکومت پوری طاقت سے آزاد علاقوں کو ختم کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی لیکن اُن کے بمبار جہاز اور بندوقیں بچوں کا کھیل ثابت ہوتی تھیں۔ بار ہا ان علاقوں پر بم گرائے گئے لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات ایک ایک قبائلی انگریزی فوجوں کی نیندیں حرام کر رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف بنوں کے قریب والے علاقوں کو دیکھا ہے اور وہ بھی اُس وقت جب مولانا پوپلزئی ان علاقوں میں گئے تھے۔ اُن دنوں وزیرستان پر فرنگیوں نے بم باری کر رکھی تھی۔ مولانا اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ سیدھے بنوں کی سمت چل پڑے۔ میں اُن کے ساتھ تھا۔ مولانا صاحب نے اپنی پہلی تقریر بنوں کی ایک مسجد میں کی۔ چند دنوں تک آزاد علاقوں میں گھومتے رہے۔ پولیس سائے کی طرح اُن کے ساتھ ساتھ تھی۔ آخر ایک دن مولانا پکڑے گئے۔ بنوں کے بڑے گیٹ کے اندر ایک بالا خانے پر مولانا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے قریب وزیرستان کے کچھ پٹھان بیٹھے تھے۔ اُن میں ایک لمبا تڑنگا خوبصورت وزیر تو پچی تھا جس نے پہلی بار دیسی ساخت کی توپ تیار کی تھی اور اُسے انگریزوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں پولیس کا ایک دستہ کمرے کی سیڑھی پھلانگتا ہوا اندر آ گیا، مولانا صاحب گرفتار کر لئے گئے، میں اشارہ پا کر نیچے اُتر آیا اور آزاد علاقے میں چلا گیا۔ مولانا صاحب بغاوت کے جرم میں سات برس کے لئے قید ہو گئے۔ یہ حضرت کی آخری قید تھی۔ آزادی کے لئے قبائلیوں نے کسی وقت بھی خاموشی اختیار نہیں کی۔ وہ لحہ بہ لحہ بڑھتے رہے۔ جب 30ء میں قصہ خوانی بازار گولی کانڈ کا پتہ قبائلیوں کو چلا تو انہوں نے پشاور میں آ کر طوفان برپا کر

دیا۔ یہ قبائلی آفریدی تھے۔ تعداد 40 ہزار کے قریب تھی۔ یہ لوگ تیراہ سے نکل کر سیدھے پشاور چلے آئے۔ انہوں نے وزیری باغ کو اپنا مرکز بنالیا۔ پشاور ''کیولری رسالہ'' کو لوٹ لیا اور آگ لگا دی، واٹر سپلائی کو بند کردیا۔ کچھ گورے ہلاک کردیئے گئے۔ شہر کے لوگوں نے آفریدیوں کے لئے روٹیاں اور نمک پیاز کی بوریاں بھر بھر کر وزیری باغ پہنچائیں۔ انگریزی حکومت آفریدیوں کی اچانک آمد سے تڑپ اُٹھی۔ وزیری باغ پر گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ اُس رات فوج روشنی کے گولے پھینکتی رہی تاکہ جہاں کوئی مجاہد نظر آئے، اُسے گولی ماردی جائے۔ یہ رات قیامت کی رات تھی۔ قبائلیوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے آخری دم تک ساتھ دیا۔ انگریز سرکار کی کوئی چال بھی اُن پر کارگر نہ ہوسکی۔ 46ء کے آخر میں جب حکومت نے قبائلیوں پر اندھا دھند بم باری کی اور پنڈت جواہر لال نہرو صوبہ سرحد میں آئے تو اُس وقت قبائلی سرداروں نے نہرو جی کو یقین دلایا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہر ممکن طریقے سے ہندوستانیوں کے ساتھ ہیں۔ وزیرستان کے فقیر اپی نے ایک خط کے ذریعے نہرو جی سے کہا تھا کہ میرا علاقہ پورے طور پر انگریزوں کے خلاف ہے۔ جب گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار وِلبھ بھائی پٹیل اور بابو راجندر پرساد اٹک کے اُس پار گئے تو قبائلیوں کے متعلق بڑا اچھا اثر لے کر آئے۔ ان لوگوں نے متفقہ طور پر کہا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوا تو ان ہی پختونوں کی اَن تھک کوششوں سے ہوگا۔ اگر گذرے ہوئے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کے انقلابی اور مفروران وقت، مقررہ وقت پر ان ہی قبائلی علاقوں میں پناہ لیتے رہے۔ ان ہی راستوں سے ہزاروں مسلمان ہجرت کر کے افغانستان گئے اور پھر روس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس بھی اِسی راستے سے اٹلی پہنچے۔ انقلابیوں کا مشہور مرکز ''چمر کنڈ'' کبھی آزاد قبائل میں ہی تھا، آج بھی آزاد قبائل کے پختون اپنی دُھن میں مست ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنی گرفت میں نہیں لاسکتی۔

دُنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے

یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

☆☆☆☆☆

# انقلاب کی آغوش میں

میں وہ بدنصیب ہوں جس نے ماں کا پیار نہیں دیکھا۔ لیکن ماں جیسا پیار ضرور دیکھا ہے۔ میں ابھی چھ مہینے کا تھا کہ ممتا کی روشنی بجھ گئی۔ دادی اماں کی بوڑھی گود نے مجھے پناہ دی۔ بچپن اُس گود میں اٹھکیلیاں کرتے گذرا۔ لڑکپن کی شرارتیں بھی دادی اماں کے سائے میں گذر گئیں اور جب جوانی نے انگڑائی لی تو دادی اماں بھی روٹھ کر چلی گئیں۔ گویا لڑکپن تک ہی مجھے اُن کا پیار مل سکا۔ میرا خاندان اوسط درجے کا خاندان تھا۔ نہ تو ایسا کہ سرمایہ داری اُس پر فخر کر سکے نہ ہی ایسا کہ غریبی آنکھیں دکھاتی پھرے۔ بس درمیان والی بات تھی۔ غرضیکہ اطمینان سے گذر ہو رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر آدمی پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتا تھا اور رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی جھونپڑی بہ آسانی مل جاتی تھی۔ آج کی طرح نہ مہنگائی آکاش کو چھوتی تھی اور نہ ہی لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتے تھے۔ البتہ جب لوگوں پر بدنصیبی کا سایہ پھیلا۔ غربت اور دکھوں نے گھر گھر ماتم شروع کیا تو یہ سب کچھ ہمارے غیر ملکی انگریزوں کی نظرِ عنایت کا نتیجہ تھا۔ بہرحال بات میرے خاندان کی ہو رہی ہے۔ عام بچوں کی طرح مجھے بھی سکول جانا پڑا۔ پشاور شہر کے درمیان ایک نیشنل ہائی سکول تھا جو سرکار کی گرانٹ پر چلتا تھا۔ سکول کے ماسٹر عام طور پر بڑی اچھی طبیعتوں کے تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر شری رام بھیجا مل تھے۔ سکول میں اُن کا بڑا رعب تھا لیکن لڑکے اپنی عادتوں کے مطابق اُن سے چھیڑ چھاڑ کئے رکھتے تھے۔ ایک بار کسی لڑکے نے اُن کے لمبے کوٹ کی جیب میں مرا ہوا ایک کوا ڈال دیا جس پر ماسٹر جی بہت سٹ پٹائے۔ لڑکوں کو پیٹا گیا۔ بدقسمتی سے میں بھی اُن میں شریک تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلاب اور آزادی کی بات نہیں سمجھتا تھا۔ اچانک ایک دن سکول میں اعلان ہوا کہ پرنس آف ویلز پشاور تشریف لا رہے ہیں۔ اُن کا بڑا شاندار سواگت ہوگا۔ ہم سب لڑکے اُس کے استقبال میں شامل ہوں گے، لہٰذا تیاریاں ہونے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ سکول کے

ہر ایک لڑکے کو ایک پیتل والے شہزادے کا تمغہ دیا گیا اور مٹھائی کا ایک ایک ڈبہ بھی (چھوٹی ٹوکری) پروگرام کے مطابق سکول کے لڑکے شہر سے باہر ایک جگہ پہنچ گئے جہاں پولیس کا بڑا انتظام تھا۔ دونوں طرف ہزاروں لوگ کھڑے تھے۔ سڑک پر موٹریں دھڑا دھڑ دوڑ رہی تھیں۔ ہماری نظریں شہزادے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ تمام موٹریں گذر گئیں۔ تماشا ختم ہوگیا۔ لیکن جناب شہزادہ صاحب نظر نہ آئے۔ کسی نے کہا کہ وہ ان ہی موٹروں پر سوار تھا۔ لیکن ڈر تھا کہ کوئی پتھر وغیرہ نہ پھینک دے کیونکہ پہلے سے ہی شہزادے کے بائیکاٹ کا پروگرام بنا ہوا تھا۔ جہاں ہزاروں لوگ استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے، وہاں مخالف کیمپ بھی موجود تھا۔ جونہی موٹروں کا تانتا شروع ہوا تو مخالف کیمپ سے ''واپس جاؤ . واپس جاؤ'' ''انگریزی حکومت مردہ باد'' کے زوردار نعرے بلند ہوئے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پیتل کا تمغہ اور مٹھائی لے کر گھر آ گیا۔ لیکن رات بھر سوچتا رہا کہ آخر یہ بات کیا ہے۔ شہزادے کی بے عزتی کیوں کی گئی۔ سکول میں بھی ہر گھڑی یہی چرچا تھا۔ ہمارے سکول کے لڑکے بڑے خوش تھے کہ کل ''مردہ باد'' کے نعرے لگائے گئے تھے۔

میرے پڑوس میں ایک تھانے دار صاحب رہتے تھے۔ لالہ دیوان چند۔ میرے پتا جی سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ انہیں یہ کہتے سنا کہ بیچارے شہزادے کی بڑی مٹی پلید ہوئی۔ کانگرسیوں نے کالے جھنڈوں سے اپنی افسردگی کا اظہار کیا۔ پتا جی بولے ٹھیک ہی تو ہے۔ آخر ہمارے ملک پر انگریزوں کا حق ہی کیا ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی اِس بائیکاٹ پر بڑا خوش ہوں تو میری وہ درگت بنی کہ خدا کی پناہ۔ میرے چچا لالہ بہاری لال جی سیاست کے بکھیڑوں سے بہت دُور رہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے مجھے اس قدر دھمکایا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکالی تو ننگا کر کے گھر سے نکال دیا جاؤں گا۔ میں اُن سے ڈرتا تھا۔ اُن کے ہاتھوں میں ''خارش'' تھی۔ جب تک وہ کسی بیچارے پر برس نہ پڑیں، انہیں چین نہیں آتا تھا اور وہ شراب کے بھی رسیا تھے۔ اُن کی موت کا باعث بھی شراب نوشی تھی۔ لیکن پتا جی پرہیز گار اور نیک طبع انسان تھے۔ غصہ کم کرتے تھے لیکن میری ہر بات پر پوری نگرانی رکھتے تھے۔ اُن کی زندگی کا وقت زیادہ تر سرکاری ملازمت میں گذرا۔ ایک بنک کے خزانچی بھی رہے۔ ہاں تو بات چل رہی تھی شہزادے کے بائیکاٹ کی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کتنے لوگ پکڑے گئے اور کتنے بیچارے حکومت

کا تختہ مشق بنے۔ اُنہی دنوں ایک بڑا خونچکاں واقعہ منظر عام پر آیا۔ 23 اپریل 1930ء کو پشاور کے بازار قصہ خوانی میں گولی چل گئی۔ میں کچھ لڑکوں کے ساتھ سکول کی کتابیں پھینک کر قصہ خوانی کی طرف بھاگا اور اس ہنگامے میں شریک ہوگیا۔ بے شمار آدمی مرتے دیکھے۔ گولیوں اور ننگے سینوں کا زوردار مقابلہ تھا۔ قصہ خوانی بازار خون سے سرخ ہوگیا۔ پھر یہ ہنگامہ چوک یادگار تک آپہنچا جہاں گڑھ والی فوج نے نہتوں پر گولی چلانے سے انکار کردیا۔ اس جرم کی پاداش میں جیل کی سنگین سزائیں قبول کیں۔ میں نے یہ آنکھوں دیکھا حال جب اپنے گھر میں بیان کیا تو میرے چچا صاحب گرج کر بولے تم کیوں وہاں گئے تھے اور میں نے اُن کا فولادی ہاتھ اوپر اُٹھتے دیکھا۔ اس پر پتا جی نے کہا ہاں جاتا کیوں نہ؟ انگریزوں کا قلعہ یہی ڈھائے گا ہمارا نام دنیا بھر میں روشن کرے گا۔ یہ فقرے طنزیہ تھے۔ یعنی ہمارے گھر کو یہ تباہ کردے گا۔ اُس رات جب لالہ دیوان چند تھانے دار نے شراب کا جام چھلکاتے ہوئے کہا کہ اب تو تمہارے گھر میں بھی انقلاب آرہا ہے۔ اس فقرے کے بعد شامت آجانے کے خوف سے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنے میں پیچھے سے پتا جی نے آدبوچا۔ اس خونی واقعہ کے تین دن بعد سکول کھلا تو ماسٹر جی نے کان مروڑتے ہوئے مجھے سکول سے اِس جرم میں نکال دیا کہ میں نے قصہ خوانی بازار کا رُخ کیوں کیا تھا؟ جب گھر والوں کو سکول سے نکال دینے کی خبر ملی تو پیچ پا ہوئے۔ گالیوں اور طمانچوں سے میری خوب خبر لی۔ اس مار وغیرہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ میری سیاسی زندگی کا آغاز نیشنل سکول کے اخراج سے ہوا۔ پھر جب میں نے چند لڑکوں کے ساتھ شراب خانے پر پکٹنگ کی اور جیل پہنچ گیا تو وہاں جیل کی ڈیوڑھی پر داروغہ جیل کے طمانچوں نے میرا اور میرے ساتھیوں کا منہ لال کیا۔ دوسرے دن دس دس بیتوں کی سزا ملی۔ البتہ یہ بیت لڑکوں کے رشتہ داروں نے جیل میں آکر مارے اور اپنے لڑکوں کو لے گئے۔ بیتوں نے ہماری سیاسی زندگی پر مہر لگادی۔ اب تو ہم پکے باغی بن گئے تھے۔ ایک بار مجھے ایک کتابچہ ''خون کا بدلہ خون'' شائع کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ میرے خلاف ترغیب قتل کا جرم عائد کیا گیا۔ پولیس کے ایک سردار جودھ سنگھ نے ایک دن میرے والد صاحب سے کہا کہ اب یہ لڑکا پھانسی پر چڑھے گا پھانسی پر۔ یہ وقت ایسا تھا کہ نوجوان پھانسی پانے کو بھی خوش بختی سمجھتے تھے۔ میں دل میں خوش تھا کہ پھانسی کے بعد میرا نام وطن کے آسمان پر چمکے گا مگر یہ بیک انہونی سی بات ہوئی کہ عدالت نے میرا جرم قابل سزا قرار نہ دیا اور مجھے رہا کردیا۔ لیکن

نیک چلنی کی وجہ سے ایک برس کے لئے قید میں ڈال دیا۔ حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کا نیاز جیل میں ہی ہوا۔ نوجوان بھارت سبھا کے بہت سے ممبروں سے بھی روشناسی بڑھی۔ بس یہ وہ مبارک سال تھا جب میری زندگی نے سیاست کی دشوارترین منزلیں خندہ پیشانی سے طے کرنا اپنا فرض مقدس قرار دیا۔

☆☆☆☆☆

# قصّہ خوانی بازار

23اپریل1930ء کا دن صوبہ سرحد کی انقلابی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جب پختونوں نے مجاہدانہ بانکپن سے آزادی کا نعرہ لگایا اور بدلے میں اپنی ننگی چھاتیوں پر زہریلی گولیوں کے وار سہے۔ اتنے برس بیت جانے پر بھی قصہ خوانی بازار کا خونچکاں منظر ب بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو سکا۔ میں اُن دنوں پشاور کے نیشنل ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ جب یہ وحشت ناک خبر سکول کی دیواروں سے ٹکرائی تو لڑکوں نے کتابیں پھینک دیں، بے تحاشہ باہر نکلے۔ کچھ گھروں کو بھاگ گئے اور کچھ قصہ خوانی بازار کی سمت میں بھی اُن میں سے ایک تھا۔ اکیلا نہیں میرے ساتھ کئی قدم تھرک رہے تھے۔ میں بھی ہجوم میں جا گھسا۔ یہ بازار ''مسگران'' تھا یہیں کانگریس کا مرکزی دفتر تھ۔ دفتر کے اوپر ترنگا ہرا رہا تھا اور نیچے خون بہہ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم نے لکڑی کی خالی پیٹیوں کو اکٹھا کر کے ایک چبوترہ بنایا۔ ایک اونچی سی پیٹی پر ایک خوبصورت نوجوان کھڑا ہو کر کہہ رہا تھ۔ سپاہیو! گولی مت چلاؤ، ہم خالی ہاتھ ہیں اور اگر رُک نہیں سکتے تو ادھر دیکھو ننگی چھاتی نوجوان نے پہنی ہوئی بشرٹ کو چاک کر دیا۔ گولی اُس کی چھاتی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے آ گرا۔ ہجوم قصہ خوانی بازار کی طرف بڑھا۔ ننگی چھاتیوں کے ساتھ میرے قدم بھی بڑھے۔ ہم ڈھکی نعلبندی کے قریب آ پہنچے۔ یہاں گورا سپاہیوں کی قطاریں کھڑی تھیں بندوقیں سنبھالے، سنگینیں چڑھائے اور ادھر بے پناہ جتا جھنڈے ہراتے ہوئے ترنگا ہلالی سرخ پرچم، رنگارنگ کے جھنڈے نوجوان بھارت سبھا کے رضا کار، کانگریس کے والنٹیر، خلافت کمیٹی کے اراکین، سکھ یوتھ کے ورکر، ہزاروں انسان، سینکڑوں بندوقیں اور میں نے دیکھا ایک بڑھیا کو روئی کی طرح سفید بال، اور ایک نوجوان کی نعش وہ کہہ رہی تھی ظالمو! یہ کیا کیا۔ میرا ایک ہی بچہ تھا۔ اب کس کے سہارے جیوں گی۔ کون

ہو گا میرا سہارا۔ لیکن سہارے تو ٹوٹ چکے تھے۔ بیٹوں کے سہارے، سہاگنوں کے سہارے۔ بہنوں اور ماؤں کے سہارے اور دم توڑتے بوڑھوں کے سہارے۔ سہاگنیں بال نوچ رہی تھیں اور مائیں سر پیٹ رہی تھیں! کوئی پانی مانگ رہا تھا تو کسی نے ''ماں'' کہہ کر دم توڑ دیا۔ کوئی زخمی تھا تو سپاہیوں کی سنگینیں اُسے خاموش کر رہی تھیں۔ پشاور کا ایک رئیس لالہ کرم چند کابلی ذرا آگے بڑھا اور ایک فوجی سے کہا خدا کے لئے اِن پر رحم کرو اور رحم سنگین کی نوک بن گیا۔ کرم چند زخمی ہو کر گر پڑا اور نہ جانے کتنے کرم چند، کتنے ہی شہباز خان اور بے شمار کرتار سنگھ جام شہادت پی گئے۔

لیکن ہجوم پھر بھی ڈٹا رہا اور اِس طرح 23 اپریل کے دن آزادی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ بات یوں تھی کہ پراونشل کانگریس نے اپنے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا کہ شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ کی مہم چلائی جائے اور نمک ٹیکس دینے سے انکار کیا جائے۔ اسی مقصد کے لئے ایک وار کونسل تشکیل کی گئی۔ کونسل کے صدر آغا لال بادشاہ تھے۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی اُس کے خاص رکن تھے۔ جب اِس واقعہ کی اطلاع حکومت کو پہنچی تو اُس نے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ 22 اور 23 اپریل کی درمیانی رات کو پکڑ دھکڑ کا چکر چلایا گیا۔ مولانا پوپلزئی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ 23 اپریل کی صبح کو کانگریس کے دفتر سے اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی کو گرفتار کیا گیا اور انہیں پولیس گاڑی میں کابلی تھانہ کی جانب لے جایا گیا۔ اُس وقت بے پناہ ہجوم یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی گاڑی چلنے لگی تو ہجوم نے گاڑی کے ٹائر کاٹ ڈالے۔ گاڑی دم توڑ گئی۔ دونوں گرفتار شدہ نوجوان پیدل ہی کابل تھانہ جا پہنچے۔ قصہ خوانی بازار میں اُس وقت ہزاروں آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ فلک شگاف نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ اُس وقت کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے طیش میں آ کر فوجی ہیڈ کوارٹر اطلاع دے دی اور دیکھتے ہی دیکھتے بکتر بند گاڑیاں اور مشین گنیں دندناتی ہوئی کابلی دروازے سے اندر آگئیں۔ مجاہدوں نے بازوؤں میں بازو ڈال کر ایک دیوار کھڑی کر دی اور یہ دیوار مشین گن سے کچل دی گئی لیکن بازو الگ نہ ہو سکے۔ دم توڑتے انسانوں کی زبانوں سے آزادی کے ترانے گونجنے لگے۔ خون سے لت پت انسانی جسموں کی دیوار ۔ دیوار تو گر گئی لیکن فوجی سپاہیوں کا دم خشک ہو گیا۔ کسی منچلے نوجوان نے مشین گن کے نیچے والی پٹرول کی ٹینکی کاٹ دی اور آگ لگا دی۔ اِس نوجوان ٹولی کا

نشانہ بنادیا گیا۔ مشین گن چلنے لگی۔ اندر سے چار گورے سپاہیوں کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ تاریخ میں پہلا موقع تھا جب مشین گن چلادی گئی اور ایک فوجی افسر کو کلہاڑی سے ہلاک کردیا گیا اور پھر زہریلی سنگینوں اور ننگی چھاتیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ زندگی کے بے شمار کھلونے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ایک ہارمونیم والے کو ایک گورے نے بلاوجہ گولی ماردی۔ ایک معصوم لڑکا تیل کی بوتل لئے جارہا تھا کہ زہریلی سنگین سے چھید دیا گیا۔ گولیوں کا یہ کھیل متواتر کئی گھنٹوں تک رہا۔ قصہ خوانی بازار خون سے لت پت ہوگیا۔

قصہ خوانی بازار سے ناچتا، کودتا آزادی کے متوالوں کا یہ ہجوم چوک یادگار کی جانب چل دیا۔ یہاں گورا سپاہیوں نے پہلے ہی سے بندوقیں سنبھال رکھی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں اور برآمدوں میں گورے سپاہی بندوقیں تانے اشارے کے منتظر تھے۔ اس موقع پر گڑھوالی فوج کے جاں بازوں نے گولی چلانے سے انکار کردیا اس پر کھلبلی مچ گئی۔ میں نے ایک انگریز فوجی افسر کو کہتے سنا۔ ''خدا کے لئے واپس جاؤ! ہم تم کو آزاد کردے گا ہم ادھر سے جارہا ہے! تم اپنا گھر سنبھالو'' اور واقعی اُس وقت فوج لٹ گئی۔ یہ سب گڑھوالی فوج کی بے مثال قربانی کا نتیجہ تھا! چوک یادگار اور قصہ خوانی بازار فوج سے خالی ہوگیا۔ تھانے بند، چوکیاں بند، پولیس کا پہرہ ختم، یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں کبھی انگریزی حکومت تھی ہی نہیں۔ کسی کا راج نہیں، کوئی حاکم نہیں۔ 23 اپریل کا دن ہنگاموں میں گزرا، رات کو پھر اندھا دھند گرفتاریاں ہوئیں اور پھر اچانک انگریزی حکومت سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ گئی۔ تین دن تک پشاور میں عوامی حکومت کا نظم و نسق سیاسی و سماجی جماعتوں کے ہاتھ میں رہا۔ کانگریس، نوجوان بھارت سبھا، خلافت کمیٹی سیوا سمتی، مہابیر دل، سیوادل وغیرہ۔ تین دن تک جنتا کا راج رہا۔ تاریخ میں یہ تین دن سنہری دن تھے۔ نہ چوری ہوئی نہ قتل، نہ جھگڑا نہ فساد۔ لیکن یہ تین دن کی آزادی بڑی مہنگی پڑی۔ تین دن کے بعد پھر اندھا دھند گرفتاریاں، مار پیٹ، خانہ تلاشیاں، دھینگا مشتی۔ کانگریس، نوجوان بھارت سبھا اور دوسری جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ ان جماعتوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ کانگریس کمیٹی نے حاجی ترنگ زئی سے ساز باز کی ہوئی ہے اور حاجی صاحب ایک لاکھ مجاہدوں کے ساتھ حکومت پر حملہ کرنے والے ہیں۔ نوجوان بھارت سبھا پر الزام تھا کہ یہ تشدد سے حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے یہ الزامات محض ان جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے لئے لگائے گئے تھے۔

## شہیدوں کی یادگار:

23 اپریل کی رات کو ہی قصہ خوانی بازار میں شہیدوں کی یادگار بنادی گئی۔ اُسے بنانے والے پشاور کے فروٹ مرچنٹ شری عاشق حسین تھے۔ دوسرے دن صبح حکومت نے یادگار کو توڑ پھوڑ دیا لیکن دلوں سے شہیدوں کی یاد نہ مٹا سکی۔ چند دن بعد پھر یادگار بنادی گئی۔ اِس مقدس یادگار پر ہر برس پھول چڑھائے جاتے تھے۔ دیئے جلائے جاتے تھے، آزادی کے ترانے گونجتے تھے۔ اب بھی ہزاروں انسان قصہ خوانی بازار کی مقدس دھرتی پر ہر سال محبت اور خلوص کے پھول چڑھانے جاتے ہیں! قصہ خوانی کا خونچکاں واقعہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ قصہ خوانی بازار ہمیں اَن گنت باتوں کی یاد دلاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کے بعد یہ دوسرا خونچکاں واقعہ تھا جس نے سارے ملک میں آزادی کی نئی روح پھونک دی۔ پختونوں کے جذبات میں گرمی پیدا کردی۔

لاکھوں انسان آزادی کے میدان میں مردانہ وار کود پڑے۔ سرحد کے گوشے گوشے میں مجاہدوں کی ٹولیاں گھومنے لگیں۔ حکومت کا سنگھاسن ڈولنے لگا اور آخر ایک دن آزادی کا آفتاب چمک اُٹھا۔ قصہ خوانی بازار کی یادگار پھولوں سے لدگئی۔ دیئے جگمگانے لگے۔ دھرتی پر گراہوا خون پکار اُٹھا۔ قربانی رنگ لائی لیکن بیچارے پٹھانوں کیلئے یہ آزادی اندھیرے میں بدل گئی۔ ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ یادگاریں بھی بٹ گئیں۔ ہندو شہید، مسلم شہید   کون جانے آج ان یادگاروں پر کوئی ''دیا'' جلاتا ہے اور پھول چڑھاتا ہے یا نہیں۔ کچھ بھی ہو قصہ خوانی بازار کی یاد دلوں سے مٹ نہیں سکتی!

''پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر''

☆☆☆☆☆

# دو معصوم بچوں کی شہادت

31 مئی 1930ء کا دن انگریزی حکومت کی پیشانی پر ایک سیاہ دھبہ ہے، نہ مٹنے والا سیاہ دھبہ۔ قصہ خوانی بازار کے خونچکاں واقعات نے انگریزی بربریت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ نوکرشاہی سرکار، وحشیانہ طور وطریق سے نہتے عوام پر جبر وتشدد کا خطرناک رعب جمانا چاہتی تھی۔ اس لیے 31 مئی کی صبح کو دو معصوم بچوں کے خون سے ذلیل حکمرانوں نے غسل کیا۔ بات یوں تھی کہ ملٹری ڈیری فارم کے ایک سپر وائیزر سردار گنگا سنگھ اپنی دھرم پتنی اور دو بچوں سمیت پشاور چھاؤنی سے شہر میں داخل ہو رہے تھے تاکہ گوروارجن دیو جی کے شہیدی گورپرب میں شامل ہو سکیں۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ سردار جی اپنے مختصر پری وار کے ساتھ تانگہ میں کابلی گیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ کابلی گیٹ تھانہ کے اوپر بیٹھا ایک گورا فوجی حرکت میں آیا۔ گولی چلی اور دونوں بچے جام شہادت نوش فرما گئے۔ ماں کی چھاتی بری طرح چھلنی ہوگئی۔ اس واقعہ کو سردار گنگا سنگھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''میں جب ملٹری میں تھا تو ایک گورے لیفٹیننٹ مسٹر میس نے مجھے سلام کرنے پر مجبور کیا۔ مگر میں نے ہندوستانی خودداری کی وجہ سے سلام کرنے سے انکار کر دیا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس پر مجھے سٹیشن کمانڈنگ آفیسر کے رُوبرو پیش کر کے سرزنش کی گئی۔ آخر وہی گورا افسر اور میں پشاور چھاؤنی میں آگئے۔ 23 اپریل کے قتل عام کی وجہ سے جگہ جگہ گورا فوج تعینات تھی۔ میں 31 مئی کی صبح کو اپنے بیوی بچوں سمیت پشاور شہر آیا۔ گوردوارہ بھائی جوگا سنگھ میں شہیدی گورپرب پر ''آسا دی وار کا بھوگ'' ڈالنے کے بعد ہم تانگہ میں کابلی گیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ اُس وقت

وہاں لیفٹیننٹ بُسو کی زیر کمان ایک گورا فوجی دستہ تعینات تھا۔اُس جگہ سے ہم پر فائر ہوا۔اُس وقت میری بیوی شریمتی تیج کور گود میں لئے بچے پچتر سنگھ کو گوردو رہ سے لایا ہوا پرشاد کھلا رہی تھی۔اچانک گولی چلی۔ایک گولی پہلے میری لڑکی ہرپال کور کو لگی اور پھر اُس کے بھائی اور ماں کے سینہ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ماں کی چھاتی سے دودھ اور خون کی دھاریں بہنے لگیں۔لاشیں تانگہ سے گر گئیں۔لوگ جمع ہو گئے اور بازار مکمل بند ہو گیا.....''

یہ ہے مختصر سی کہانی ان دو معصوم بچوں اور اُن کی ماں شریمتی تیج کور کی شہادت کی۔ انگریزی سرکار کی بربریت، ذلالت اور اُس کا وحشیانہ پن سامنے آ گیا۔خون سے لتھڑی ہوئی نعشوں کو ہجوم نے سروں پر اُٹھا لیا۔اُٹھانے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔قصہ خوانی بازار پھر ایک بار انقلابی نعروں سے گونج اُٹھا۔زخمی عورت اور بچے پشاور کے لیڈی ریڈرنگ ہسپتال میں لے جائے گئے۔جہاں ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔فیصلہ یہ ہوا کہ نعشوں کا جلوس نکالا جائے اور پُرامن طریقہ سے اسے شمشان بھومی پہنچایا جائے۔پروگرام کے مطابق یہ جلوس پشاور گورکل جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک فوجی دستہ نظر آیا۔جنازہ پھولوں سے لدا بچے شہیدیوں کو کندھوں پر لادے چلا آ رہا تھا کہ فوجی دستے کے انچارج نے جلوس کو رکنے کے لئے کہا۔جلوس کے سربراہوں نے جواب دیا کہ ہم پُرامن طریقے سے شمشان بھومی جا رہے ہیں، آپ ہمیں روکیے نہیں، لیکن آنکھ جھپکتے ہی فوجی درندے حرکت میں آ گئے۔اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔جنازہ گر گیا۔نعشیں جتنا گولیوں سے چھلنی ہو کر بازار میں بکھر گئی۔یہ وحشت ناک نظارہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔میں بھی جلوس والوں میں سے ایک تھا۔میں نے دیکھا کہ لوگ کس طرح جام شہادت پی رہے ہیں۔

مجھے ٹھیک یاد ہے کہ چمن لال نام کا ایک نوجوان گولی کھانے کیلئے دوڑتا ہوا فوجی دستے کی صفوں میں گھس گیا اور گولی کھا کر جام شہادت پی گیا۔اِس دوڑ دھوپ میں ایک بچہ آگ سے بھڑکتے ہوئے تندور میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ایک نوجوان دیوار پھلانگ رہا تھا کہ اُس کے ماتھے پر گولی لگی اور وہ بیچارہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔یہ سارا ڈرامہ چند منٹ میں ہوا۔فوجی دستہ اپنی کارگزاری

پوری کر کے آگے بڑھ گیا۔ نعشیں اُٹھالی گئیں اور اُس رات۔۔۔وہی قیامت تھی جو 23 اپریل کی شب کو لوگوں نے دیکھی۔ 31 مئی کا خونچکاں واقعہ بھی صوبہ سرحد کی انقلابی تحریک کا ایک اہم جزو ہے۔ سردار گنگا سنگھ جی آج بھی زندہ ہیں اور فیروز پور میں اپنی زخمی بیوی کے ساتھ زندگی اور موت کے دن کاٹ رہے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے اپنے ایک خط میں اپنی مختصر سی کہانی لکھتے ہوئے کہا ہے:

''میں موضع کھیم کرن لاہور کا باشندہ ہوں، پشاور کے ملٹری ڈیری فارم میں سپروائزر تھا۔ 1903ء میں تقسیم بنگال کے وقت جب شری خودی رام بوس کو پھانسی ہوئی تو میں اس واقعہ سے متاثر ہوا۔ 1907ء میں لالہ لاجپت رائے، صوفی امبا پرشاد اور سردار اجیت سنگھ کی تقریروں نے میرے جذبات میں گرمی پیدا کی۔ 1915ء میں کاما گاٹا مارو جہاز کی تحریک میں شامل ہوا۔ میرے انقلابی دوستوں نے مجھے جنرل ڈائر کو ہلاک کرنے کے لئے منتخب کیا۔ لیکن قبل از وقت یہ راز فاش ہونے پر مجھے افریقہ جنگ میں بھجوا دیا گیا اور میرے ساتھیوں کو چودہ برس کے لئے قید کر دیا گیا۔ جس میں پنڈت پیارے لال، لالہ لال چند فلک، سردار بوڑھ سنگھ، غلام حسین اور گورو دیال سنگھ شامل تھے۔ بعد ازاں گوردوارہ تحریک اور جلیانوالہ باغ کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا''۔

سردار گنگا سنگھ جی ایک پرانے دیش بھگت ہیں۔ ابھی پچھلے برس انہوں نے خان عبدالغفار خان کو ایک خط لکھا تھا جس کے جواب میں خان بابا نے انہیں خط لکھا۔ خط کے آخری حصہ میں خان بابا لکھتے ہیں ''ہندوستان میں میری جو سوانح عمری چھپ رہی ہے۔ آپ اپنا پورا واقعہ لکھوا کر بھجوا دیں۔ آپ کا واقعہ میں نے پوری طرح نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس کا پورا علم نہ تھا۔ آپ مہربانی کر کے تمام حالات سے مطلع کریں تا کہ وہ بھی کتاب میں چھپ جائیں۔''

بابا خان چاہتے ہیں کہ صوبہ سرحد کے تمام واقعات قلم بند ہو کر منظر عام پر آ جائیں تا کہ ہندوستان کے لوگوں کو صوبہ سرحد کی سیاسی خدمات کا پتہ چل سکے۔ سردار گنگا سنگھ جی کے وطن پرستانہ جذبات کا اندازہ یوں بھی لگ سکتا ہے کہ جب اُن کے دونوں بچے شہید ہو گئے تو حکومت

نے انہیں معاوضہ دینا چاہا۔ جب سردار جی نے انکار کیا تو انہیں بطور جرم عدن بھجوا دیا گیا۔ سردار گنگا جی آج بھی دیش بھگتی کے پاکیزہ جذبات رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب پاکستانی فوجیں کھیم کرن کے اڑوس پڑوس میں داخل ہوئیں تو سردار جی اُس آڑے وقت میں بھی لوگوں کی خدمت کرتے رہے حالانکہ اُنہیں آزادی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ہی نہیں ملا اور وہ بھی ان لاکھوں دیش بھگتوں کی طرح مصائب وآلام کی زندگی گزار رہے ہیں جنہیں جینا بھی دوبھر ہے۔ بہر حال 31 مئی کا دن بھی ہمارے لئے مقدس دن ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شہید بچوں کی عمر ساڑھے نو سال اور ساڑھے تین برس تھی اور جس گورے نے گولی چلائی تھی، اُس کا نام ''لارنس کازیول'' تھا۔

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہو گا

☆☆☆☆☆

# ایک ساتھ تین پھانسیاں

پنجاب کے 3 بانکے سرفروشوں کی پھانسی نوجوانوں کے لئے جذبہ شہادت کا پیش خیمہ تھی۔ آزادی کی راہ میں پہلے بھی بے شمار پھانسیاں ہوئیں۔

1857ء کا خوں نچکاں عہد پھانسیوں کے لاتعداد نقوش چھوڑ گیا ہے۔ قدم قدم پر لٹکتے ہوئے مجاہدین حریت آزادی کے ترانے گاتے آج بھی سنائی دیتے ہیں۔ دہلی کا فوارہ پنجاب کے گاؤں الہ آباد کا "کالا آم" کا درخت ہمیں آج بھی اس وحشت ناک منظر کی یاد دلاتا ہے۔ جب معصوم بچے، نوجوان اور دم توڑتے بوڑھے جام شہادت پی رہے تھے۔ 1857ء کے بعد بھی پھانسیوں کا زور رہا۔ ببر اکالی تحریک کاما گاتا مارو جہاز اندولن، کاکوری کیس بنگال کی انقلابی تحریکیں یہ سب ہمیں پھانسیوں کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن جو جذبہ سردار بھگت سنگھ، راج گورو، سُکھ دیو کی پھانسی کے بعد پیدا ہوا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ وہ دن تھے جب انگریزی حکومت پوری آب وتاب سے پرستاران حریت کو کچل دینے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔ تین بہادروں کی پھانسی نے پورے ملک میں انقلاب کے شعلے بھڑکا دیئے، حکومت نے جس بے دردی سے ان نوجوانوں کو تختۂ دار پر لٹکایا اور پھر نیم مردہ حالت میں جس ذلالت سے تینوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیا، وہ حکومت کی پیشانی پر ایک سیاہ دھبہ ہے جو سات سمندروں کے پانی سے بھی نہیں دُھل سکتا۔ سرکار نے ہر چند ان پھانسیوں کو چھپانے کے لئے کوشش کی لیکن خونِ ناحق کہاں چھپتا ہے۔ پنجاب کے انقلابیوں نے اس بات کا فیصلہ کر رکھا تھا کہ جس دن تین نوجوان پھانسی پر لٹکیں گے تو اس کی اطلاع خفیہ طور پر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچا دی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ پھانسی کے دوسرے دن جس شام کو خفیہ طور پر لاہور سنٹرل جیل میں نوجوان کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا، اُسی شام

کوراوی کے کنارے ایک عظیم جلسے میں مولانا ظفر علی خان تقریر فرما رہے تھے۔ دوسرے صوبوں کی طرح پشاور کے نوجوان بھی لاہور کی طرف کان لگائے بیٹھے تھے کہ کب وہاں سے کوئی اطلاع ملے۔ یہ تو سبھی جانتے تھے کہ سردار بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی پھانسی سے نہیں بچ سکتے۔ ہندوستان کے کروڑوں کے دستخطوں کے باوجود جب بے رحم سرکار نے اپنی ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو پھر یہ سوچنا بے سُود تھا کہ موت بھی ٹل سکتی ہے اور آج میں سوچتا ہوں کہ بہت ہی اچھا ہوا جب ہمارے یہ تینوں سرفروش تختہ دار پر لٹک کر حیات کا راز بھی پا گئے اور اُن کی بے لوث شہادت نے جذبہ حریت کو اس قدر اُبھارا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا سردار بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد دوسرے دن قریب پانچ بجے شام پشاور کانگریس کمیٹی کو ایک تار ملا جس میں لکھا تھا کہ کام ختم ہو گیا ہے۔ یہ خفیہ اطلاع تھی نوجوانوں کے پھانسی پر لٹکنے کی۔ کانگریس کے کمانڈر نے فوراً ہی اس اطلاع کو مختلف سیاسی جماعتوں تک پہنچا دیا۔ اِدھر نوجوان بھارت سبھا کے دفتر میں بھی لاہور سے اطلاع آ گئی۔ شام کے تاریک سائے پھیل رہے تھے۔ ہم بڑی پھرتی سے اپنے ممبروں کو اکٹھا کرنے لگے اور خفیہ طور سے ہی ایک جلوس ترتیب دیا جانے لگا۔ رات بھر ہم تمام ساتھی گلی کوچوں اور بازاروں میں چکر لگاتے رہے۔ جس جس کو پھانسی کی خبر ملی، اُس کے آنسو اُمڈ آئے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ جن دنوں سردار بھگت سنگھ جی کی پھانسی کے خلاف ملک بھر میں دستخط کروائے جا رہے تھے تو ہم بھی اس مہم میں آگے آگے تھے۔ ہر آدمی آنکھیں بند کر کے اس پر دستخط کر رہا تھا۔ سبھی چاہتے تھے کہ یہ نوجوان موت سے بچ جائیں۔ جب ہم ایک گوردوارہ میں پہنچے تو وہاں کے سب سرداروں نے دستخط کر دیئے لیکن گوردوارے کے ایک بوڑھے گرنتھی نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ جو سکھ اپنے کیس کٹوا سکتا ہے، مجھے اُس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ جاؤ میں دستخط نہیں کرتا۔ مجھے اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن میں خاموش وہاں سے چل دیا اور جب ہم جلوس کی تیاری کر رہے تھے تو وہی گرنتھی روتا ہوا ہمارے دفتر میں آیا اور کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ سردار بھگت سنگھ تو سردار ہی تھے۔ اور دوسرے دن وہ جلوس میں سب سے آگے آگے تھا۔ اُدھر جب سرکاری حلقوں تک جلوس کی اطلاع پہنچی تو پولیس لاٹھی اور بندوق سے تیار ہو کر بازاروں میں آ گئی۔ مجھے ٹھیک یاد ہے کہ جلوس جہاں جہاں سے گذرتا تھا، مکان کی

چھتوں پر بیٹھی عورتیں سر پیٹتی دکھلائی دیتی تھیں۔ گھر گھر ماتم تھا۔ گھر گھر قیامت۔ ۔ ۔ جلوس میں بے شمار عورتیں اور خاص کر نوجوان لڑکیاں پیش پیش تھیں۔ جب یہ جلوس پشاور کے چوک یادگار میں پہنچا تو عورتوں نے زور زور سے اپنی چوڑیاں توڑنی شروع کر دیں اور با آواز بلند کہا کہ جو لوگ ڈر کے مارے آزادی کی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، وہ ہماری ٹوٹی ہوئی چوڑیاں پہن کر گھروں میں چھپ جائیں، یہ منظر بڑا غضب ناک تھا۔ ہر چہرہ مغموم، ہر آنکھ نم، ہزاروں انسانوں کا یہ غم ناک جلوس حکومت کی چھاتی پر مونگ دل رہا تھا۔ پولیس خاموش کھڑی تھی اس خاموشی میں کچھ درد بھی تھا اور کچھ مجبوری بھی۔ میں نے اپنی سیاسی زندگی میں اس سے قبل اتنا منظم اور پُر جوش جلوس نہیں دیکھا تھا۔ یہ جلوس ہر سیاسی جماعت پر مشتمل تھا۔ کانگریس، خلافت، اکالی دل، نوجوان بھارت سبھا، یوتھ فیڈریشن، مینوا ستی، بجرنگ اکھاڑ وغیرہ۔ جلوس میں سردار بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھ دیو جی کی قد آور تصویریں عوام کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب لوگ ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اُن دنوں ایک ہی جذبہ تھا، ہندوستان آزاد ہو۔

آزادی کا یہ پاکیزہ جذبہ صرف صوبہ سرحد کے شہروں اور گاؤں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کا اثر آزاد قبائل تک بھی جا پہنچا تھا۔ ٹیڑھی ترچھی وادیوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والا پٹھان بھی آزادی کے راگ الاپنے لگا۔ قبائلی فضاؤں میں بھی حریت کے گیت گونجنے لگے۔ اُنہی دنوں جب علاقہ مہمند اور وزیرستان کے پٹھانوں کو معلوم ہوا کہ انگریزی سرکار نے تین خوبصورت نوجوانوں کو بڑے وحشیانہ ڈھنگ سے پھانسی پر لٹکا دیا ہے تو وہ تڑپ اُٹھے۔ انہوں نے بندوقیں سنبھال لیں۔ وہ شہروں میں آ کر انگریزوں پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن قبائلی لیڈروں اور شہری نیتاؤں کے سمجھانے پر وہ رُک گئے۔ قبائلی پٹھان تو بندوق کی زبان جانتا تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی جتنی تجویزیں مرتب ہوئی ہیں، اُس کی بڑی وابستگی صوبہ سرحد کے آزاد قبائلیوں سے ہی ہے۔ خاص طور پر دیو بند کے علماء اور آزاد قبائل کے پٹھان ان تجاویز میں پیش پیش رہے ہیں۔ تحریک ریشمی رومال اور غالب نامہ کا تعلق بھی سرحد کے اُنہی قبیلوں سے رہا ہے۔ ہندوستان کے بیشتر مفروروں کا تعلق بھی آزاد علاقوں سے رہا ہے۔ سردار بھگت سنگھ کی بے مثل قربانی نے سرحد

کے نوجوانوں پر بڑا اثر کیا۔ پشاور کے عبدالرشید پہلے نوجوان تھے جنہوں نے سردار بھگت سنگھ کی پھانسی سے متاثر ہوکر ایک انگریز کو قتل کر دیا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کے ''پریتم خان'' بھی اس پھانسی سے متاثر ہوکر تختہ دار پر لٹک گئے اور اسی پھانسی کا بدلہ لینے کے لئے دو گورے سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جن کے قاتل پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے، بھگت سنگھ کی قربانی انوکھی تھی۔

☆☆☆☆☆

# سیاسی جماعتیں

ہندوستان کے باقی صوبوں کی طرح صوبہ سرحد میں بھی کئی سیاسی جماعتوں نے سیاسی بیداری میں حصہ لیا۔ پختون بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ 57ء کی انقلابی جماعتوں کو چھوڑ کر دوسری جن پارٹیوں نے سرحد کی سیاست میں اہم حصہ لیا۔ اُن میں مندرجہ ذیل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

## خلافت کمیٹی:

سب سے پہلے اس کی بنیاد پشاور میں رکھی گئی۔ سید آغا لال بادشاہ اور عبدالغفار خاں اُس کے خاص معماروں میں سے ہیں۔ خلافت کمیٹی کے جنرل سیکرٹری سردار گوربخش سنگھ تھے۔ اُن کے تقرر سے ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کا زندہ ثبوت ملا، خلافت اندولن میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ ہندوؤں نے بھی حصہ لیا۔ اُن دنوں خلافت کے جلسے مسجدوں اور مندروں میں ہوا کرتے تھے۔ ہندو لیڈر مسجدوں کے میناروں سے بغاوت کے نعرے لگاتے تھے اور مسلمان مندر کے صحن میں کھڑے ہو کر آزادی کے گیت گاتے تھے۔

## تحریک ہجرت:

اس تحریک کی ابتداء بھی پشاور سے ہی ہوئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مسلمان ہندوستان چھوڑ دو کی مہم میں جٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے، جلسے اور جلوسوں میں برابر شریک ہوتے تھے۔ پشاور کا بازار کریم پورہ اس تحریک کا خاص مرکز تھا۔ جب شہر سے ہجرت کرنے والوں کے قافلے گذرتے تھے تو ایک عجیب سماں بندھ جاتا تھا۔ تحریک ہجرت نے سرحد کے لوگوں میں آزادی کے جذبے کو اُبھارا۔

## اصلاح الافاغنہ:

اتمان زئی میں اس جماعت کا قیام اُس وقت ہوا جب پختون نہ سیاسی طور پر بیدار تھے نہ سماجی طور پر۔ ان میں زندگی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ خان عبدالغفار خان کی مخلصانہ کوششوں سے یہ جماعت منظرعام پر آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سرحد کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

## خدائی خدمت گار جماعت:

اس کا جنم بھی اتمان زئی میں ہی ہوا۔ شروع میں یہ جماعت محض اصلاحی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لیتی تھی لیکن بعدازاں اس کا نصب العین ہندوستان کی آزادی قرار پایا۔ سرحد کی سیاسی بیداری میں خدائی خدمت گار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہی جماعت تھی جس کے رضا کاروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی، آزادی کی جدوجہد میں جو کارہائے نمایاں اس جماعت نے انجام دیئے، اُس کا جواب نہیں۔ ابتدائی دنوں میں رضا کاروں کی سرخ وردی سے انگریز اتنا گھبرایا تھا کہ اُس نے سرخ پوشوں کو بالشویک کہنا شروع کردیا اور اُن پر اندھادھند ظلم ڈھائے۔

## کانگریس کمیٹی:

سرحد کی سیاسی جماعتوں میں سب سے پہلی جماعت کانگریس ہی تھی جس نے لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ اُس کا مرکزی دفتر پشاور شہر میں تھا لیکن کانگریس کا اثر و رسوخ صرف شہر تک ہی محدود تھا۔ جب باچا خان نے کانگریس کو اپنایا تو دیہات بھی کانگریس سے متاثر ہوئے اور ایک وقت ایسا آیا جب کانگریس اور خدائی خدمت گار ایک ساتھ آزادی کے میدان میں اُترے۔ یہ بات بھی قابل فخر ہے کہ جب لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو آزادی کی مشعل پشاور کے کانگریسی رضا کاروں نے ہی اُٹھائی تھی اور یہی وہ پہلا اجلاس تھا جس میں سرخ پوش بھی شریک ہوئے۔

## سوشلسٹ پارٹی:

کانگریس اور خدائی خدمت گار جماعت کے ساتھ ساتھ نوجوان بھارت سبھا کا جنم بھی ہوا۔ پشاور کے انقلابی نوجوانوں نے اس کی بنیاد رکھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ نوجوانوں کی محبوب

جماعت بن گئی۔ نوجوان بھارت سبھا کی قیادت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی مرہونِ منت تھی، رفتہ رفتہ یہی جماعت سوشلسٹ ورکرز لیگ میں بدل گئی اور آخر میں اس نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا روپ دھار لیا۔ سرحد کی سوشلسٹ جدوجہد اِسی پارٹی کی اَن تھک کاوشوں کا نتیجہ ہے، پارٹی سرحد کے شہروں و دیہاتوں اور قبائل تک پھیلی ہوئی تھی۔ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ سرگرمیاں بھی اِس پارٹی کا نصب العین تھیں۔ حقیقت ہے کہ صوبہ سرحد کے سوشلسٹوں نے ان تھک قربانیوں سے بے پناہ انقلابی بیداری پیدا کی، اِس جماعت کے اراکین میں آگے چل کر کچھ نوجوان فارورڈ بلاک کی تشکیل کا باعث بنے۔ کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھنے میں بھی سوشلسٹوں کا کافی حصہ رہا ہے۔ اُن دنوں سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی میں نمایاں فرق نہ تھا۔

## مسلم لیگ:

عبدالقیوم بیرسٹر کے لیگی بنتے ہی سرحد میں مسلم لیگ کا چرچا ہونے لگا۔ لیگ اِس سے پہلے بھی تھی لیکن برائے نام۔ مسلم لیگ میں زیادہ لوگ وہ تھے جو کسی وقت کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ یہ لوگ جماعتی تنظیم سے واقف تھے اِس لئے تھوڑے ہی دنوں میں لیگ سارے صوبے میں پھیل گئی۔ لیگ کے سبز پرچم تلے کئی تحریکیں چلیں، مظاہرے ہوئے، ہنگاموں نے جنم لیا۔ مسٹر محمد علی جناح بھی مسلم لیگ کے قائد کی حیثیت میں پشاور آئے۔

## خاکسار جماعت:

علامہ مشرقی کی خاکسار جماعت کا جنم بھی پشاور میں ہی ہوا۔ اُن دنوں علامہ صاحب پشاور مسلم کالج کے پروفیسر تھے۔ جب پہلی بار خاکی وردی اور بیلچے کے ساتھ خاکساروں نے پشاور میں پریڈ کی تو اِس انوکھی جماعت پر لوگ بڑے حیران تھے۔ پشاور کا ایک ہندو نوجوان بھی خاکسار جماعت میں شامل تھا۔ خاکساروں کے بڑے بڑے اجتماع بھی پشاور میں ہی ہوئے۔

القصہ سرحد کی سیاسی زندگی میں کئی جماعتیں اُبھریں اور دم توڑ گئیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی تھیں جنہوں نے آزادی کے آخری لمحوں تک اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ ان جماعتوں میں تشدد اور عدم تشدد دونوں عقیدوں کو پرورش ملتی تھی۔ کچھ بھی ہو، سرحد کی سیاسی تاریخ انہیں نظر انداز نہیں کرسکتی!

☆☆☆☆☆

# پشاور

جیسے کوئی آدمی بھی اپنی ماں کے پیئے ہوئے دودھ کو نہیں بھول سکتا، ٹھیک اُسی طرح یہ بات بھی ناممکن ہے کہ وہ اپنی جنم بھومی کو بھول جائے۔ جنم بھومی جہاں انسان جنم لیتا ہے، وہ شہر، وہ گلی، وہ مکان اُسے کبھی نہیں بھول سکتا، جہاں اُس کی زندگی کے قیمتی لمحات گذرے ہوں جہاں اُس نے روزمرہ کے نشیب وفراز دیکھے ہوں، پرندہ گھونسلے سے بھلے ہی گر جائے، لیکن اُس کی نظریں گھونسلے کی طرف ہی رہتی ہیں۔ اس طرح مجھے بھی اپنی جنم بھومی سے پیار ہے، اس کی ہر ادا سے مجھے پیار ہے۔ میری جنم بھومی اٹک کے اُس پار پٹھانوں کے دیس میں ہے۔ پٹھانوں کا دیش باچا خاں کا دیش کہا جاتا ہے۔ مراد پشاور سے ہے، پشاور جس کی وجہ سے اس کا نام پشاور پڑ گیا۔ کسی نے کہا کہ شری رام چندر کے لڑکے "پشو" کے نام سے کہیں دُور سے سنائی دیتا ہے کہ یہ شہر پرسرام کا بسایا ہوا ہے اور کسی گوشے سے آواز آتی ہے کہ پشاور پشتونوں کا بگڑا ہوا نام ہے، کچھ بھی ہو میرے نزدیک وہ ایک خوبصورت، دلکش، بارونق، نظر فریب اور باکمال شہر ہے، جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تعریف سنی ہو تو کسی دل جلے عاشق سے سنیے جو اپنی بدصورت محبوبہ کو بھی حسن وجمال کی دیوی سے کم نہیں سمجھتا۔ لیلیٰ راہ بچشم مجنوں والی بات ہے۔ لیلیٰ کی رنگت کالی تھی لیکن مجنوں کے دل سے کوئی پوچھے کہ اُس کی لیلیٰ کیا تھی۔ پشاور مجھے ہر لحاظ سے پسند ہے۔ وہ شہر ہمہ صفت ہے، اس کے بازار، اس کی گلیاں، چوک، چبوترے، دوکانوں کی سجاوٹ، پودے اور پھول، چہل پہل، شور وغوغا اور قہقہے آج بھی مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اسکے مندر، گوردوارے، اور فلک بوس مسجدیں آج بھی پکار پکار کر کہتی ہیں اے جانے والو آؤ میرا دامن اب بھی کشادہ ہے آؤ میرے لاڈلو... آؤ ... میری جھولی میں سما جاؤ۔ وقت کے تقاضے کچھ بھی ہوں، حالات ناموافق سہی، واقعات نے رُخ اُلٹ دیا، کہیں کسی کی یادوں سے نہیں مٹ سکتی۔ پشاور مجھ

سے سینکڑوں میل دور ہے، راہ میں ندی، نالے، دریا، پہاڑ، وادیاں، جنگل اور لاکھ مصائب سہی، نگاہوں سے تو دور نہیں اور پھر وہ شہر جہاں میری زندگی کے تیس برس گذرے ہوں، جہاں میرے شباب کی رعنائیاں سی ہوں، جہاں میرے جیسے بے شمار ساتھیوں نے اپنی حیات مستعار کی بہاریں نذر کردی ہوں اور جہاں قدم قدم پر موت اور زندگی کی لڑائیاں لڑی گئی ہوں وہ مجھے کیسے بھول سکتی ہیں! پشاور جس نے مجھے بڑا کیا اور اپنی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے مجھ سے قربانیاں مانگیں! جب اسے انگریزی سماج نے زنجیروں میں جکڑنا چاہا تو اس نے بڑے فخر سے کہا کہ مجھے کوئی جھول نہیں سکتا۔ ابھی میرے بیٹے زندہ ہیں، وہ ان آہنی زنجیروں کو توڑ دیں گے اور ایسا ہی ہوا، جب اس کے بیٹوں نے دیکھا کہ کوئی فرعونی طاقت اس کے جسم سے ٹکرا رہی ہے تو وہ شعلہ بن کر اٹھے اور اپنی لازوال قربانیوں سے زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

کون نہیں جانتا! قصہ خوانی بازار کو اس کے خونی حادثے کو۔ جب سرفروشان حریت نے اپنے خون سے زمین کو لالہ زار بنایا، کسے یاد نہیں گورکھٹری بازار کا وہ دن! جب مجاہدین نے ننگی چھاتیوں پر گولیوں کے وار سہے اور یہ وہی پشاور ہے جس نے ہندوستان کے حریت پسندوں اور راہنماؤں کو اپنی بانہوں میں جگہ دی۔ 35 برس قبل کی بات ہے جب حضرت مولانا محمد علی جوہر نے پشاور کے باشندوں کو پیام اتحاد دیا تھا اور پھر بابا کھڑک سنگھ جی آئے اور آزادی کا نعرہ لگایا اور اسی شہر کی سڑکوں پر ہم نے دیکھا ہے گاندھی جی کو، جواہر لال نہرو، جے پرکاش نرائن اور مسٹر محمد علی جناح کو... اپنی گلیوں میں ہم نے مولانا آزاد، راجندر پرشاد، سردار پٹیل، مولانا حفظ الرحمن اور مولانا ظفر علی خاں کو دیکھا... اور یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ پشاور کی کشادہ بانہوں نے بڑے بڑے ادیبوں، فلاسفروں، فنکاروں اور صحافیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہ ہما گہمی کا شہر ہر آنے والے کا سواگت کرتا رہا، اپنی روایات کو زندہ رکھا اس کی نفرت سے ہٹ کر، مذہبی الجھنوں سے بے نیاز ہو کر، رنگ و نسل کی تفریق سے کوسوں دور رہ کر، اس نے اپنے مہمانوں کو گلے سے لگا لیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ پشاور زندہ لوگوں کا شہر ہے۔ پشاور شرافت اور خلوص کا سرچشمہ ہے۔ مجھے آج بھی اس سے پیار ہے، کیونکہ وہ میرا مسکن ہے۔ میری جنم بھومی ہے، میری تربیت گاہ ہے۔ آیئے ذرا اس کے درودیوار پر نظر دوڑائیں! گلی کوچوں اور بازاروں کو دیکھیں، پشاور کا گھنٹہ گھر جو کل خواب غفلت سے سوتے ہوؤں کو جگایا کرتا تھا اور آج بھی سونے والوں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ سچ،

تیرتھ — جہاں تالابوں کا جمگھٹا تھا، جس کا تعلق گورناتھ جی سے ہے، قصہ خوانی بازار جہاں دُکان داروں کا شور و غل سنائی دیتا ہے۔ چلتے پھرتے لوگوں سے اٹھکیلیاں کرتا ہے! مہابت خان کی مسجد! جس کے فلک بوس میناروں سے اللہ اکبر کی پاکیزہ صدائیں گونجتی ہیں۔ بابا سری چند کا گوردوارہ جہاں سے کبھی انسانیت کا پیغام ملتا تھا، اور ہر چھوٹے بڑے کوچے جن سے بے شمار داستانیں منسوب ہیں۔ وابستہ ہیں — ٹیڑھی ترچھی گلیاں جہاں کبھی ہندو اور سکھ کھیلتے تھے! تنگ اور کشادہ بازار جن سے اُن کے لاڈلے بڑے تزک و اہتمام سے عقیدت رکھتے ہیں۔ یہاں میرا خون گرا تھا! میرے ساتھیوں کے خون سے یہ زمین لال ہے۔ اس کے ذرّوں میں شہیدوں کا پاک لہو رچا ہوا ہے۔ مجھے یہاں کی سڑکوں سے بھی پیار ہے، جہاں وطن پرستوں نے انگریزی فرعونیت کا مقابلہ کیا۔ گولیاں کھائیں! لاٹھیاں کھائیں، ایک ساتھ آزادی کے نعرے لگائے۔ ہندو نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور مسلمان نے ہر ہر مہادیو کا نعرہ لگا کر اتحاد کا زندہ ثبوت دیا۔ ہجرت کی تحریک، خلافت کی لڑائی، رولٹ بل سول نافرمانی اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں ہندو نے مسلمان کا ساتھ دیا اور مسلمان نے ہندو کا دامن تھاما۔ دونوں بڑھے منزلِ مقصود کی جانب! انسانیت کی مشعل لے کر پاکیزہ جذبات کے ساتھ ۔ اور یہ میری جنم بھومی ہے۔ جہاں کے رہنے والوں میں اخلاص ہے، محبت ہے، پاکیزگی ہے، بے تکلفی ہے، جذبہ ایثار ہے، وہ کانگریسی تھے یا لیگی، خدائی خدمت گار تھے یا ہندو مہا بھائی، کمیونسٹ تھے یا سوشلسٹ — اُن کے روزمرہ میل جول میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ سیاست کے چبوترے پر بھلے ہی ایک دوسرے کو آنکھیں دکھاتے تھے لیکن ذاتی طور پر جب آپس میں مل بیٹھتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کے آپس کے میل جول میں کوئی فرق نہیں اور آج ۔ میں سمجھتا ہوں میرا پشاور جوں کا توں ہی ہوگا۔ آج بھی وہاں سیاست کے جھگڑے ہوں گے! سیاسی نشیب و فراز کا طوفانی چکر آج بھی چل رہا ہوگا۔ لیکن اُس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا ہوگا، چہل پہل وہی ہوگی! وہی اٹھکیلیاں، وہی خوش گپیاں، وہی چھیڑ چھاڑ، کیونکہ پشاور، پشاور ہی ہے! میزبانوں کا شہر، مسکراہٹوں کا گہوارہ! پیار کا سمندر — اور آج پشاور سے میں بہت دُور ہوں، کوسوں دُور، جس کی ہوائیں بھی میرے جسم سے نہیں ٹکرا سکتیں۔ جس کے قہقہے میرے بے چین دل کو سکون نہیں بخش سکتے، جس کی گونجتی آوازیں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی! پھر بھی مجھے اُس سے پیار ہے کیونکہ وہ میری جنم بھومی ہے۔ میں نے اُس کی گود سے جنم لیا ہے۔ اُس

کی نرم نرم آغوش میں کروٹیں بدلی ہیں، اس کی گلیوں میں کھیلا ہوں، اس کی دیواروں سے بارہا ٹکرایا ہوں، سڑکوں سے اُلجھا، باغوں سے اٹھکیلیاں کیں، لہلہاتے کھیتوں سے دل بہلایا، اور پھر میں نے اسی شہر میں آزادی کے گیت گائے۔ وطنیت کے گیت گائے! مجھے اس چوک یادگار سے بھی پیار ہے، جہاں بڑے بڑے اجتماع ہوتے رہے، جہاں سے بڑی بڑی شخصیتوں نے پیام انسانیت دیا۔ جہاں حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے بغاوت کا پرچم لہرایا! یہی وہ چبوترا ہے جہاں خان عبدالغفار خان نے محبت اور پیار کا نعرہ لگایا اور اسی مقام پر گڑھ والی سپاہیوں نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا اور ہماری نظریں چوک یادگار کو دیکھ کر ماضی کی طرف لوٹ جاتی ہیں! جب پرنس آف ویلز کو کالی جھنڈیوں سے واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہ مقام جدوجہد کا مرکز ہے۔ اتحاد اور اخلاص کا سنگم اُلفت ومحبت کا سرچشمہ میں سوچتا ہوں کیا پشاور اب بھی مجھے یاد کرتا ہوگا، میں اس کی کشادہ بانہوں میں چند لمحوں کے لئے سکون حاصل کر سکتا ہوں! اس کے چشمے، کھیت، باغیچے، پارک، گلی، کوچے، سڑکیں اور چبوترے اب بھی مجھے اپنی گود میں لے سکتے ہیں! تصور میں جب بھی پشاور کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی ہے تو پاگلوں کی طرح چیخ اُٹھتا ہوں میرا پشاور میرا گھر میری جنم بھومی بھلا کس کی مجال ہے جو مجھے اس سے الگ کر دے۔ اور جب تصورات کی دنیا بکھر جاتی ہے، جب خیالات کا تانا بانا ٹوٹ جاتا ہے تو پھر نہ جانے دل کی دھڑکن کیوں بند ہو جاتی ہے۔ دل سے ایک آواز نکلتی ہے! پگلے، پرانی باتوں کو بھول جا۔ کس کا گھر اور کس کی جنم بھومی، جہاں رہو وہیں گھر، جہاں بیٹھو وہی ٹھکانہ۔ لیکن اس دماغ کا کیا کروں۔ جو مجھے جھنجھوڑ کر کہتا ہے پشاور سے تمہارا چولی دامن کا تعلق ہے۔ ناخن اور گوشت والی بات ہے! یہ نظروں سے دور سہی، دل سے تو دور نہیں اور واقعی وہ دل کے اتنا ہی قریب ہے جتنی منہ کے اندر زبان۔۔۔ زبان دانتوں سے ہر لمحہ ٹکراتی ہے، لیکن کٹتی نہیں۔ میرا پشاور، دنیاوی اُلجھنوں سے ٹکرا ٹکرا کر بھی برباد نہیں ہو سکتا، اس کی کشادہ بانہیں آج بھی میرے لئے پھیلی ہوئی ہیں۔ اس ایک خط سے اندازہ لگایئے جو مجھے حال ہی میں پشاور سے آیا ہے۔

چچا جان کیا آپ کچھ دنوں کے لئے پشاور تشریف نہیں لا سکتے! کیا آپ کو اپنی جنم بھومی یاد نہیں آتی؟ کیا آپ پشاور کو بھول گئے ہیں جہاں آپ پلے بڑھے اور جس پہ آپ کی کئی یادیں

وابستہ ہیں جس کا پانی گھی اور امرت ہے۔

چچا جان! صرف ایک بار آئیں، کیا آپ کو کبھی چھٹیاں نہیں ہوتیں کہ ایک (نامعقول) بھتیجی کو مل آئیں؟ میں امید کروں کہ آپ یہاں آنے کی کوشش کریں گے؟

بُلبل کو گُل مبارک گُل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

آپ کی بھتیجی
(شہناز نیر، پشاور)

☆☆☆☆☆

# ہندو مسلم یک جہتی!

وقت وقت کی بات ہے میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہر آدمی کی زبان پر ایک جملہ تھا ہندو مسلم بھائی بھائی کیا گاؤں اور کیا شہر، گلی کوچے اور بازار بلکہ ہر در و دیوار سے بھی آواز سنائی دیتی تھی اور اس مختصر سے جملے میں انسانیت کی تصویر جھلکتی ہے۔ پیار اور محبت کی تصویر، سچائی، اور ہمدردی کی تصویر اور اُس خوشنما تصویر میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی تھے اور سکھ بھی غریب بھی تھے اور امیر بھی راجے اور نواب بھی تھے، کسان اور مزدور بھی تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔ یہ جملہ میری زندگی سے پہلے بھی بڑے زور و شور سے فضا میں گونج چکا تھا۔ بات 1857ء کی ہے جب ہندو اور مسلمان، مُلا اور پنڈت، شہری اور دیہاتی ایک ساتھ ہو کر، ہاتھ سے ہاتھ ملائے قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے، منزل حریت کی جانب، جدھر جدھر سے مجاہدین حریت گذرتے تھے، اُن پر گلاب اور پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔ ہندو جے جے مہادیو کا نعرہ لگا کر اُن کا سواگت کرتا تھا، اور مُلا اللہ اکبر کی مقدس آواز سے اُن کا استقبال کرتا تھا ہندو عورتیں مسلم مجاہدوں کی پیشانی پر تلک لگایا کرتی تھیں اور مسلمان عورتیں ہندو جاں بازوں پر گلاب چھڑکتیں۔ ایک طرح کا یہ خلوص تھا دونوں فرقوں میں، اور پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب میں نے اپنی آنکھوں سے اس یک جہتی اور اتحاد کو دیکھا۔ بات پرانی ہے۔ ہندوستانی علماء کے فیصلہ پر ہندوستان سے لاکھوں مسلم ہجرت کر کے افغانستان جا رہے تھے۔ یہ لوگ عام طور پر صوبہ سرحد کی طرف سے ہی جاتے تھے، اُن کے قافلے ادھر سے گذرتے، اُن کے ٹھہرنے کا بندوبست پشاور شہر میں تھا۔ مقامی ہندو اور سکھ رضا کارانہ طور پر ہجرت کرنے والے مسلم بھائیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اُن کے کھانے پینے اور عارضی طور پر رہنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

یہاں بڑے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے۔ مقامی ہندواور مسلم رضا کاروں کی کمر میں ایک پٹی کسی ہوتی تھی جس پر لکھا رہتا تھا ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' اور واقعی یہ منظر بھائی چارے کا ہی تھا۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو چھتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ الوداع کہتا تھا اور یہ سلسلہ پشاور سے افغان سرحد تک چلتا تھا۔ میرے محلے کے قریب بھی مہاجرین کا ایک کیمپ تھا۔ یہاں کا سارا بندوبست ہندو رضا کار ہی کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے مسلم بھائیوں کو چائے پلاتے تھے، کھانا کھلاتے تھے، جدھر جدھر سے مہاجرین مرد، عورتیں اور بچے گذرتے تھے، ہندو عورتیں اور مرد ان پر پھول بکھیرتے تھے فلک شگاف نعرے گونجتے تھے اور ایک ترانہ مہاجرین کی قیادت کرتا تھا۔

چلو مسلماں چلو مسلماں۔ امیر کابل بلا رہا ہے!

کابل میں اُن دنوں امان اللہ خان کی حکومت تھی۔ غازی امان اللہ خان انگریزوں کے شدید مخالف تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے بھی ہمدرد اور معاون تھے۔ انہی کی بدولت افغانستان میں ہندوستانی انقلاب پسند جمع ہوئے تھے۔ یہی پہلا ملک تھا جہاں مولانا عبیداللہ سندھی اور مہاراجہ مہندر پرتاب سنگھ نے آزاد ہندوستان کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اسی خیال سے افغانستان جارہے تھے کہ ایک تو وہاں خالص اسلامی حکومت ہے، دوسرے وہاں ہندوستان کی آزادی کے مجاہد رہتے ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں کہ امیر کابل نے ہندوستان کے لوگوں کو اپنے ہاں بلوایا تھا یا نہیں۔ بہر حال یہ ایک جذبہ تھا جو مسلمانوں کو افغانستان کی سمت لئے جارہا تھا۔ یوں کہہ لیجیے کہ نام دو تھے اور رُوح ایک اتحاد اور محبت یہاں تک بڑھی کہ ہندو نے مسلمان کا جھوٹا پانی پیا اور مسلمان نے ہندو کے جھوٹے پانی سے پیاس بجھائی اور یہ رُوح پرور منظر میری آنکھوں نے دیکھا ہے اور اتنا ہی نہیں، یہ پیار، یہ خلوص اور یہ یک جہتی آگے چل کر تحریک خلافت میں دیکھی گئی۔ جب گاندھی جی نے پہلی بار چاند ستارے والا پرچم فضاؤں میں لہرا کر کہا کہ مسلمان ہمارے بھائی ہیں اور اُن کا دُکھ درد ہندوؤں کا دُکھ درد ہے تو سارے دیش کے ہندو مسلم ایک ہوگئے اور یہ پیار محبت کی ہوائیں پٹھانوں کے دیش میں بھی لہرائیں۔ پھر ایک بار وہی خلوص، وہی یگانگت، وہی پیار اور وہی بھائی بھائی کا راگ کیا زمانہ

تھا! ایک ساتھ اُٹھنا، ایک ساتھ چلنا۔ مرنا بھی ایک ساتھ، جھگڑنا بھی ایک ساتھ اور یہ یک جہتی محض اُن لوگوں میں نہ تھی جو آزادی کے خواہاں تھے بلکہ غنڈوں میں بھی تھی۔ ہندو غنڈے اور مسلمان غنڈے ایک ساتھ مل کر غنڈہ گردی کرتے تھے، لیکن اُن کے جذبات فرقہ وارانہ نہ تھے۔ اُن دنوں دونوں قوموں کی بے ہودہ باتیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ برسوں پہلے کی بات ہے میرے علاقے میں بابو نام کا ایک غنڈہ رہتا تھا۔ ایک دن کسی علاقے کے غنڈے نے ایک ہندو لڑکی کو چھیڑ دیا، بات ذرا سی تھی، بابو کو جب پتہ لگا کہ اُس کے علاقے کی ایک لڑکی کو دوسرے علاقے کے غنڈے نے چھیڑا ہے تو وہ سیدھا اُس کے پاس گیا، دونوں میں سخت تلخ کلامی ہوئی اور مار پیٹ تک نوبت آئی اور آخر دونوں کو جیل دیکھنا نصیب ہوا۔ اس چھوٹی سی بات سے اندازہ لگایئے کہ اُن دنوں فرقہ وارانہ یک جہتی کس قدر تھی۔

ہم نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب ہندو لیڈر مسجدوں کے میناروں پر کھڑے ہو کر آزادی کے گیت گاتے تھے اور مسلمان رہنما مندروں میں جا کر لوگوں کو دیش بھگتی کا درس دیتے تھے۔ مندر کے در و دیوار سے اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی تھیں اور مسجد کے میناروں سے ہر ہر مہادیو کے نعرے فضاؤں میں مقدس نغمے بکھیرتے تھے۔ ہندو مردوں کا جنازہ مسلمان اپنے کندھوں پر اُٹھاتے تھے اور مسلمان مردوں کا جنازہ ہندوؤں کے کندھوں پر ہوتا تھا۔ کل کی طرح مجھے ایک بات یاد ہے، آزادی کی تحریک جوبن پر تھی کہ اچانک ایک رات پشاور کی ایک تنگ سی گلی میں ایک بم آ گرا جس نے ایک سردار کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔ یہ سردار صاحب کباڑ کی دوکان کرتے تھے۔ رات بھر لوگ اُن کی دوکان پر آتے جاتے رہے۔ نعش پر پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی رہیں۔ ہر طرف سے ایک ہی آواز تھی یہ شہید ہے، پولیس کے غنڈوں نے بم مار کر اس کو جام شہادت پلا دیا ہے۔ صبح ہوتے ہی ہزاروں لوگ جنازہ کے ساتھ دیکھے گئے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ سردار جی کا جنازہ مسلمانوں کے کندھوں پر تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ سردار صاحب کو خواہ مخواہ شہید بنایا گیا، وہ تو کسی ذاتی دشمن نے موقع پا کر اُن پر بم دے مارا اور وہ بیچارے جام شہادت پی گئے۔ اُن دنوں بم زیادہ پھینکے جاتے تھے اور یہ کام انقلابی صرف دہشت پیدا کرنے کے لئے کیا کرتے تھے۔ بم کی بات نکلی ہے تو ایک لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ ہمارے ایک دوست تھے انقلابی وضع قطع۔ اُنہیں بم چلانے

کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن شام چھپتے ہی کہیں سے بم آ گرا، بازار میں افراتفری مچ گئی۔ یہ انقلابی میرے پاس آیا اور چپکے سے کہا، کیا تم جانتے ہو یہ بم کس نے مارا۔ جناب عالی یہ کام آپ کے اِسی خادم کا ہے۔ لیکن ذرا سنو یہ بات کہنا کسی سے نہیں۔ اِسی طرح یہ انقلابی دوسرے کے پاس آیا اور کہنے لگا یہ بم تو اِسی بندے نے پھینکا...... لیکن یہ راز کسی پر فاش نہ ہو، صرف آپ ہی سے کہہ رہا ہوں۔ ایسے بم ہفتے میں دو چل جاتے تھے اور یہ صاحب اِس کارنامے کو اپنی ذات سے منسوب کر کے رازداری سے کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ کام میرے سوا کون کر سکتا ہے۔ ایک دن ہم چند ساتھی اکٹھے ہوئے، بات اُسی انقلابی ساتھی کی چل نکلی۔ ایک نے کہا تم لوگ کیا جانو یہ بم کون مارتا ہے۔ دوسرے نے کہا اجی رہنے بھی دو، یہ کام تو فلاں آدمی کا ہے۔ تیسرے نے کہا ہاں ہاں یہ کام تو اُسی کا ہے۔ پھر باری باری سب نے یہی بات دہرائی اس پر ہم سب خوب ہنسے۔ کتنا عجیب ہے یہ انقلابی دوست بھی، ہر ایک کو اپنا رازدار بناتا، اور ہر ایک کے سامنے ایک ہی راگ الاپتا کہ بم میں مارتا ہوں۔ دنیا میں عجیب دھن کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ بات تو ویسے ہی درمیان میں آ گئی۔ ذکر چل رہا تھا ہندو مسلم بھائی بھائی کا۔ آزادی کے کتنے مرحلوں میں تو بھائی بھائی کا نعرہ حقیقت بن کر سامنے آیا۔ اُس دور میں تو واقعی بھائی چارے کا لطف آتا تھا۔ آزادی کے لئے لوگ ایک ساتھ مرتے تھے۔ دونوں فرقوں کا لہو ایک ساتھ بہتا تھا، کرشن اور محمدؐ دونوں کے نام لیوا ایک ساتھ تختۂ دار پر لٹک کر حق دوستی ادا کرتے تھے۔ مریم اور سیتا ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ ڈالے گولیاں کھاتی تھیں اور معصوم بچے ہنستے کھیلتے آزادی کی چتا پر جل کر راکھ ہو جاتے تھے۔ کتنا مقدس درد تھا وہ، لیکن پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس محبت، خلوص اور بھائی چارے میں نفرت اور حقارت کے جذبات بھی دیکھے گئے۔ بھائی بھائی کے نعروں میں دشمنی کی دہشت ناک آوازیں بھی سنائی دیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ تبدیلی ہوئی کیسے؟ یہ ساری عنایت انگریزی حکومت کی تھی، جس نے ہندوستان پر حکومت کرنے سے قبل اِس بات کی قسم کھائی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ نہ رہنے دیا جائے گا۔ ہندو مسلم اتحاد ہمارے منصوبوں کو خاک میں ملا کر رکھ دے گا۔ اِسی سلسلہ میں ایک انگریز کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان میں تفریق پیدا کریں، دونوں کو

آپس میں لڑائیں، جب تک ہندو اور مسلمان کے درمیان مذہبی لڑائی

شروع نہ ہو جائے، ہمارا کام نہیں ہو سکتا۔"

اور اتنا ہی نہیں انگریزوں نے اپنی پوری طاقت سے فرقہ وارانہ کشیدگی کو جنم دیا۔ ہندو مسلم یک جہتی پر کاری ضربیں لگائیں۔ گیتا اور قرآن کی توہین کی، زر خیز ملاؤں اور پنڈتوں نے ملک کی فضا کو مکدر بنایا، قتل و غارت کا بازار گرم ہونے لگا، گھر گھر اور گلی گلی آگ اور خون کی یہاں تک ہولی کھیلی جانے لگی کہ انسان انسان کا دشمن بن کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوا۔ مندروں اور مسجدوں کو فرقہ واریت کا اڈہ بنا دیا گیا، نعرے بدل گئے، نام بدل گئے، جذبات بدل گئے، انسانیت بدل گئی اور حیوانیت نے ننگا ناچ شروع کر دیا۔

لیکن حالات پلٹا کھاتے ہی ہیں۔ اگر ایک طرف انگریز نے فرقہ پرستی کو ہوا دی تو دوسری جانب اتحاد پرور قوتیں جاگ اٹھیں، لوکمانیہ تلک، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالغفار خان، بی اماں اور سروجنی نائیڈو نے پر جوش آواز میں کہا

ہندوستان ایک ہے، ہندوستانی ایک ہیں، اللہ اور پرماتما ایک ہی طاقت کے دو نام ہیں۔

لوکمانیہ تلک نے کہا۔

آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔

مہاتما گاندھی نے کہا۔

عدم تشدد ہمارا دھرم ہے۔

عبدالغفار خان نے کہا۔

ہندو مسلم میں کسی بات کا فرق نہیں، یہ فرق انگریز کا پیدا کردہ ہے۔

اور پھر سارے دیش سے آواز اٹھی۔

ہم ایک ہیں، ہمارا ملک ایک ہے، یہ زمین، یہ آسمان، یہ ہوا اور یہ فضائیں

سب ہمارے لئے ہیں۔

اور انہی فضاؤں میں تحریک ہجرت کا آغاز ہوا، تحریک خلافت نے جنم لیا، انہی فضاؤں میں

آزادی کا پرچم لہرایا۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا وہ سنہرے دن پھر آ سکتے ہیں۔ پھر ایک بار بھائی چارے کے ترانے فضاؤں میں گونج سکتے ہیں۔ وہی محبت، وہی خلوص، وہی پیار، وہی ہمدردی اور وہی پاکیزہ جذبات

سنو اے ساکنانِ زلفِ گیتی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

☆☆☆☆☆

# جیل کی بھیانک راتیں

نہ جانے کتنی راتیں جیل میں گذریں، لیکن کچھ راتیں ایسی بھی گذریں جن کی یاد دل میں آج بھی تازہ ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میری طرح لاکھوں انسان آزادی کی لڑائی میں دیوانہ وار لڑ رہے تھے۔ آزادی کی جدو جہد! اسی جدوجہد کی چند راتیں ملاحظہ ہوں۔

پشاور سنٹرل جیل کی ایک رات تھی۔ انتہائی سردی کی رات، بیچارے قیدیوں کے پاس صرف ایک کمبل تھا، باوا آدم کے وقت کا، پھٹا ہوا، بدبودار اور کھٹملوں کا گھروندا۔ ہم چار قیدی ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر قیدی اپنے کمبل میں گٹھڑوں گٹھڑوں بنا بیٹھا تھا لیکن نیند کہاں؟ سردی اور سردی کی دم توڑ دینے والی رات، ہم دو ساتھی اوپر نیچے کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ سردی کی شدت پھر بھی کم نہ ہوئی، مجبوراً چاروں قیدی بارک کے کونے میں دبک کر لیٹ گئے۔

سردی کی رفتار کچھ کم ہوئی لیکن ایک گھنٹہ کے بعد ہی جیل کا الارم سنائی دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری بیرک کا بڑا دروازہ کھلا۔ جیل وارڈن غصے میں بھرے ہوئے اندر داخل ہوئے اور ہر قیدی کو ٹھوکر مار کر جگانے لگے۔ ہم دبکے ہوئے تماشہ دیکھ رہے تھے لیکن حیران تھے کہ آخر بات کیا ہے۔ یہ ہلڑ بازی کیوں؟ جب داروغہ جیل ہمارے پاس تشریف لائے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ تم نے اپنی جگہ کیوں چھوڑ دی ہے؟ سردی ہے۔ کیا کریں۔ ہم میں سے ایک نے کہا    لیکن تمہاری جگہ خالی ہونے سے جیل وارڈن کو شبہ ہو کہ چار قیدی بھاگ گئے ہیں، یہ کتنا خطرناک ہے۔

لیکن قیدی کوئی بھاگا تو نہیں گنتی کر لیجیے    خیر رات تو بلا ٹل گئی۔ لیکن صبح اکٹھے رہنے کا نتیجہ

بھگتنا پڑا۔ چوروں کو ایک ایک دن تنگ کوٹھری میں گذارنا پڑا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تنگ کوٹھری میں سردی اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

دوسری رات برنی پور سنٹرل جیل کی ہے۔ یہ گرمی کی رات جھلسا دینے والی گرمی۔ آگ سے بھی زیادہ تیز ایک بیرک میں پچاس قیدی بیرک کے چاروں طرف شیطانی آنت سے بھی اونچی دیواریں، کھٹملوں کی فوج۔ ہماری بیرک میں ایک صاحب ملاں تھے جنہوں نے اپنی بھاوج کو قتل کر دیا تھا اور عدالت میں جرم سے انکار کر رہے تھے۔ یہ صاحب قرآن کے حافظ بھی تھے۔ خوبصورت، صحت مند اور قد آور اچانک رات کے دو بجے چلانے لگے۔ کپڑے پھاڑ دیئے، پاجامہ اُتار کر پھینک دیا۔ ننگے دھڑنگے اٹھے، ور بے تحاشہ ناچنے لگے۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ ہائے ہائے میری بھاوج۔ واہ رے منے تو بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مارو مارو سالے کو۔ وہ دیکھو قاتل بھاگ رہا ہے۔

یہ صاحب رات بھر اول جلول بکتے رہے۔ تمام بیرک جاگ اٹھا اور اس بناوٹی پاگل کو دیکھنے لگا۔

میں قاتل صاحب کے پاس گیا اور کہا۔ حضرت کیا ہوا آپ کو دن کو تو آپ بالکل ٹھیک تھے؟ یہ ڈرامہ کیسا اور کیوں؟ لیکن وہاں تو کوئی اثر نہ تھا۔ گالیاں بک رہا تھا، فحش گالیاں مجبور ہو کر ہم نے جیل وارڈن کو آواز دی۔ اُس نے جمعدار کو اطلاع دی۔ بات داروغہ تک جا پہنچی۔

بیرک کا دروازہ کھلا۔ حضرت کو زنجیروں سے باندھ کر باہر لے جایا گیا۔ ہم نے سمجھا کہ بیچارے کو پھانسی کا تختہ نظر آ رہا ہے۔ اس صدمے سے پاگل ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا ہو سکتا ہے غریب بے گناہ ہو۔ دوسرے دن جب ہم کچھ قیدی کال کوٹھریوں کے آگے سے گذر رہے تھے تو اچانک میری نظر ایک کوٹھری پر جا پڑی۔ وہی حضرت تھے، دوزانوں ہو کر گہری سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ رات کو بیچارے کی اس قدر مرمت ہوئی کہ سب بل نکل گئے۔ جھوٹ کا پاگل پن کافور ہو گیا اور پاگل پن والا ڈرامہ محض ایک دکھاوا تھا کہ جیل والوں کو پاگل پن کا یقین دلایا جائے اور پاگل پن کی رپورٹ عدالت تک جا پہنچے۔ افسوس کہ ڈرامہ ناکام رہا اور حضرت ایک پھانسی کے پھندے کی بھینٹ ہو گئے۔ بے گناہ عورت اور اُس کے بچے کا بدلہ لے لیا گیا۔ بچہ عورت کے پیٹ میں تھا۔

اور ایک بار بڑی خطرناک رات دیکھنے میں آئی۔ جیل کی رات تھی، بھیانک اور خون ریز رات۔ دس بجے کا وقت تھا۔ میں ہسپتال کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لوہے کی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک زخمی آدمی لایا گیا۔ اُسے چارپائی سے باندھ دیا گیا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ زخمی قیدی کے دونوں ہاتھ اور پاؤں چارپائی کے ساتھ زنجیروں میں باندھ دیئے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک اشتہاری مجرم ہے، قاتل ہے، بے شمار قتل اس کے ہاتھ سے ہوئے ہیں۔ آج اسے پولیس سے تصادم کرتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور مجسٹریٹ صاحب بمعہ داروغہ جیل کے اندر تشریف لائے۔ زخمی سے سوال وجواب کرنے لگے، لیکن وہ ہر بات سے انکار کرتا رہا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں باتیں کررہا تھا۔ ہر دومنٹ کے بعد خاموش ہوجاتا، ایک گھنٹہ کی سرکھپائی کے بعد مجسٹریٹ ناکام لوٹا۔ میں زخمی کی حالت سے بے حد متاثر ہورہا تھا۔ جب سب پولیس والے چلے گئے تو میں نے کہا، دوکو گولی کا نشانہ بنادیا گیا ہے، اُف کیا کروں! مررہا ہوں۔ دراصل پولیس کے مقابلہ میں ایک گولی رانوں میں لگ گئی جس سے عضوِ مخصوص بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ اس نے کہا میں نے 28 قتل کئے ہیں، پولیس والوں کا ناک میں دم کردیا ہے۔ یہ رات میرے لئے بڑی بے چین تھی۔ اس کے کراہنے سے میں رات بھر سو نہ سکا اور دوسرے دن زخمی کی مرہم پٹی کی گئی۔ چھ ماہ تک اُس پر مقدمہ چلا۔ آخر موت کی سزا ملی۔

راولپنڈی جیل کی ایک رات کا ذکر ہے، محمد شریف نامی ایک لڑکا میرے ساتھ تھا، ہم دونوں کو راولپنڈی پولیس نے گرفتار کرلیا اور جیل لے گئی۔ الزام تھا مفروری کا ... میں پشاور سے بھاگ کر پنجاب آگیا تھا۔ محمد شریف لاہور سے بھاگ کر راولپنڈی آگیا۔ جس بیرک میں ہمیں رکھا گیا، وہ خونی ڈاکوؤں، چوروں اور غنڈوں کی بیرک تھی۔

محمد شریف نہایت خوبصورت تھا۔ عمر بمشکل 18 برس ہر قیدی کی نظریں شریف کے نرم ونازک جسم کی طرف گڑھی جارہی تھیں۔

ہر قیدی تھوڑے سے وقت میں ہی اُس سے تعلقات بڑھاتا دکھائی دے رہا تھا صحت اور خدوخال کے لحاظ سے بھی وہ قدرے ٹھیک ہی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر دو دن اس بیرک میں رہ گئے تو خدا جانے کیا ہو۔ ان غنڈوں کا ہم کیا بگاڑ لیں گے۔ سارے قیدی ہی غنڈے تھے،

اُس وقت مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے زور زور سے انگریزوں کی مخالفت شروع کر دی۔ حکومت پر لعن طعن کرنے لگا، قیدیوں کو اس قدر بھڑکا دیا کہ وہ بھی میرے ساتھ انگریزوں کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ تم سب شریف آدمی ہو۔ پولیس نے تمہیں بے گناہ قید کر رکھا ہے۔ تم لوگوں کو گندی خوراک ملتی ہے، ناپاک کپڑے ملتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کا قصور ہے۔ میں چلاّ رہا تھا کہ جیل کے وارڈن آگئے۔ انہوں نے روکنا چاہا میں نے اُن سے بھی یہ کہا کہ بڑے بڑے افسر بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں۔ لیکن تم رات دن محنت کرنے کے باوجود پیٹ بھر کھانا نہیں کھا سکتے۔ تم گھنٹوں پہرہ دیتے ہو، یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ انگریز بدمعاش ہے، حکومت ذلیل ہے۔ ہم جیل میں بغاوت کرا دیں گے۔ محمد شریف نے کہا بولو کیا تم بھی ہمارے ساتھ ہو؟ جواب ملا ہم تمہارے ایک اشارے پر لڑیں گے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ جانی تمہارے کہنے پر جیل کی دیواریں بھی توڑ دیں گے۔ اِسی گوشہ سے کسی نے کہا۔ قسم خدا کی تم کہہ کر دیکھو ہم کیا نہیں کر سکتے۔

رات اِسی ہنگامے میں گذر گئی۔ صبح بیرک کا دروازہ کھلا تو ہم دونوں کو داروغہ کے پاس لے جایا گیا..... اُس نے کہا تم نے قیدیوں میں بغاوت پھیلا دی ہے، اِس لئے تم دونوں کو الگ الگ کوٹھری میں بند کیا جاتا ہے۔

ہم نے کہا آپ جو کچھ کریں، بغاوت ہمارا دھرم ہے۔

لہٰذا ہم دونوں کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔

دراصل یہی ہمارا منشاء تھا۔ غنڈوں کے ساتھ رہنے کی بجائے تنگ و تاریک کوٹھری میں رہنا ہمیں پسند تھا۔ نہ جانے غنڈوں کے ساتھ رہنے میں ہماری کیا درگت بنتی!

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

☆☆☆☆☆

# ہم نے زنداں میں منائی اِسی دستور کی عید

جیل کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے اور پھر خاص طور سے جیل کے تہوار۔ بیچارہ قیدی اُس وقت عجیب حالت میں ہوتا ہے جب کوئی تہوار آئے وروہ اُس میں حصہ نہ لے سکے۔ ایک زمانہ تھا جب جیل کی چار دیواری میں کوئی تہوار منانا مشکل تھا۔ چاہے وہ تہوار دھارمک (مذہبی) ہو یا کوئی دوسرا۔ اگر کوئی زندہ دل قیدی اپنی بساط کے مطابق اس تہوار کو منانے کی جرات کرتا بھی تھا تو جیل کی کال کوٹھری اُس کا سواگت کرتی تھی اور اتنا ہی نہیں بعض اوقات تو اُس بیچارے کی وہ گت بنتی تھی کہ خدا کی پناہ۔ میری زندگی میں کئی تہوار اور تقریبات ایسی بھی آئیں جب میں جیل میں تھا، یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کوئی تہوار بھی جیل میں منایا نہیں جاتا تھا۔ قیدیوں کو کوئی سہولت نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ مشقت سے اُس دن کی چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔ بیچارے قیدی اپنی بیرکوں میں بند ایک دوسرے کا منہ دیکھتے تھے اور خاموشی سے تہوار منایا کرتے تھے۔ جیل ہی کی خوراک اُن کے لئے تحفہ سمجھی جاتی تھی۔ کچی روٹی ہی بیچاروں کے لئے پراٹھے بن جاتے تھے اور ملا ہوا سالن بن گوشت پلاؤ کی صورت اختیار کر لیتا تھا اور اگر کسی قیدی کے پاس گڑ کی ایک ڈلی بھی مل جاتی تھی تو سارے جیل میں اُسے رئیس اعظم سمجھا جاتا تھا۔ بات ''عید'' کی ہے اس لئے لگے ہاتھوں ''عید'' کی باتیں سُن لیجیے۔ جیل کے اندر پہلی بار عید کا مجھے اُس وقت پتہ چلا جب اس مقدس تہوار پر چند قیدیوں کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔ ایک دو کی مار پیٹ بھی ہوئی۔ جیل والوں کا یہ سلوک نا قابل برداشت تھا اس لئے سیاسی قیدیوں نے اُس دن کی خوراک لینے سے انکار کر دیا اور بجائے مرغن کھانے کے سارا دن فاقہ میں گذار دیا۔ گویا عید کا متبرک تہوار فاقہ کشی کی بھینٹ ہو گیا۔ اُن دنوں جیل میں پہلی بار ہی گیا تھا۔ اس لئے یہ انوکھی بات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ تب میں سوچنے لگا۔ عید تو بڑا تہوار ہے مجھے اس پر

پابندی کیوں؟ پورے ایک ماہ تک روزے رکھنے کے بعد عید کے دن بھی روزہ رکھا جائے۔ مجھے یہ بات پسند نہ آئی اور میں نے احتجاج کے طور پر کھانا لینے سے انکار کر دیا، اور پھر نہ جانے کتنے ایسے تہوار آتے اور جاتے رہے، آج عید ہے تو کل دیوالی۔ لیکن جیل افسروں کو اس سے کیا سروکار۔ انہیں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ اگر کسی قیدی نے جیل والوں کی مٹھیاں گرم کر دیں تو یہ دن اُس کے لئے تہوار کا دن ہے، باہر کی ہر چیز اُس تک آ پہنچتی ہے۔ اتنا ہی نہیں میں نے جیل کے اندر شراب کے جام کھنکتے ہوئے دیکھے ہیں۔ مرغن کھانوں کی بات تو رہی الگ، ہری پور سنٹرل جیل کی بات ہے، اُن دنوں عبدالغفار خان اسی جیل میں تھے اور صوبہ سرحد کے مفتی اعظم مولانا عبدالرحیم پوپلزئی بھی اپنی سات سالہ قید اسی جیل میں کاٹ رہے تھے۔ مجھے بھی اسی جیل میں رہتے ہوئے دو برس بیت گئے تھے۔ چونکہ اس احاطہ میں صرف آٹھ کوٹھڑیاں تھیں اور ہم تین قیدی اس لئے ہمارا کھانا ایک ساتھ ہی بنتا تھا۔ مولانا صاحب اور باچا خان اپنی مقررہ قید کاٹ رہے تھے اور میں نظر بند تھا۔ اس لئے میری قید کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ انہی دنوں ''روزے'' سر پر آگئے۔ باچا خان اور مولانا صاحب نے جب پہلا روزہ رکھا تو مجھ سے کہا کہ تم اپنا کھانا بنوالو اور ہمارا کھانا شام کو اور صبح چار بجے بنا کرے گا۔ پہلے دن تو میں نے حسب عادت رات کا کھانا کھالیا اور سو گیا۔ جب صبح چار بجے اچانک آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا صاحب اور باچا خان مزے لے لے کر چائے پی رہے ہیں۔ سردیوں کے دن تھے اور پھر گرم گرم چائے، جی للچانے لگا، باچا خان میری دبی دبی خواہش کو بھانپ گئے لیکن خاموش رہے، مولانا صاحب نے بھی میری طرف دیکھا اور چائے پینے لگے۔ میں چور آنکھوں سے دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مطلب یہ تھا کہ ایک پیالی چائے میرے حلق میں بھی اُنڈیل دو اور ایسا ہی ہوا۔ چائے تو مجھے پلادی گئی۔ باچا خان نے کہا، اگر تم ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہوتے ہو تو پھر دن کو ہمارا ساتھ دو۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ تم دن کو بھی کھانے کھاؤ اور ہم اپنا منہ سیئے رکھیں۔ بات مذاق کی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی روزے رکھنے چاہئیں۔ اسی طرح ایک تو مجھے اپنے دونوں بزرگوں کا پکا ساتھی سمجھا جائے گا۔ دوسرے ثواب بھی ملے گا۔ لہٰذا میں نے بھی روزے رکھنے شروع کر دیئے اور اب ایک دو کی جگہ تین روزہ دار اس احاطہ میں اکٹھے ہو گئے۔ یقین مانئے! کہ روزے کا سارا مہینہ گذر گیا لیکن مجھے محسوس نہ ہو سکا کہ میں نے بھی روزے رکھے ہیں لیکن جب

عید کا چاند دکھائی دیا اور بیچارے قیدیوں نے آہنی سلاخوں کے پیچھے سے چاند کا دھندلا سا عکس دیکھا تو فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھے۔ رات بھر قیدی ہنستے اور گاتے رہے، دن چڑھا۔ ہمارے احاطے کے سامنے والے کشادہ میدان میں قیدی جمع ہونے لگے۔ سارا میدان بھر گیا۔ ہمارے احاطے کا دروازہ نہ کھل سکا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی دروازہ کھلے گا، اور حضرت مولانا صاحب امامت کے لئے آگے بڑھیں گے! مولانا صاحب مفتی تھے۔ ہر سال عید کی امامت فرمایا کرتے تھے۔ بھلا اب کیونکر ممکن تھا کہ عید کی نماز پڑھی جائے اور مولانا صاحب نہ ہوں۔ لیکن یہ میری بھول تھی۔ میں یہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ یہ تو جیل ہے۔ مولانا صاحب کا مقام تو بہت اونچا ہے لیکن جیل والے تو انگریزوں کے غلام تھے۔ وہ کس طرح ایک باغی انقلابی دیش بھگت کو امامت کرنے کا فخر حاصل کرنے کی اجازت دیتے۔ عین نماز کے وقت ایک جیل افسر آیا اور کہا آپ دونوں بزرگ احاطہ کے اندر ہی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ باہر آنے کی آپ کو اجازت نہیں اور میں نے دیکھا کہ سامنے والے احاطے میں قیدی غصے سے بھڑک رہے تھے۔ انہوں نے نماز تو پڑھ لی لیکن دکھی دل سے .. دو عظیم شخصیتیں اُن کے سامنے ہوں اور وہ اُن سے مصافحہ نہ کر سکیں! دُور سے ہی علیک سلیک ہونے لگی۔ کچھ جذباتی قیدیوں نے اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اُدھر سرکاری مُلّا نے خطبہ پڑھا۔ خطبہ کیا تھا انگریزوں کا قصیدہ، زرخرید مُلا بیچارہ پڑھتا بھی کیا، تھوڑی ہی دیر میں ہمارے احاطے کے باہر بے شمار قیدی اکٹھے ہو گئے اور عید مبارک، عید مبارک کی آوازیں آنے لگیں۔ اتنے میں جیل کے سپاہی دندناتے آئے اور قیدیوں کو ہانک کر لے گئے اور اس طرح ہم نے عید منائی!

نہ جانے ایسی کتنی عیدیں میں نے جیلوں میں گذاریں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب جیل والوں کی طرف سے عید منانے کی اجازت نہ ہوتی تھی تو بیچارے قیدی کس طرح تہوار منایا کرتے تھے اور میں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں کہ جیل والوں کی اجازت سے تہوار منائے جاتے تھے، سرکاری مقرر کردہ تہواری خوراک میں یہاں کے پاسباں بری طرح لوٹ مچاتے تھے۔ ایک بار جیل میں بقرعید آئی۔ سرکار کی طرف سے 50 بکرے ملے، لیکن لطف کی بات یہ کہ بدنصیب قیدیوں کو ایک ایک بوٹی بھی ڈھنگ سے نہ مل سکی۔ معلوم ہوا کہ کل 35 بکرے حلال کئے گئے جن میں سے آدھے بکروں کا گوشت تو جیل افسروں کی بھینٹ ہو گیا، باقی قیدیوں کے لئے رہ گیا اور جب گوشت تیار ہوا تو برتنوں کے برتن بھر بھر کر جیل کے افسروں کے گھر جانے لگے، باقی قیدیوں

کے لئے کیا رہ گیا۔ ہمارا ملک اور کسی بات میں کتنا ہی پیچھے کیوں نہ رہے، بے ایمانی میں تو سب سے آگے ہی آگے رہتا ہے۔ اتنا ہی نہیں جو قیدی تہوار کے دن اپنے دوستوں، رشتے داروں، احباب سے مٹھائیاں وغیرہ منگواتے، اُن میں بھی جیل والوں کا حصہ ہوتا تھا۔ یہ سارا سامان جیل کے اندر عجیب وغریب ڈھنگ سے آتا۔ کبھی نہ کبھی تو قیدیوں کو اس بات کی اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنے گھر سے سامان منگوائیں۔ کبھی یوں ہوتا تھا کہ جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ قیدی چوری چھپے کھڑے ہو جاتے تھے اور باہر والوں سے آنکھ بچا کر یا رشوت دے کر سامان کی پوٹلیاں جیل کے احاطے میں پھینک دیا کرتے تھے۔

وہ قیدی خوش نصیب سمجھا جاتا تھا جو اپنا پورا سامان وصول کر لیتا تھا! سامان آنے کے کئی دوسرے طریقے بھی تھے مثلاً جیل کے بھنگی اپنی ڈولیوں میں سامان بھی لے آتے تھے۔ جیل کی گندی نالیوں کے راستے سے بھی سامان آتا جاتا تھا اور نہ جانے ایسے کتنے ہی غلیظ راستوں سے سامان قیدیوں تک پہنچتا تھا۔ بہر حال جیل کے تہوار بھی عجیب ہوتے تھے۔ روتا ہوا قیدی ہنستا تھا اور ہنستا ہوا قیدی اچانک ہی رو پڑتا تھا۔ جیل میں اُن مقدس تہواروں میں کبھی کبھار شعر وشاعری بھی ہوتی تھی۔ لگے ہاتھوں حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی ایک نظم ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ اس میں جیل کی عید کیا تاثر چھوڑتی ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی فرماتے ہیں:

کیوں سرِشام بچھی یہ صفِ ماتم کہ ابھی
تعزیت کرنے چلی آئی ہری پور کی عید

.......

ہوتا آیا ہے کہ جس گھر میں ہو مظلوم کی عید
جا مناتے ہیں وہاں سب اِسی دستور کی عید

.......

کاوشِ غم ہے تفِ نالہ ہے، یادِ وطن
ہم نے زنداں میں منائی اِسی دستور کی عید

.......

خاک و خوں میں نہ تڑپتے تو بتاتے کیسے؟
نوجواں ہند میں ہنگامہِ منصور کی عید

..............

اِس تمنا میں مروں اور جیوں لاکھوں بار
کاش ہو جائے کبھی ہند میں مزدور کی عید

..............

اور اِس طرح نہ جانے اسیرانِ فرنگ کتنی عیدیں جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں گذار چکے ہوں گے ایک عید پر ہی کیا موقوف.... میری زندگی میں نہ جانے کتنے 26 جنوری جیل میں آئے۔ہم اِس تہوار کو بھی بڑی شان وشوکت سے منایا کرتے تھے۔دوسری بات یہ ہے کہ ہر 26 جنوری نت نئی مصیبتوں کا روپ دھار لیتی تھی۔آزادی کا حلف نامہ دہرانے کی سزا بیڑی اور تنگ وتاریک کوٹھری اور مار پیٹ ہوتی تھی لیکن مجاہدینِ حریت پھر بھی ہر برس اِس مقدس دن کو تزک واحتشام سے مناتے تھے......

نہ جائیں گے یہ خونِ ناحق کے داغ
اگر آبِ کوثر سے دھو لیجیے!

☆☆☆☆☆

# پبلک ٹرینکولٹی ایکٹ

جیل کی نظر بندی کا تو کچھ مطلب نکلتا ہے لیکن محلے کی نظر بندی ایک عجیب سی بات ہے۔ جیل کی نظر بندی میں، نظر بندی کا سارا بوجھ جیل والوں پر ہوتا ہے اور محلے کی نظر بندی بیچارے نظر بند کا دیوالیہ نکال دیتی ہے۔ آزادی کی تحریک میں صوبہ سرحد کی حکومت نے ایک قانون بنایا تھا، جس کا نام تھا "پبلک ٹرینکولٹی ایکٹ"۔ اس ایکٹ کے تحت حکومت جسے چاہے نظر بند کر سکتی تھی۔ اس ہتھیار کا پہلا وار صوبہ سرحد کے سوشلسٹوں پر ہوا اور خاص طور پر پشاور کے انقلابی نوجوان اس کی لپیٹ میں آئے۔

1931ء میں جب مجھے جیل سے رہائی ملی تو اس ایکٹ کے تحت محلے میں نظر بند کر دیا گیا۔ میرا محلہ ایک تنگ سا محلہ تھا جس کے باہر بڑا سا دروازہ تھا۔ گویا یہ محلہ یک چھوٹا جیل تھا اور دروازہ جیل کا آہنی پھاٹک۔ پھاٹک کے باہر دو سپاہی ہر وقت کھڑے رہتے تھے تاکہ میں کہیں باہر نہ نکل آؤں۔ دن بھر محلے میں رہنا، ایک قیامت ہی تھی۔ کام نہ کاج، عام طور پر گھر میں ہی پڑا رہتا تھا اور گھریلو ماحول سے تنگ آجاتا تو محلہ کے چکر کاٹتا۔ اُن دنوں مجھے زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا۔ میں اکثر شام کے وقت محلے کے دروازے پر آکر کھڑا ہو جاتا اور حسرت بھری نظروں سے بازار کی جانب دیکھتا جہاں ہر وقت چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔ بازار کا نام تھا کریم پورہ... یہی وہ علاقہ ہے جہاں انقلاب نے پرورش پائی ہے اور سب سے زیادہ انقلابی یہیں رہتے تھے۔ اس علاقے کو یہ شرف حاصل ہے کہ بڑے بڑے جانباز اس سے وابستہ رہے۔ صرف یہیں پر ایک درجن کے لگ بھگ انقلابی نظر بند تھے۔ نظر بندوں میں ایک عورت بھی تھی۔ شریمتی لکھو دیوی... بڑے دل گردے والی عورت۔ ہم لوگ اُسے "بے" یعنی "ماں" کہہ کر پکارتے تھے اور واقعی وہ انقلابی دور میں ایک انقلابی ماں کا درجہ ہی رکھتی تھی۔ اگر یوں کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس بہادر ماں کی وجہ سے

پنجاب اور سرحد کے انقلابیوں میں تال میل ہوا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں سرچشمہ انقلاب "مولانا عبدالرحیم پوپلزئی" کا مسکن تھا۔ وہ مسکن جہاں بغاوت کی کئی کڑیاں مل کر ایک مضبوط زنجیر بنیں۔

مولانا کا گھر انقلاب کا گہوارہ بھی تھا اور باغیوں کا اڈہ بھی۔ کریم پورہ بازار کی چہل پہل دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا کہ دروازے سے باہر نکل جاؤں لیکن جونہی پولیس کی طرف دھیان اُٹھتا تھا تو دل کی تمنائیں دم توڑ کر رہ جاتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ محلے سے باہر نکلنا جیل کو دعوت دینا ہے اور جیل جانا اُن دنوں میرے سیاسی مفاد کے پیش نظر موزوں نہ تھا۔

محلے میں نظر بند ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ہمارے ساتھی خفیہ طور پر نظر بندوں سے تال میل رکھتے تھے۔ پھر بھی دن رات محلے میں قید رہنا مجھے کسی طرح پسند نہ تھا۔

لہٰذا میں نے ہر روز رات کو چھپ چھپا کر محلے سے نکل جانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ اسی طرح میرے دوسرے نظر بند ساتھی راز دارانہ طریقوں سے آپس میں ملتے تھے۔ انہی دنوں میرے ایک ساتھی کپور اور موہن لال اوبرائے نے محلہ گنج میں بھوک ہڑتال شروع کر دی جہاں وہ نظر بند تھے۔

اُدھر ایک دن ہمیں معلوم ہوا کہ آج شام کو چار بجے ہماری نظر بندی کا حکم ختم ہو رہا ہے۔ یہ حکم ہر چھ ماہ کے بعد ہمیں ملتا تھا۔ غالباً اب کی بات نیا نوٹس دینے میں سرکار نے لاپرواہی کی۔ لہٰذا میں اُسی رات کو پشاور سے خفیہ طور پر راولپنڈی چلا گیا اور اپنی بہن کے گھر جا پہنچا۔ اُدھر جب پولیس کو پتہ چلا کہ میں اُڑنچھو ہو گیا ہوں تو میرے گھر والوں پر قیامت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پوچھ تاچھ کی گئی۔ دوسرے ہی دن پشاور سی آئی ڈی کا ایک انسپکٹر میری تلاش میں آیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب میں تین دن کے بعد ایک شام کو راولپنڈی ریلوے اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو انسپکٹر صاحب نیچے اُتر رہے تھے۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ گرفتار ہوا، راولپنڈی جیل میں لایا گیا اور وہاں سے واپس پشاور کے پولیس تھانے میں۔

پھر وہی محلے کی نظر بندی، وہی قید اور وہی پریشانیاں۔

میری نظر بندی کے عالم میں کلونت کماری نام کی ایک لڑکی نے میری مصیبتوں میں بڑا ہاتھ بٹایا۔ وہ بیچاری میرے کئی پیغام محلے کے باہر لے جایا کرتی تھی مگر افسوس کہ ایک دن گھریلو

جھگڑوں سے تنگ آ کر اس نے خودکشی کر لی۔ میرے دل میں آج بھی اُس معصوم لڑکی کے لیے پیار ہے۔ اُنہی دنوں لوہڑی کا تہوار آ گیا، میں پولیس کی نظروں سے بچ کر رات کو گیارہ بجے محلے سے نکل گیا اور دوسرے محلے (اندر شہر) میں جا پہنچا۔ جہاں لوہڑی چل رہی تھی۔ پولیس بھی کھڑی تھی لیکن اُس وقت مجھے پہچاننا کچھ آسان نہ تھا۔

میری بدقسمتی سے ایک بدمعاش نے کسی لڑکی پر خنجر سے وار کرنا چاہا۔ میں نے مدافعت کی۔ وہ بدبخت میرے جسم پر ہی وار کرنے لگا۔ میں وہاں سے اندھا دھند بھاگا۔ وہ خنجر لہراتا ہوا میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اچانک کسی چیز سے ٹکرا کر میں گر پڑا اور بدمعاش جوش وخروش سے دوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ ہانپتا کانپتا جب میں محلے میں داخل ہوا اور اپنے مکان پر آ گیا تو میرے چچا جان نے اچھی خاصی مرمت کی کیونکہ اُس دوران دو بار پولیس مکان پر آ چکی تھی۔ یہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کلونت نے کہا کہ آپ محلے سے باہر نہ جایا کریں۔ آپ کی غیر حاضری سارے محلے پر مصیبت لے آتی ہے اور اس طرح محلے کے لوگ آپ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے محلے سے باہر قدم نہیں رکھا، البتہ شام کو پولیس چوکی جاتے وقت محلے کی سیر کر لیا کرتا تھا۔ یہ نظر بندی 34ء تک رہی۔ اِس طویل مدت نے مجھے پکا انقلابی بنا دیا۔ میرے دل و دماغ کے پردوں پر بغاوت کے ہتھوڑے پڑنے لگے۔ نظر بندوں کی بات کرتے ہوئے مجھے عبدالروف قربان کا نام کبھی نہیں بھول سکتا۔ قربان سرحد کا رہنے والا ایک ایسا مجاہد تھا جس کی موت پر خان عبدالغفار خان بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ خدائی خدمت گار ہوتے ہوئے بھی انقلابیوں کا گہرا دوست تھا۔ خفیہ سرگرمیوں میں اُسے گہری دلچسپی تھی۔ اسی لئے حکومت نے اُسے بھی اپنے گاؤں میں نظر بند کر دیا اور وہ بیچارہ نظر بندی کے دوران ہی چل بسا۔ انگریزی دور میں یوں تو کئی نوعیت کی بندشیں تھیں، مثلاً زبان بند، قلم بند، شہر بند، جیل بند، مگر ان سب میں پریشان کن تھی نظر بندی اور وہ بھی محلے کی نظر بندی۔ اسی نظر بندی نے مجھے حکومت کا شدید ترین مخالف بنا دیا۔ اس نظر بندی سے میری کئی یادیں وابستہ ہیں۔ آج بھی جب کبھی پرانی یادیں متحرک فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی ہیں تو دل بیٹھ سا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

# انگریزی راج میں خفیہ پوسٹروں کی بھرمار

''لال ڈھنڈورا'' کی تاریخ اگرچہ مختصر ہے، لیکن انگریزی دور میں یہ کافی پُراثر رہی ہے۔
''لال ڈھنڈورا'' نہ تو کوئی ڈھولک تھی اور نہ ہی نقارہ، بلکہ ایک قسم کا پوسٹر ہوتا تھا جو بھڑتو پریس میں چھپا تھا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجیے کہ بھڑتو پریس کیا ہے۔ یہ پریس مٹی کا ہوتا تھا۔ کھریا مٹی اور گلیسرین کو سخت آٹا کی طرح گوندھ کر اُسے لکڑی کے چوکھٹے میں دبا دیا جاتا۔ بعدازاں مٹی کو سلیٹ کی طرح ہموار کر دیا جاتا اور نیلی روشنائی سے کاغذ پر لکھ کر کاغذ کی سطح کو سیٹ پر جما دیا جاتا تھا، اوپر سے دو چار بار رول گھمایا جاتا تھا۔ جب حروف مٹی کی سلیٹ پر جم جاتے تھے تو کاغذ اُتار لیا جاتا تھا، اور پھر ایک ایک کاغذ کو مٹی پر لگا کر رول سے گھمایا جاتا تھا، لیجیے پوسٹر چھپ گیا، انگریزی دور میں عام طور پر یہی طریقہ تھا خفیہ لٹریچر کی اشاعت کا۔۔۔

کہیں کہیں سائیکلو اسٹائل بھی پوشیدہ طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ''لال ڈھنڈورا'' کا اشاعتی مرکز ''لاہور'' تھا۔ پنجاب کے انقلابی اسے شائع کر کے عوام میں تقسیم کرتے تھے۔ تقسیم کا طریقہ بھی عجیب وغریب تھا، گویا اُن دنوں پوسٹر شائع کرنا، پریس بنانا اور تقسیم کرنا سنگین جرم کا مرتکب ہوتا تھا۔ اس کی سزا چھ ماہ سے لے کر دس سال قید تک ہوسکتی تھی۔ ''لال ڈھنڈورا'' تحریک واقعی قابل ذکر اور انقلابی جذبات کو اُجاگر کرنے والی تھی۔

جن دنوں پنجاب میں یہ تحریک چل رہی تھی تو سارا پنجاب انقلابی جذبات کی دنیا میں کچھ اس طرح کھو گیا تھا کہ پولیس والے آگ بگولا ہو گئے۔ سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سی آئی ڈی والوں نے جاں فشانی سے مجرموں کا پتہ لگانا چاہا، قدم قدم پر خفیہ پولیس کے سپاہی دکھائی دینے لگے۔ مختلف رنگوں میں سپاہی کھدر پوش، سادھو کا لباس، فقیروں کا لباس، پنڈت، ملا اور گرنتھی کا لباس ...القصہ مختلف رنگ اور مختلف صورتوں میں سی۔آئی۔ڈی والے پنجاب کے گوشہ

گوشہ میں پھیل گئے۔ ''بریڈ لاہال'' جو کسی وقت انقلابیوں کا مرکز تھا، چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ ''بریڈ لا ہال'' کے سامنے پولیس چوکی بنادی گئی۔ لیکن نتیجہ ''ڈھاک کے تین پات'' پولیس ناکام رہی اور بڑھتے بڑھتے یہ تحریک فرنٹیئر تک جا پہنچی۔ فرنٹیئر سے آزاد قبائل اور وہاں سے افغانستان کی وادیوں تک پہنچ گئی۔ جب یہ تحریک اٹک کے اُس پار باقاعدگی سے چلنے لگی تو پنجاب پولیس نے کہنا شروع کر دیا، یہ تحریک فرنٹیئر سے ہی شروع ہوئی ہے۔ اگر پنجاب سے شروع ہوتی تو ہم انقلابیوں کا حلیہ بگاڑ دیتے۔ اُدھر فرنٹیئر کی پولیس کہتی، یہ کام ہمارے صوبے میں نہیں ہوتا، ورنہ انقلابیوں کی کیا مجال کہ وہ یوں دندناتے پھرتے۔ غرض کہ دونوں صوبوں کی پولیس ایک دوسرے پر الزام تھوپتی تھی۔ ایک دوسرے کو ناکارہ اور نااہل بتاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں واقعی بودم تھے۔ انگریزی عہد کی سی۔ آئی۔ ڈی نے آج تک کوئی کارنامہ نہیں دکھایا۔ صحیح معنوں میں وہ کوئی سازش پکڑنے کی جرات نہیں کر سکی۔ اگر کسی مقدمے میں اُسے کامیابی ہوئی ہے تو محض سلطانی گواہوں کی بدولت یا جھوٹ بول کر۔ دوسرے ملکوں کی پولیس وقت سے پہلے سازش کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ یہاں کی پولیس وقت کے بعد بھی اُونگھتی رہتی ہے اور جب کبھی سازش کو پکڑتی ہے تو اِس میں حقیقت نہیں ہوتی۔ ''لال ڈھونڈرا'' تحریک جن دنوں عروج پر تھی تو پولیس بہت زیادہ تگ ودو میں مصروف تھی۔ آخری بعض غلط شبہات کی بناء پر پنجاب کے چند ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ حسب عادت پنجاب کا ایک نوجوان سلطانی گواہ بن گیا۔ پولیس نے اُسے اپنے مطلب کے لئے استعمال کیا۔ اُلٹے سیدھے افسانے گھڑے گئے، من گھڑت کہانیاں منظر عام پر آنے لگیں۔ کچھ نوجوان سزا پا گئے۔ پولیس نے اپنی دانست میں بہت بڑے قلعہ پر قبضہ جما لیا۔ اُدھر فرنٹیئر کی پولیس نے پنجاب کی پولیس پر طنز کیا کہ ''دیکھا یہ دیا'' پنجاب میں ہی تھی لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ مرض ''اٹک'' کے اُس پار پٹھانوں کے دیش میں بھی آگئی ہے۔ بات صاف ہے کہ لٹریچر کے سلسلے میں فرنٹیئر کے ساتھی ہمیشہ سے پیچھے رہے ہیں۔ انہیں بندوق، پستول اور خنجر کی تو بات آتی ہے لیکن قلم کی نہیں۔

چند محدود ساتھی تلوار کے ساتھ قلم سے بھی کام لیتے تھے۔ پنجاب میں اِس تحریک کے دب جانے سے فرنٹیئر میں اِس تحریک نے جنم لیا۔ پشاور سے ہم چند ساتھیوں نے اِس کانٹوں بھرے تاج کو پہننا شروع کیا لیکن نام بدل دیا گیا۔ ''لال ڈھنڈورا کی بجائے ''لال جھنڈا''

نام تجویز پایا۔ جب پہلا پوسٹر شائع کیا گیا تو اُس کے منظر عام پر آتے ہی پولیس کے حلقوں میں افراتفری مچ گئی۔ اتوار کی ایک صبح کو چوک یادگار کے سائن بورڈ پر جو پوسٹر دیکھا گیا، اُس کا مضمون یہ تھا:

''لال جھنڈا صوبہ سرحد کے لوگوں کا ترجمان ہے، سرحد کے لوگ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کو جلد از جلد ہندوستان سے نکال دیا جاوے، آزادی لینے کا طریقہ صرف عدم تشدد ہی نہیں ہوسکتا، بلکہ تشدد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ جس سرکار نے بے گناہ نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ گولیوں کا شکار بنا دیا، اُس کے آگے ہاتھ جوڑنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ سرحد کے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ تمام کاج کاج چھوڑ کر حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچم اُٹھالیں، خفیہ پوسٹر شائع کریں، بم بنائیں، ڈاکے ماریں، مفروروں کو پناہ دیں، باغی اڈے قائم کریں، خفیہ پریس تیار کریں۔ یہ پریس کھریا مٹی اور گلیسرین سے بنایا جاسکتا ہے۔ انقلابیوں کو چاہیے کہ وہ خفیہ پوسٹر سرکار کے ہر بڑے ادارے میں پہنچائیں۔''

انقلاب زندہ باد

لال جھنڈا کی پہلی اشاعت نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اُسی صبح میں نے دیکھا کہ سینکڑوں آدمی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس پوسٹر کو پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں خفیہ پولیس کا ایک رکن میر زمان خان مجمع کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور اُس نے پوسٹر کو اُتار لیا۔ پوسٹر پھٹ چکا تھا لیکن اُس کا ایک ایک پرزہ بڑی احتیاط کے ساتھ میر زمان نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور فاتحانہ انداز سے اپنے مرکز کی طرف جانے لگا۔ میر زمان کو دیکھتے ہی میں رفو چکر ہوگیا۔ جب اپنے پارٹی دفتر ''شیر بازاں'' پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پولیس نے دفتر کو گھیرا ڈال رکھا ہے۔ جوں ہی میں نے دفتر کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو شاہ جی نام کے ایک تھانے دار نے میرے ساتھ بدکلامی کی، چونکہ اُس وقت پبلک بہت زیادہ کھڑی تھی اس لئے میں نے جوش میں آکر تھانے دار صاحب کے گال پر پانچوں

انگلیاں جما دیں۔ بدلے میں کئی ہاتھ میرے بدن پر پڑے۔ شور سن کر اوپر سے دوارکا ناتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس چلائے۔ نگینہ صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ اوپر آجائیں۔ آپ ہی کا انتظار ہے۔ بات دراصل یوں ہے کہ اُس دن پولیس دفتر کی تلاشی لینا چاہتی تھی۔ چونکہ میں پارٹی کا سیکرٹری تھا اس لئے میری موجودگی ضروری تھی۔ ڈپٹی صاحب نے میرے سامنے شاہ جی کو بُرا بھلا کہا جس سے وہ بیچارے کھسیانے سے ہو گئے، تلاشی ہوئی، پولیس ناکام لوٹ گئی۔ اُسی دن میں نے پشاور کے ایک کورٹ میں شاہ جی کے خلاف مار پیٹ اور بدتمیزی کی درخواست دی۔ دوسرے ہی دن شاہ جی حضرت مولانا عبدالرحیم کے مکان پر آئے اور کہا مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ میرے خلاف درخواست واپس لے لی جائے، لہٰذا میں نے درخواست واپس لے لی۔

لال جھنڈا کی چند ضروری کاپیاں اسلامیہ کالج پشاور میں پہنچانی تھیں لیکن یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ پولیس سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ کئی طریقے آزمائے گئے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اس کام کے لئے ایک پندرہ سالہ لڑکے کو تیار کیا گیا۔ اعجاز اُس کا نام تھا اور ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلامیہ کالج کی طرف چار لڑکے سائیکلوں پر جا رہے تھے کہ چھاؤنی برج کے نزدیک پولیس نے انہیں روک لیا۔ ہر ایک کی جامہ تلاشی ہوئی، کپڑوں کے نیچے ننگے جسم کو بھی ٹٹولا گیا۔ لیکن پوسٹر کہاں، مجبوراً لڑکوں کو چھوڑنا پڑا۔ اُن میں اعجاز بھی تھا۔ وہ دوپہر تک نہیں لوٹا۔ مجھے بےحد پریشانی ہوئی۔ اعجاز بچہ ہے اور نازک البیلا، اگر پولیس کے ہاتھ آ گیا تو ستیاناس ہو جائے گا۔ کیا سازش کا بھانڈا چوراہے میں ہی پھوٹ جائے گا۔ میں نے شدید غلطی کی جو اس بچے کو یہ کام سونپا۔ میں ابھی انہی خیالات میں غرق تھا کہ اچانک سائیکل کی گھنٹی بجی۔ مکان کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اعجاز نظر آیا۔ وہ جھٹ سے اندر آیا اور کہنے لگا، آج بال بال بچ گیا ورنہ بیڑہ غرق تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے کہا۔ پوسٹر دے آیا ہوں۔ یہ پوسٹر میں نے سائیکل کے ٹائر میں چھپا رکھے تھے۔ پولیس والوں نے سائیکل کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے فرطِ محبت سے اعجاز کا منہ چوم لیا۔

جمعہ کی نماز ہو چکی تھی۔ امام صاحب خطبہ فرما رہے تھے۔ پشاور کی مسجد مہابت خاں کے باہر ہزاروں نمازی محوِ خطبہ تھے۔ یہ عید قربان کی دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک مجمع کے درمیان کہیں سے لال جھنڈا کی لاتعداد کاپیاں بکھرنے لگیں۔ خطبہ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ منتشر ہو رہے تھے۔ پوسٹروں

پر چھپنا چھپٹی ہو رہی تھی۔ چند پوسٹر پولیس کے ہاتھ بھی آئے اور ایک بیچارہ مزدور بھی پولیس کے شکنجے میں آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں پوسٹر تھے۔ وہی پوسٹر پھینک رہا تھا۔ پولیس والوں کی پوچھ تاچھ سے اُس نے صاف کہہ دیا کہ یہ کاغذ مجھے کسی آدمی نے بانٹنے کے لئے دیئے ہیں۔ اس کی اجرت صرف دو آنے لی ہے۔ لیکن بیچارے کی صاف گوئی پر کون یقین کرتا۔ اُسے کوتوالی لے جایا گیا۔ زدو کوب کیا گیا۔ حوالات میں اذیتیں پہنچائیں گئیں۔ بات عدالت تک جا پہنچی۔ پولیس کا کیس کمزور رہا۔ مزدور رہا کر دیا گیا لیکن پورے تین ماہ کے بعد مزدوری صرف دو آنے لیکن انقلاب میں ایسے کئی بے گناہ بھی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں کا شکار بنے ہیں۔

1938ء کی ایک صبح تھی، ہمارے ساتھی کا مقدمہ عدالت میں پیش تھا جب وکیل صفائی مسٹر عبدالقیوم بیرسٹر (قیامِ پاکستان کے بعد وزیرِاعظم صوبہ سرحد) بحث میں گرما گرم حصہ لے رہے تھے تو اچانک اُس وقت مجسٹریٹ کرسی سے اُچھل پڑے لال رنگ کا پوسٹر پکڑے ہوئے پولیس انسپکٹر سے کہنے لگے۔ یہ ہے تمہاری پولیس کا کارنامہ۔ خفیہ پوسٹر میری میز تک بھی آ پہنچا۔ یہ پوسٹر لال جھنڈا تھا جس کے سلسلے میں عدالت میں ایک ساتھی پر مقدمہ چل رہا تھا اور پولیس ثابت کر رہی تھی کہ مبینہ پوسٹروں کی اشاعت کا واحد ذمہ دار یہ شخص ہے۔ اس پوسٹر نے ثابت کر دیا کہ نوجوان کی گرفتاری کے باوجود بھی اب تک کوئی گروہ کام کر رہا ہے اور جونہی عدالت ''لنچ'' کے لئے بند ہوئی تو دیکھنے میں آیا کہ عدالت کے ہر کمرے میں ایک ایک پوسٹر پڑا ہوا ہے۔ یہ پوسٹر ایک بھنگی کی مہربانی سے عدالت کے کمروں تک پہنچے تھے۔ بھنگی انقلابیوں سے تال میل رکھتا تھا۔ اُس نے صبح عدالت کے ہر کمرے میں پوسٹر رکھ دیا اور یہاں تک ہی نہیں، اُسی دن یہ پوسٹر سرکار کے ہر بڑے ادارے میں دکھائی دیئے۔

پولیس نے اُس دن بے شمار تلاشیاں لیں، کئی خفیہ مقامات پر چھاپے مارے لیکن ہر قدم پر ناکامی نے پولیس کے قدم لڑکھڑا دیئے۔ سرحد کی سیاسی تاریخ میں یہ دن خفیہ پوسٹروں کا دن کہا جاتا ہے۔ دوسرے ہی دن پولیس نے میرے مکان پر بھی چھاپہ مارا۔ بدقسمتی سے یہی پوسٹر میرے مکان سے برآمد ہو گیا۔ اُس وقت صرف میرے والد صاحب گھر پر موجود تھے۔ میرے آنے پر پولیس نے کہا یہ پوسٹر تمہارا ہے۔ میں نے انکار کر دیا تو پولیس نے مجھے اور والد صاحب کو گرفتار کر لیا۔ جب پولیس والے ہم دونوں کو شہر کی کوتوالی میں لے جا رہے تھے تو والد صاحب نے پولیس

نیکہ جوگندر سنگھ سے کہا مہربانی کر کے آپ مجھے تانگہ میں بٹھا کر لے چلیں۔ لوگ ہتھکڑی میں دیکھ کر انگلیاں اُٹھائیں گے اور شہر میں میری ناک کٹ جائے گی۔ اُس وقت والد صاحب میری طرف غصہ سے دیکھ رہے تھے۔ جاتے جاتے انہوں نے کہا بڑھاپے میں میری مٹی خراب کی تو نے بیچارے کیا جانیں اس بے عزتی میں کتنی عزت ہے۔ یہ ہتھکڑیاں آزادی کے گہنے ہیں۔ جب ہم دونوں باپ بیٹے کوتوالی میں لائے گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری پارٹی کے نوجوان عبدالغفور آتش، عبدالرحمٰن ریا، فقیر چند سرحدی، بہاری لال، موہن لال چاء والا، فدا محمد اور ملک داد خان پولیس کے گھیرے میں ایک بڑی سی میز پر تشریف فرما ہیں۔ ہم دونوں کو بھی وہاں بٹھایا گیا۔ پولیس کے ایک ذمہ دار افسر نے مجھ سے کہا ''یہ پوسٹر تمہارے گھر سے نکلا ہے۔ میں نے انکار کر دیا تو والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ حالت سے متاثر ہو کر میں نے کہا ہاں یہ پوسٹر میرے گھر سے برآمد ہوا ہے۔

''کہاں سے آیا؟''

''سڑک پر گرا ہوا ملا ہے...... ''

''گھر میں اسے رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟''

''پڑھنے کے لئے ''

''تمہارا ان پوسٹروں سے کیا تعلق ہے؟''

''یہ مجھے سڑک پر سے ملا ہے، میرا کوئی تعلق نہیں۔'' ذرا کرخت آواز میں، میں نے کہا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو تمہارے والد کو بھی دس سال تک قید میں رہنا پڑے گا۔''

والد صاحب میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے جھٹ سے کہہ دیا، یہ پوسٹر میرا ہے، میں نے اُسے شائع کیا ہے۔ میں نے اسے بانٹا ہے۔ یہ میرا ہی کام ہے۔ والد صاحب بے گناہ ہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے۔

پولیس آفیسر کے چہرے پر نئی رونق دکھائی دینے لگی۔ انہوں نے وقت سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور کہا، ذرا اُن آدمیوں کے نام بتاؤ جو اس کام میں تمہارے ساتھ شریک تھے۔ اس فقرے پر دوسرے ساتھیوں کی نظریں میرے چہرے پر جمتی دکھائی دیں۔ میں فوراً بھانپ گیا۔ پولیس میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ میں نے اُداس لہجے میں کہا۔'' میں نے جو کچھ کہا، بالکل

بکواس ہے۔ محض والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا ہے ورنہ مجھے معلوم نہیں۔ پولیس افسر نے میرے والد صاحب کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگوا دی۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو رقص کرنے لگے۔ زبان تھرتھرائی میری زندگی برباد کردی تو نے ۔ اور میں نے دیکھا کہ پولیس انہیں ہتھکڑی، ضد اور شرارت میں لگا کر حوالات لے گئی۔ اِدھر پولیس افسر نے پوسٹر کا مضمون ہم لوگوں سے لکھوایا۔ پولیس والے اس پوسٹر کی تحریر دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن بے وقوف اتنا نہیں جانتے تھے کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں، اُن کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں۔ عام طور پر پوسٹر کو میں ہی اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے مختلف انداز میں لکھنے کی مہارت ہوگئی تھی۔ یہ پوسٹر بھی میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن شناخت کرنے والے اسے شناخت نہ کر سکے۔ صرف مجھ پر اور والد صاحب پر مقدمہ چلا، والد صاحب ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ چند ماہ کے بعد مجھے سزا ہوئی، باغیانہ پوسٹر کی برآمدگی کی سزا۔ ایک سال۔ پوسٹر کی اشاعت ایک سال۔ پولیس نے ثابت کر دیا کہ یہ پوسٹر میرا ہے اور اس کی اشاعت و تقسیم میں ایک گروہ بھی کام کرتا ہے لیکن سزا ہوئی تو محض مجھے ہی ۔ اس وقت کے انگریز مجسٹریٹ ''مسٹر کاکسی'' نے مجھ سے کہا کہ آپ اس فیصلہ کے خلاف اپیل کر سکتے ہیں۔ پولیس کی کہانی کمزور تھی۔ مجھے سزا محض مجبوری کی وجہ سے دی گئی۔ اِس مقدمہ میں جن لوگوں نے اس کیس کی پیروی کی، اُن میں سردار عبدالرب نشتر اور عبدالقیوم بیرسٹر پیش پیش تھے۔ اپیل کے بعد مجھے باعزت رہا کر دیا گیا۔ جس دن میں رہا ہوا تو والد صاحب بسترِ مرگ پر زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔

خفیہ پوسٹروں کے سلسلے میں ایک بار پشاور کی پولیس نے چند کمسن لڑکوں کو گرفتار کر لیا، اس لئے کہ شاید اُن سے کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔ گرفتار ہونے والوں میں گلزاری لال، پرکاش چند اور ایک مسلم لڑکا جو پارٹی دفتر کے نیچے کتابوں کی دوکان کرتا تھا، قابل ذکر ہے، اُن میں سے ایک لڑکے پہ الزام تھا کہ انھوں نے رسال پور چھاؤنی سے سائنسی مشین چرانے کی کوشش کی ہے۔ اُنہی دنوں کچھ خفیہ کاغذات جو ملٹری سے متعلق تھے، بھی ہم تک پہنچ گئے۔ جب ان کاغذات کے ضروری انکشافات ''لال جھنڈا'' میں شائع ہوئے تو ملٹری کے آفیسر تلملا اُٹھے۔ پولیس نے جن لڑکوں کو گرفتار کیا تھا، اُن میں سے ایک بھی پولیس کا آلہ کار نہ بن سکا۔ کوئی شیطانی گواہ بننے کے لئے تیار نہ ہو۔ سختی اور نرمی دونوں طریقے ان لڑکوں کو پھسلا نہ سکے۔ آخر انہیں چھوڑ دیا گیا۔

ایک دن یہ فیصلہ ہوا کہ لال جھنڈا گورنر کی کوٹھی پر لگا دیا جائے۔ یہ کام بظاہر مشکل تھا کیونکہ گورنر کی کوٹھی پر پولیس، فوج اور سی۔ آئی۔ ڈی والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک میٹنگ ہوئی اور اس کام کے لئے ایک آدمی کا نام تجویز ہوا۔ لہٰذا مقررہ وقت پر خفیہ پولیس کی موجودگی میں بڑے گیٹ پر ایک پوسٹر چسپاں کر دیا گیا۔ لطف کی بات یہ کہ اِدھر پوسٹر لگا، اُدھر اتفاقاً انسپکٹر جنرل آدھمکا۔ جونہی وہ گیٹ کے اندر جانے لگا، اُس کی نظر پوسٹر پر پڑی۔ اُدھر پولیس کا جھرمٹ بھی پوسٹر پر جھپٹا۔ پوسٹر اُتار لیا گیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس کی پیشانی پر خوفناک لکیریں اُبھرنے لگیں۔ جب سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے واقع کی کھوج کی تو معلوم ہوا کہ پوسٹر لگنے سے قبل ایک عورت سیاہ برقعہ اُوڑھے لڑکھڑاتی ہوئی گیٹ کے قریب آئی اور کہا کہ مجھے چکر آرہا ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے ذرا دیوار کے ساتھ سہارا لے کر بیٹھنے دو۔ سپاہی نے ترس کھا کر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ جب وہ عورت چلی گئی تو پوسٹر دیوار پر چسپاں پایا گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب یہ عورت دیوار سے لگ کر بیٹھی تو اُس نے موقع پا کر پوسٹر دیوار پر لگا دیا اور رفو چکر ہوگئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ برقعہ میں لپٹی ہوئی عورت دراصل ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ اس واقعہ نے پولیس والوں کو نہ صرف شرمندہ ہی نہیں کیا بلکہ نااہل بھی قرار دیا۔

خفیہ پوسٹروں کی تحریک جب زوروں پر تھی تو اُنہی دنوں پنجاب سے بالشویک نامی ایک پمفلٹ نکلنا شروع ہوا۔ یہ پمفلٹ راولپنڈی سے نکلتا تھا اور اس میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لینے والے پروفیسر تلک راج چڈھا تھے، جو اُن دنوں راولپنڈی کے ایک کالج کے پروفیسر تھے اور اِن تھک سوشلسٹ لیڈر...... ''بالشویک'' صوبہ سرحد میں بھی آتا تھا۔ اُسے لانے میں اگرچہ بہت دقتیں پیش آئی تھیں، تاہم یہ کام بھی سرگرمی سے ہونے لگا تھا۔ ایک بار ''بالشویک'' کی کاپیاں لینے مجھے خود راولپنڈی جانا پڑا۔ مجھے سمجھایا گیا تھا کہ جب میں راولپنڈی پہنچوں تو بنسی لال پان فروش کے پاس جا کر اُس سے ہاتھ ملاؤں اور ہاتھ کی درمیانی انگلی کو زور سے دابوں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''بالشویک'' اسے دے دیئے جائیں۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ ''بنسی لال'' نے مجھے ایک آدمی کے پاس بھجوا دیا جس کا نام امیر چند کوہلی تھا اور سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ میں اُس کے پاس آیا تو اُس نے رات کی تاریکی میں مجھے کہیں سے بالشویک کی 100 کاپیاں دلوا دیں۔ میں یہ بوجھ ایک مزدور کے ذریعہ اپنے گھر لے آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اُسے پشاور کیونکر پہنچایا

جائے۔ پشاور اسٹیشن پر تو ہر وقت سی۔آئی۔ڈی کا جال بچھا رہتا تھا۔ اُنہی دنوں میری ایک قریبی جان پہچان کی لڑکی شیاما چند دن کے لئے راولپنڈی آئی ہوئی تھی، صبح ہی میں اُس کے گھر گیا اور اُسے واپس پشاور جانے کے لئے کہا۔ وہ پہلے ہی سے جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ میرے کہنے کی دیر تھی، اُسی وقت میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے پوسٹروں کا بنڈل اُٹھایا اور ہم دونوں بس کے ذریعہ پشاور کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ پوسٹر میں نے بس کے اوپر رکھ دیئے اور جب پشاور کے اڈہ پر پہنچا تو سی۔آئی۔ڈی والوں کی گشت دکھائی دی۔ شاہدہ کو میں نے پہلے ہی ایسی تربیت دے رکھی تھی کہ جب ضرورت پڑے، خفیہ کام سرانجام دے۔ لہٰذا اُس نے میرا اشارہ پا کر بنڈل ایک مزدور کے حوالے کر دیا اور بے کھٹکے سیدھی اپنے گھر چلی آئی۔ جونہی میں گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سی۔آئی۔ڈی والوں نے شیاما کا گھر گھیر رکھا ہے۔ میرے آتے ہی پولیس شیر کی مانند مجھ پر جھپٹی۔ شیاما کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیونکہ وہ پوسٹر ابھی ابھی شیاما لائی تھی۔ لیکن خدا کا شکر کہ ایک گھنٹہ کی تلاشی کے باوجود پوسٹر نہ ملا۔ سی۔آئی۔ڈی پھیکا منہ لے کر چلی گئی۔ شیاما بے اختیار ہنسنے لگی اور کہا بدھو کہیں کے...... پوسٹر لینے آئے تھے...... میں نے پوچھا پوسٹر کہاں ہیں۔ اُس نے اپنے گھر کے ایک بند کنوئیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اِس میں پھینک دیئے تھے۔ چونکہ پولیس میرا پیچھا کر رہی تھی۔ پوسٹر پانی میں نہائے ہوئے تھے۔ انہیں رات بھر خشک کیا گیا اور دوسرے ہی دن ٹھکانے پر لگا دیا گیا۔

ایک بار اِس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ "بالشویک" کی کچھ کاپیاں افغانستان بھجوائی جائیں لیکن کیسے؟ یہ کام بظاہر بہت مشکل تھا کیونکہ افغانستان دوسرا ملک تھا۔ بہر حال کاپیاں بھجوا دی گئیں۔ صورت یہ ہوئی کہ پچاس کے قریب کاپیاں باٹا شو کمپنی پشاور کے سول ایجنٹ کو دے دی گئیں۔ اُس نے اُنہیں بوٹوں کی "پیٹیوں" میں اِس ترتیب سے رکھا جیسے یہ معلوم ہو کہ کسی نے بوٹوں کی حفاظت کے لئے کاغذ بکھیر دیا ہو۔ اِس طرح سے یہ پوسٹر "کابل" پہنچ گئے اور وہاں سے غیر ممالک...... اِس طرح ایک بار دہلی سے سائیکلوسٹائل مشین منگوانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مشین خرید لی گئی اور کھول کر دہلی کی ایک مشہور موٹر کمپنی کے پرزہ جات کے ساتھ پشاور پارسل کر دی گئی۔ پشاور میں اُس کمپنی کا برانچ آفس تھا۔ دہلی سے خفیہ سامان زیادہ تر اِسی کمپنی کے ذریعے آتا تھا کیونکہ کمپنی کا ایک ذمہ دار افسر انقلابیوں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا۔

جب حالات بگڑنے لگے اور پوسٹروں کی اشاعت کچھ عرصہ کے لئے بند کرنی پڑی تو چند دوسرے طریقے پروپیگنڈے کے لئے اپنانا پڑے مثلاً ناڑی (ایک کھٹائی) کو گھس کر اس کے لعاب سے سفید کاغذ پر مضمون لکھ دیا جاتا تھا۔ خشک ہونے پر وہ بالکل سفید کاغذ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اُنہی کاغذات کو لوگوں کے پاس پہنچایا جاتا تھا، وہ لوگ کاغذ کو آگ کی روشنی دکھلا کر اُسے پڑھتے تھے۔ روشنی سے ناڑی سے لکھے ہوئے حروف کاغذ پر اُبھر آتے تھے۔ اِسی قسم کا ایک دوسرا طریقہ اُلٹے حروف لکھنے کا تھا۔ اُسے آئینہ کے سامنے پڑھا جاتا تھا۔

☆☆☆☆☆
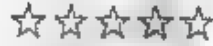
# بھوک ہڑتال

بھوک ہڑتال کب سے شروع ہوئی؟ یہ بتانا تو میرے لئے مشکل ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ایک انقلابی نوجوان ''شری میکوسینی'' نے بھوک ہڑتال کر کے ساری دنیا کو ایک بار اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اس کے بعد آزادی کی تحریک میں بنگال کے ایک مجاہد جتندر ناتھ داس نے بھوک ہڑتال کی۔ انہوں نے بھوکے رہ کر اپنی زندگی کی قربانی دی اور پھر یہ سلسلہ ہندوستان کی جیلوں میں شروع ہو گیا۔ لیکن ایسا قدم اُٹھانا ہر ایک کے بس کا نہ تھا۔ بھوک ہڑتال دراصل ایک آخری ہتھیار ہے۔ اپنے مقدس فرض کی تکمیل کے لئے بسا اوقات یہ ہتھیار کامیاب ہوتا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا انحصار بھوک ہڑتال کرنے والوں کے ضمیر اور مضبوط فیصلہ پر ہوتا ہے۔ ''ڈھلمل یقین'' اس میدان میں بری طرح مار کھا جاتے تھے۔ جیل کے اندرونی حالات نے ایک بار مجھے بھی مجبور کر دیا کہ اس خطرناک راستے کو اپناؤں۔ میرے سامنے اُس وقت عبید اللہ خان کا چہرہ تھا۔ جس کی خاموش زبان کہہ رہی تھی۔ بھوک ہڑتال کرنے چلے ہو، سوچ لو راستہ بہت تنگ ہے، قدم قدم پر موت ہے پیارے۔ میں نے 72 دن کی بھوک ہڑتال کی ہے، خطرناک راستہ عزت کا سوال۔ یہ بات 1938ء کی ہے۔ دو برس کی سزا پا کر میں پشاور جیل میں لایا گیا تو جیل والوں نے مجھے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا۔ میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ نتیجہ ڈھاک کے تین پات...... مجھے جبراً بیرک میں دھکیل دیا گیا۔ غنڈوں کی بیرک جہاں ڈاکو، قاتل اور 420 رہتے تھے۔ یہ رات انتہائی پریشان کن ثابت ہوئی۔ چرسی، بھنگی اور افیونچی میرے اردگرد تھے۔ سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

''کیوں بابو! چوری کی ہے نا؟''

''ارے نہیں کسی لڑکی کے چکر میں آیا ہوگا۔''

واہ رے پہلوان۔۔ صبح نانی یاد آ ئے گی ۔ جب چکی پیسو گے۔

میں یہ سب کچھ آدھی رات تک سنتا رہا۔ جیل اِس سے قبل بھی کئی بار کاٹی تھی اور اسی جیل میں ۔۔ لیکن ۔ اب کی بار مجھے تلخ تجربہ ہوا اور رات بھر میرا دماغ چکر کاٹتا رہا۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی اور صبح بیدار ہوا تو اخلاقی قیدیوں کے نرغے میں مجھے بھی لیجایا گیا۔ مشقت کے لئے..... میرے کارڈ پر لکھا گیا کولہو ۔۔ جس سے تیل نکالا جاتا ہے یہاں بجائے مویشیوں کے قیدی جوتے جاتے ہیں، میں نے انکار کر دیا۔ مجھے ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ شام کے وقت مجھے ایک قیدی ملا۔ چوری چھپے۔ اُس نے کہا ہم سیاسی قیدی ہیں۔ ہمیں بہت پریشان کیا جاتا ہے۔ اخبار نہیں ملتا۔ خوراک گندی، سیاسی قیدیوں کو الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ وحشیانہ سزائیں دی جاتی ہیں۔ سنگین مشقتیں لی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ اس قیدی کی باتوں نے مجھے متاثر کیا۔ میرا دماغ فوراً بھوک ہڑتال کی جانب پلٹ گیا۔ بھوک ہڑتال، میرے لئے یہ راستہ بالکل نیا تھا اور انوکھا۔

رات بھر اس مسئلہ پر سوچتا رہا۔ دوسرے دن دوپہر تک اس تگ ودو میں رہا۔ جون کا گرم مہینہ، شعلوں کی تپش، تنگ وتاریک کوٹھری۔ جب شام کے وقت لنگر سے کھانا آیا تو میں نے اعلان کر دیا کہ اب سے میری بھوک ہڑتال شروع ہے۔ روٹی جنگلے کے باہر رکھ دی گئی۔ صبح پھر روٹی واپس کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک طوفان مچ گیا۔ جیل داروغہ اور وارڈن میرے پاس آئے، دھمکیاں دیں۔ آنکھیں دکھائیں، نرم اور گرم دونوں راستے واضح کئے۔ لیکن یہاں تو زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد والی بات تھی۔ فیصلہ اٹل تھا، بھوک ہڑتال کی پہلی دوپہر، حالت بگڑ گئی۔ پیاس نے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ پانی موجود تھا لیکن پیؤں کیسے بھوک ہڑتال تھی۔ پیاس اور گرمی دونوں نے مل کر میرے جسم پر حملہ کر دیا، میں بے ہوش ہو گیا اور جب ہوش آیا تو خود کو جیل کے ہسپتال میں پایا۔ میرے دونوں طرف ڈاکٹر اور جیل اسٹاف تھا۔ تھوڑی دیر بعد سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی تشریف لے آ ۔۔ ۔ یہ آئرش تھے۔ آزادی کی لڑائی میں کئی گولیاں کھائی تھیں۔ بڑے زندہ دل تھے۔ لیکن قانون کے پابند میری بھوک ہڑتال کو جائز ٹھہرایا۔ لیکن بھوک ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ کرنے لگے۔ مطالبات ماننے کا ادھورا وعدہ بھی کر لیا۔ لیکن کوئی بات کارگر نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے مطالبات کا ایک چارٹر پیش کر دیا، اور اب بھوک ہڑتال باقاعدگی سے شروع ہو گئی۔ لیکن آج کی شام قیامت ڈھانے والی تھی۔ جونہی ڈاکٹر اور جیل اسٹاف میرے لئے دودھ لے کر آئے میں نے

انکار کر دیا۔ لیکن کیا بتاؤں یہ انکار کتنا مہنگا پڑا۔ میں پلنگ پر لیٹا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے آنیا کرانے والی نلی مجھے لگا دی اور دودھ کا برتن میز پر رکھ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ نلی کے ذریعہ یہ دودھ میرے جسم میں داخل ہو۔ میں نے مزاحمت کر کے نلی نکال دی۔ ڈاکٹر سمجھتا رہا دودھ میرے جسم میں داخل ہو رہا ہے لیکن دودھ میری رانوں پر بہتا رہا۔ سارا بستر خراب ہو گیا۔ ڈاکٹر مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ میں نے سمجھا چلو جان چھوٹی . . لیکن اگلی صبح ایک نئی قیامت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نہ بھولنے والی قیامت۔ ڈاکٹر نے کہا تیار ہو جاؤ نئی مصیبت کے لئے نئی مصیبت میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا رضامندی سے دودھ پی لیجئے ورنہ.... ورنہ کیا ہوگا میں نے پوچھا۔ اتنا کہا تھا کہ واقعی قیامت آ ہی گئی۔ میرے دونوں بازو پکڑے گئے۔ دونوں شانوں پر قابو پا لیا گیا اور ڈاکٹر نے ایک نوکیلی ربڑ کی نلی میرے ناک میں گھسیڑ دی۔ اُف کیا بتاؤں کیا نلی تھی، ایک قیامت۔

نلی ناک کو چیرتی ہوئی حلق سے نیچے اُتری اور اِدھر جب میری چیخیں ساتویں آسمان پر جا پہنچیں۔ دودھ میرے پیٹ میں آنے لگا اور جب نلی نکال گئی تو خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ شام کو پھر یہی مصیبت نازل ہوئی اور اس طرح سے یہ سلسلہ چھ دن تک متواتر ہوتا رہا۔ اس دودھ کا اگرچہ کوئی فائدہ نہ تھا تاہم ایک قانونی کاروائی تو کرنا ہوتی تھی۔ میرے چارٹر پر لکھ دیا جاتا کہ بھوک ہڑتالی کو غذا دی گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جیل کی طرف سے مجھے دونوں وقت فروٹ گلوکوس، ٹماٹر اور سنگترے کا جوس وغیرہ پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن میرے لئے یہ سب بیکار تھا۔ میرا فیصلہ اٹل تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ سب نعمتیں میرے سرہانے رکھ دی جاتیں تاکہ میں اکیلے میں اُنہیں کھا لوں۔ وہ انسانی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے لیکن ناکام۔ یہ سب چیزیں شام کو واپس لیجائی جاتی تھیں۔ اُن دنوں میری عجیب حالت ہو گئی تھی۔ منہ میں کڑواپن، دماغ پر بوجھ. . . ہاتھ پاؤں شل . آواز میں آہستگی کسی قیدی کو مجھ تک آنے کی اجازت نہ تھی۔ بھوک ہڑتال کے دن بڑھتے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں دوبارہ آئی۔جی جیل خانہ جات میرے پاس آئے اور مطالبات مان لینے کا یقین دلایا۔ لیکن مجھے اُن کی کسی بات کا اعتبار نہ تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے مطالبات مان لیجیے بعد ازاں بھوک ہڑتال ختم ہوگی۔ میری ہمدردی میں ایک روسی نوجوان مسٹر مدیر نظر بند نے بھی بھوک ہڑتال کر دی۔ یہ نوجوان بھوک ہڑتال کی مصیبتوں اور

پریشانیوں سے خوب واقف تھا۔ اُدھر انڈیمان جیل میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ کافی عرصہ تک رہ چکا تھا۔ بھوک ہڑتال کے طور طریقوں سے اچھی طرف واقف تھا۔ اُس نے مجھے کئی باتیں بتائیں۔ ایک خدائی خدمت گار ولی محمد نے بھی بھوک ہڑتال کردی۔ بھوک ہڑتال کو 21 دن ہو چکے تھے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنے چہرے سے مکھی کو اُڑا سکوں۔ بھوک ہڑتال کو ختم کروانے کے لئے جیل میں چند کانگریسی لیڈر بھی میرے پاس آئے۔ جیل میں اُس وقت بالتعداد سیاسی قیدی تھے جن میں حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی بھی تھے۔ وہ اُن دنوں ایک تنگ سی کوٹھری میں بند رہتے تھے۔ اُن کی ہمدردی میرے ساتھ تھی۔ لیکن وہ مل نہ سکتے تھے۔ انہیں کوٹھری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ اُدھر میری حالت نازک ہوتی جارہی تھی۔ فیصلہ کی کوئی امید نہ تھی۔ میں نے ہی سوچ لیا کہ اب موت قریب ہے۔ لیکن ایک دن اچانک میرے پاس یک چارٹر لایا گیا جس میں چھ مطالبات مان لینے کا اعلان تھا۔ مطالبات کی تعداد 10 تھی۔ یہ دراصل میری کامیابی تھی۔ میرے مطالبات پر سارے ساتھی یک بیرک میں کردیئے گئے۔ اخبار ملنے لگے۔ کھانا الگ پکنے لگا۔ شیو کروانے کی اجازت مل گئی۔ وحشیانہ سزائیں بند کردی گئیں۔ ملاقات کا طریقہ کار بدل دیا گیا۔ 29 دن کے بعد بھوک ہڑتال ختم کردی گئی۔ ایک ماہ تک مجھے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ دوسرے دن میرے دونوں ساتھیوں نے بھی بھوک ہڑتال ختم کردی۔

29 دن کی بھوک ہڑتال ایک تلخ تجربہ، زندگی اور موت، لیکن یہ راستہ ہے بڑا کٹھن قدم قدم پر مشکلات، لحہ بہ لحہ موت سے بغل گیر بھوک ہڑتال آج بھی ہوتی ہے مرنے والے اور دھمکی دینے والے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ انگریز ہماری دھمکیوں سے واقف نہ تھے، آج کی حکومت ہماری حقیقت جانتی ہے۔ آج کے بھوک ہڑتالی رات کی تاریکی میں منہ چلاتے ہیں۔ کامیابی اسی لئے نہیں ہوتی، بچوائے واقعی قربان ہوجاتے ہیں لیکن یہ ہتھیار اتنا کند ہوگیا ہے کہ ہر ایک ستعمال نہیں کرسکتا۔

بھوک ہڑتال مذاق نہیں زندگی اور موت کا کھیل اس طرف سوچ سمجھ کر بڑھنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

# بریڈلا ہال

بریڈلا ہال لاہور میں ہے۔ ایک وقت تھا جب ''انقلابی'' اسے اپنا گھر سمجھتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے آئے ہوئے، بھوکے بھٹکے، پریشان حال انقلابی یہیں آکر جمتے تھے اور بریڈلا ہال کے باہر پولیس اُن کی نقل وحرکت پر نظر رکھتی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کڑی نگرانی کے باوجود بھی خفیہ پولیس کے ناز برداروں کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ بریڈلا ہال ایک وسیع میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں مختلف جماعتوں کے دفتر تھے۔ اسی میدان میں ایک کمرہ انقلابیوں کے لئے بھی وقف تھا۔ مجھے پہلی بار بریڈلا ہال میں جانے کا موقع اُس وقت ملا جب پارٹی کی ایک خفیہ میٹنگ کا سوال درپیش تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ پولیس کی نظروں سے بچ کر وہاں جا پہنچا تو سود مند ہوسکتا ہوں ورنہ پولیس سانپ کی طرح چمٹی رہے گی اور کوئی کام بھی نہ کر پاؤں گا۔ مجھے اِس بات کی ہدایت بھی کردی گئی کہ جب بریڈلا ہال میں پہنچوں تو فلاں کمرے میں جا کر ٹھہروں۔ یہیں پنجاب سوشلسٹ پارٹی کا دفتر ہے اور اسی مقام پر متعلقہ ساتھیوں سے ملا جا سکتا ہے لہٰذا میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ لاہور آیا۔ پولیس کی نگاہوں سے بچ کر بریڈلا ہال میں داخل ہوگیا۔ سب سے پہلے میں نے ایک سفید داڑھی والے سردار صاحب کو دیکھا جو ننگے پاؤں، ننگے سر، ایک بنیان اور کچھا پہنے ہوئے تھے۔ قدم آگے بڑھا تو ایک گورا چٹا، دبلا پتلا نوجوان خاکی زین کی پتلون چڑھائے پرانا سا کیپ سر پر ٹھونسے پھرتی سے نکل گیا۔ میرے لئے یہاں کے لوگ غیر آشنا تھے۔ جب میں ایک عمارت کے آنگن میں جا کھڑا ہوا تو ایک عورت نے پوچھا:

''کس نوں ملنا اے؟''

میں نے بتایا:

''میں پشاور سے آیا ہوں۔ منشی احمد دین جی کو بخوبی جانتا ہوں۔ وہ ہمارے مولانا صاحب

کے پاس ہی آ کر ٹھہرتے ہیں۔"

مولانا کا نام سنتے ہی عورت مجھے کمرے میں لے گئی اور کہا کہ میں فلاں کامریڈ کی بیوی ہوں اور پھر ایک دوسری عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ فلاں ساتھی کی گھر والی ہیں۔ ہمارے دونوں آدمی اِس وقت جیل میں ہیں اور یہاں فاقے ہو رہے ہیں۔ میں دونوں ساتھیوں کو خوب جانتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کتنی عجیب بات ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اور میں خاموش ہو کر اوپر والے کمرے میں چلا گیا جہاں کچھ ساتھیوں سے ملا۔ بات چیت ہوئی۔ رات کو وہی دبلے پتلے نوجوان آئے اور بوٹوں سمیت ایک اُدھیر عمر چارپائی پر لیٹ گئے۔ یہ تھے حضرت عبدالغنی لاہور کی پولیس جس سے تنگ آ چکی تھی۔ وہ بار بار جیل گیا۔ اذیتیں اُٹھائیں۔ وحشیانہ برتاؤ کا شکار ہوا۔ اُس کے ذمہ ایک ہی کام تھا جہاں کہیں جلسہ ہو، جہاں کہیں مظاہرے کا پروگرام ہو یا میٹنگ ..... عبدالغنی بگل بجا کر سارے لاہور کو اطلاع کر دیتا تھا۔ اُس کی بگل سرکار کے نزدیک خوفناک ہتھیار کی مانند تھی۔ بم اور پستول سے بھی خوفناک۔ کئی بار سرکار نے بگل ضبط کر لیا۔ لیکن پھر دوسرے دن ہی غنی کے ہاتھ میں بگل ہوتا۔ عبدالغنی سے ایک بار کسی نے پوچھا کامریڈ تم بوٹ کیوں نہیں اُتارتے؟ جواب دیا میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ کون جانے کس وقت میری ضرورت پڑ جائے اور بات ٹھیک بھی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ لاہور کی پولیس ایک مظاہرے کو روکنا چاہتی تھی، ایک تھانے دار گھوڑے پر سوار ہنٹر سے لوگوں کو پیٹ رہا تھا۔ عبدالغنی نے اُس کے قریب جا کر اِس قدر زور سے بگل بجایا کہ گھوڑا بدک کر سرپٹ بھاگا اور تھانے دار صاحب دھڑام سے نیچے۔ مظاہرین نے قہقہے بلند کئے۔ عبدالغنی کو پکڑ کر پولیس چوکی میں لے جایا گیا اور وہاں خوب خاطر تواضع ہوئی۔ نہ جانے بے چارہ عبدالغنی آج کس حال میں ہوگا۔ بریڈ لاہال میں داخل ہوتے ہوئے جو سردار صاحب نظر پڑے تھے وہ کمیونسٹ تھے۔ اُن دنوں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں کوئی زیادہ کشمکش نہ تھی۔ دو دن وہاں رہنے کے بعد میں پشاور واپس آ گیا۔ لیکن لاہور اسٹیشن پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب میں نے پشاور کا ٹکٹ خریدا تو ایک مہاشے میرے پیچھے لگ گئے۔ بغیر جان پہچان دوستی گانٹھنے لگے۔ بات چیت میں حضرت نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا لاہور ریلوے اسٹیشن سے آگے۔ بات کچھ بن نہ سکی اور جب میں ڈبے میں بیٹھا تو ٹکٹ چیکر صاحب تشریف لائے۔ حالانکہ یہ وقت ٹکٹ چیکر کا

نہ تھا۔ میں بھانپ گیا کہ سب پولیس کا چکر ہے۔ ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ طلب کیا۔ میں نے ٹکٹ دکھلایا..... پلیٹ فارم پر مہاشے جی ٹہل رہے تھے۔ جب ٹکٹ چیکر اُس سے ملا تو وہ بہت خوش ہوئے جیسے چتوڑ کا قلعہ فتح کرلیا ہو۔ وہ بہت دیر میرے ساتھ رہا۔ گاڑی جب دوسرے اسٹیشن پر آ کر رکی تو میں اُس کی نظروں سے بچ کر دوسرے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ مہاشے جی تیزی سے اسٹیشن سے باہر چلے گئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میرے پاس ٹکٹ یہیں تک کا ہے۔ ٹکٹ چیکر کو میں نے یہی ٹکٹ دکھایا تھا۔

دوسری بار جب میں بریڈلاہال گیا تو چند ممتاز انقلابیوں سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جن میں سے ایک تھے ساتھی سوم پرکاش شیدا۔ اُس وقت یہ ساتھی کارل مارکس کے فلسفے پر ایک سند رکھتے تھے۔ سوشلزم اور کمیونزم کی تھیوری انہوں نے گھول کر حلق کے نیچے اُتار رکھی تھی۔ بہترین مقرر، بہترین ادیب، شاعر اور سلجھے ہوئے ورکر اور ذہین رہنما۔

اب کی بار پارٹی ورکروں نے کھانے کا بندوبست یہاں پر ہی کر رکھا تھا۔ لہٰذا جب میں رات کو کھانا کھانے بیٹھا تو کئی انقلابی ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ آج میں سوچتا ہوں، کہاں ہیں وہ مجاہد ....نہ جانے کس حال میں ہوں۔ بہر حال بریڈلاہال انقلابیوں کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے انقلابی کسی نہ کسی صورت میں یہاں چلے آتے تھے۔ یہاں حلاشیوں کی بھرمار بھی رہی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ بھی زوروں پر چلتا رہا۔ بم، پستول اور چند خطرناک ہتھیاروں کا لین دین بھی ہوتا رہتا تھا لیکن پولیس اپنے مقصد میں کسی وقت بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نقلابی مرکز میں پنجاب اور فرنٹیر کے لئے انقلابی سکیمیں بنتی تھیں۔ ''لال ڈھنڈورا'' اور ''بالشویک'' پمفلٹوں کی اشاعت بھی یہیں سے ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ بریڈلاہال نے بھی کئی مجاہد پیدا کئے۔ منشی احمد دین مبارک، ساغر ٹیکا رام سخن، سوم پرکاش شیدا، پروفیسر تلک راج چڈھا، سوڈھی پنڈی داس، رام سنگھ مان، کی وابستگی کئی برسوں تک اسی ہال سے رہی۔ بسا اوقات یہاں کانگریس کی میٹنگیں بھی ہوتی تھیں۔ کسان سبھاؤں کے اجلاس بھی ہوتے تھے لیکن زیادہ کام خفیہ ہی تھا۔ میرا اپنی سیاسی زندگی میں دو بار ہی بریڈلاہال جانا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں کی ہر بات انوکھی تھی۔ ہر بات نرالی، بات چیت کا انداز الگ، یہاں ہر بات میں زندگی تھی۔ نہ جانے آج بریڈلاہال کس حال میں ہوگا۔ اس کے کمرے کس مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے۔ کیا اب بھی وہاں پولیس چوکی ہے یا

نہیں۔ کیا اب بھی وہاں کوئی مخلص عبدالغنی بستا ہے جو بگل کی آواز سے سوئے ہوئے لوگوں کو جگا دے۔ مردہ زندگی میں رُوح پھونک دے۔

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو!
کاخ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو!

☆☆☆☆☆

# انگریزی راج میں قوم پرستوں کی خانہ تلاشیاں

بات آج سے کئی سال قبل کی ہے جب ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں بری طرح جکڑا ہوا تھا، جب سارا ملک زندگی اور موت کی منزلیں طے کر رہا تھا، اُن دنوں حریت پرست طبقہ کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اُن میں ایک خوفناک اور غیر شریفانہ سلسلہ تلاشی کا بھی تھا یعنی سرکاری ٹٹو بغیر کسی جرم وخطا کے ہر شریف آدمی کے گھر کا کونہ کونہ چھان سکتے تھے۔ گھر کی دنیا تہس نہس کر دینا ان مہرِ پرشوں کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ تھا۔ اِسی خانہ تلاشیوں میں بسا اوقات عجیب و غریب حرکتیں منظرِ عام پر آتیں۔ مثلاً تلاشی لینے والے صاحب کسی کمرے میں گھس گئے اور جونہی کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو پٹاخ سے وہ بم کی صورت میں پھٹ گئی اور آنے والے معزز مہمان گوشت پوست کا ڈھیر بن گئے۔

لاہور کا ایک واقعہ ہے کہ پولیس نے اچانک ایک انقلابی کے گھر پر چھاپہ مارنا چاہا۔ 25 آدمیوں کا ایک گروہ جب اس مقصد کے لئے اُس کے گھر پہنچا تو بڑی فرعونیت کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ کواڑ کھلا تو مطلوبہ نوجوان دکھائی دیا۔ اُس نے کہا۔

''آیئے اندر تشریف لایئے۔''

جواب ملا۔ ''تلاشی لینی ہے۔''

''کس بات کے لئے!؟''

''خفیہ لٹریچر کے سلسلے میں!''

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔''

''کچھ بھی ہو، تلاشی ضروری ہے'' اور اتنا کہہ کر ایک انسپکٹر تین سپاہیوں کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا۔ خانہ تلاشی شروع ہوگئی۔ مکان کا ایک ایک گوشہ چھان مارا، ایک ایک چیز اُلٹ

پلٹ کردی گئی، کوئی کاغذ نہ مل سکا، کوئی قابلِ اعتراض چیز ہاتھ نہ آئی۔ انسپکٹر صاحب نے نتھنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''کہاں رکھے ہیں وہ کاغذ؟''

''غلط فہمی کے بکس میں''۔

انسپکٹر صاحب جامہ سے باہر ہو گئے اور ایک گودام نما کوٹھری میں گھس گئے۔ نوجوان نے چلا چلا کر کہا۔ حضرت وہاں کچھ نہیں رک جایئے، رک جایئے۔ انسپکٹر جواب دیئے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایک میلی سی پوٹلی کو ٹٹولنے لگا کہ اچانک دھماکا ہوا، پوٹلی کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ مکان کے باہر کھڑی پولیس سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئی۔ چار آدمیوں کا چھوٹا سا قافلہ کوٹھری کی نذر ہو گیا اور انقلابی نوجوان جیل کے اندر۔

1931ء کی بات ہے میں نے سیاست کے میدان میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ سیاسی نشیب و فراز سے واقف نہ تھا۔ محض لڑکپن کا ایک جذبہ تھا، بم دیکھنے اور مارنے کا جنون تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں والدہ صاحب کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ کواڑ کھلے تو پولیس کی لال پگڑیاں دکھائی دیں۔ ایک صاحب نے جو غالباً سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، کرخت آواز میں بولے۔

''نگینہ (راقم الحروف) کہاں ہے؟''

میں نے قدرے جرات سے جواب دیا۔ ''گھر پر نہیں''

''مکان کے اندر کون ہے''

''والد صاحب''

اتنا سنتے ہی سردار صاحب بمعہ چار کانسٹیبلوں کے مکان کے صحن میں آ گھسے۔ والد صاحب کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی اور چناخ سے فرش پر گر کر دم توڑ گئی اور والد صاحب نے بڑی عزت کے ساتھ کہا ... ''سردار جی فرمایئے کیا حکم ہے؟''

''اس گھر کی تلاشی لینی ہے، تمہارے لڑکے نگینہ کے پاس آتش گیر مادہ ہے''۔

آتش گیر مادہ اور میرا لڑکا ..... والد صاحب میری طرف دیکھنے لگے اور میرے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ سردار صاحب بھانپ گئے، کہنے لگے ''کہاں ہے وہ کمبخت جس نے آپ کو

مصیبت میں ڈال دیا ہے"۔ والد صاحب نے جھٹ سے کہا" یہی ہے یہی ۔ حرام زادہ۔" لیکن سردار جی اس سے تو مکھی بھی نہیں ماری جاتی، یہ آتش گیر مادہ کہاں سے لائے گا؟"

چھوڑیئے اِن باتوں کو سردار جی گھر کی ہر چیز پر اس طرح جھپٹے جیسے بلی بیچارے چوہے پر کپڑے، برتن، بستر، کاغذات وغیرہ وغیرہ بڑی بے دردی سے دیکھے گئے۔ جب کچھ نہ ملا تو منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے سردار جی نے کہا۔

"خود ہی بتا دو کہاں ہیں وہ چیزیں؟"

میں نے کہا" سردار جی! میں نے تو ابھی پٹاخہ بھی نہیں دیکھا، بم کی بات کرتے ہیں آپ"

جب سردار جی مایوس ہو گئے تو ایک کاغذ پر یوں لکھا ... "اطلاع غلط تھی ہمیں افسوس ہے"۔

انگریزی دور کے وقت خفیہ لٹریچر کی اشاعت بہت زیادہ تھی خصوصاً پنجاب اس کا مرکز تھا۔ ایک عرصے سے "لال ڈھنڈورا" نام سے ایک خفیہ پملفٹ خفیہ طریقوں سے چھپ کر عوام الناس میں بانٹا جاتا تھا۔

اُس کی تقسیم سوشلسٹوں کے ہاتھ میں تھی۔ خفیہ پمفلٹ کی تلاش میں سی۔آئی۔ڈی والے بہت پریشان تھے۔ لہٰذا ایک دن صبح کے وقت دوسرے ساتھیوں کی طرح پولیس نے میرے مکان پر بھی چھاپہ مارا۔ خوش قسمتی سے اُس وقت گھر پر میرے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ پولیس کا گروہ دندناتا ہوا اندر چلا آیا اور آناً فاناً میں گھر کا نقشہ بدل دیا۔ ایک ایک چیز دیکھ ماری، لیکن مطلوبہ لٹریچر ہاتھ نہ آسکا۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ کتنے پاگل ہیں یہ لوگ بھلا ایسا لٹریچر گھر میں کہاں رکھا جاتا ہے۔ میں نے مذاق کے طور پر ایک شرارت کی۔ میرے گھر سے باہر تک ایک زمین دوز نالی تھی جس میں کئی مہینوں سے گندگی کچھ اِس طرح جم گئی تھی کہ پانی باہر نہیں جاتا تھا۔ میں نے اخبار کا ایک ٹکڑا تہہ کر کے کچھ اس انداز سے اور تیزی سے نالی کے اندر پھینک دیا کہ پولیس والے دیکھ لیں لہٰذا انہوں نے جب مجھے کاغذ پھینکتے ہوئے دیکھا تو جھٹ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ نالی کے اندر کیا پھینکا ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ خفیہ کاغذ ہے۔

میں نے شہادت کو مضبوط بنانے کے لئے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا" انسپکٹر صاحب یونہی ایک بیکار سا کاغذ تھا، خفیہ کاغذ میرے پاس کہاں"۔

بات بن گئی، پولیس کو شکار مل گیا بہشتی کو بلایا گیا۔ اُس نے نالی میں پانی چھوڑا۔ مجھے خوب

یاد ہے کہ جونہی ادھر سے پانی چھوڑا جاتا تھا۔ باہر نالی سے نکلنے والی بدبودار گندگی کو بچارے سپاہی ٹٹولتے، غالباً دس مشکیں پانی کی ڈال دی گئیں۔ نالی بالکل صاف ہوگئی، کاغذ کا ٹکڑا نکل آیا۔ انسپکٹر فرطِ مسرت سے ناچنے لگا۔ مگر افسوس کہ جب کاغذ کو کھولا گیا تو وہ پرانے اخبار کا ایک بوسیدہ ٹکڑا تھا، انسپکٹر صاحب سٹ پٹائے، اپنے اسٹاف کو گالیاں بکنے لگے۔ ایک گھنٹہ کی سردردی کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جاتے ہوئے مٹی کی ایک سیاہی بھری دوات، دو قلم، تین خالی کاغذ اور ایک پرانا گھسا ہوا کاربن اپنے ساتھ لے گئے۔ نالی کا واقعہ جب میں نے اپنے ساتھیوں سے بیان کیا تو وہ میرے انوکھے مذاق پر بے ساختہ ہنسے۔ یہ تلاشی جہاں میرے گھریلو سامان کے اتھل پتھل کا باعث بنی، وہاں مہینوں کی گندگی صاف ہوگئی اور اندر کا پانی بڑی آسانی سے باہر نکلنے لگا۔

1938ء کی ایک صبح کو نیند سے بیدار ہوتے ہی جب پہلی بار کسی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تو وہ سردار کرتار سنگھ سی۔آئی۔ڈی آفیسر تھے، خوبصورت، نوجوان، گٹھیلا بدن، بغل میں پستول، ہاتھ میں ہنٹر۔ فرمایا تلاشی لینا ہے۔ میں نے کہا آیئے تشریف لایئے۔ بہت دنوں سے آپ ہی کا انتظار تھا۔ اُن دنوں میں نے مکان کو مقفل کر رکھا تھا۔ ہر روز کی تلاشیوں سے گھر والے بگڑ گئے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا ''بالا خانہ'' تھا۔ تنگ سیڑھیاں۔ جب سردار صاحب اور دوسرے سپاہی سیڑھیاں پھلانگ کر کمرے میں آئے تو تلاشی لینا شروع کی۔ اس کمرے میں مختصر سا سامان تھا۔ چند کتابیں، کچھ کاغذات، اخبارات کا پلندہ اور کپڑے وغیرہ تلاشی لینے پر بھی جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو اچانک سردار صاحب کا دھیان اوپر چھت پر چلا گیا۔ کہنے لگے اوپر جانے کا راستہ کونسا ہے؟ ذرا وہاں بھی دیکھ لیں۔ اوپر جانے کے لئے تنگ و تاریک سیڑھیاں تھیں۔ سردار صاحب اوپر تشریف لے گئے تو وہاں کوئی کمرہ تو تھا نہیں، محض حاجات ضروری کے لئے ایک ''پاخانہ'' تھا۔ سردار صاحب واپس لوٹنے لگے تو مجھے ایک مذاق سوجھا۔ میں نے مٹی کا ایک کوزہ سیڑھیوں میں رکھ دیا۔ جب سردار صاحب تیزی سے نیچے اُتر رہے تھے تو وہ کوزے سے ٹکرا گئے اور لڑھکتے ہوئے سیڑھیوں سے ٹکراتے ٹکراتے نیچے آگرے۔ بیچارے بری طرح زخمی ہو گئے۔ دستارِ مبارک دُور جا گری۔ ایک سپاہی بھی لڑھک گیا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ بیچارے سردار صاحب مجھے شکار بنانے آئے تھے، خود شکار بن کر گئے۔ میں نے دیکھا کہ سردار صاحب معہ گارڈز کے جا رہے تھے تو بیچارے بڑے مایوس تھے۔ کاغذات مکان کے اوپر والے پاخانہ کے ایک گڑھے میں محفوظ تھے۔

بچارے اوپر گئے بھی ..... لیکن بدبو کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔

ہمارے ایک سیاسی دوست مسٹر عبدالرحمن ریا تھے۔ پکے سوشلسٹ اور وطن کے بھی پکے۔ وہ بھی میری طرح گھر بار سے آزاد تھے۔ اُن کی رہائش پشاور کے ایک علاقہ "اندر شہر" میں تھی۔ وہ اُن دنوں ٹائپ کا ایک مختصر سا سکول کھولے ہوئے تھے۔ پولیس کو شک تھا کہ سکول محض ڈھونگ ہے۔ یہ بھی انقلابیوں کا ایک مرکز ہو سکتا ہے، کسی نے اطلاع کر دی کہ ریا صاحب کاغذات ٹائپ مشین کے اندر چھپا کر رکھتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، پولیس آئی، ادھر اُدھر کی تلاشی لی اور پھر ٹائپ مشین پر ہاتھ صاف کرنے لگی۔ ٹائپ مشین کھولی گئی۔

ریا صاحب نے کہا۔ جناب مشین نے کیا قصور کیا ہے۔ اس کو اپنے حال پر رہنے دیجیے۔ لیکن وہاں سنتا کون تھا۔ تین مشینیں کھول دی گئیں، اُن کے بخیے اُدھیر دیئے گئے لیکن کچھ بھی نہ نکلا۔ ریا صاحب کو غصہ آ گیا، انہوں نے کھلی ہوئی مشینوں کے ٹکڑے کھڑکی سے نیچے بازار میں پھینک دیئے اور کہا حرام زادے روٹی بھی کھانے نہیں دیتے۔ پولیس والے اُن کی فطرت سے خوب واقف تھے، خاموشی سے واپس لوٹ گئے۔ تینوں مشینوں کو ایسی بیدردی سے کھولا گیا تھا کہ زندگی بھر ان کے بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ اور پولیس والے جن کاغذات کی تلاش میں پاگل ہو رہے تھے وہ ریا صاحب کی ایک فریم کی ہوئی تصویر کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔

کڑکتی دوپہر تھی۔ میں اپنے ایک ساتھی سردار سادھو سنگھ سوز کی دکان پر بیٹھا تھا۔ سردار صاحب اُن دنوں سلمہ ستارہ کا کام کرتے تھے اور ایمبرائیڈری کی ایک مشین بھی اُن کے پاس تھی۔ اچانک پولیس نے اُن کی دوکان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ پولیس والے ایک ایسے کاغذ کی تلاش میں تھے جو حکومت کے خلاف چھپنے والا تھا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد پولیس نے دوکان کی ہر چیز بکھیر دی۔ دیواروں پر لٹکے ہوئے کپڑے اور فوٹو اُتار پھینکے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ پولیس میں ایک شخص میر زمان تھا جو عام طور پر لوگوں کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ دن میں کئی بار ملتا۔ اُس نے چلتے چلتے کہا . . کچھ بھی ہو کاغذ اس دوکان کے اندر ہی ہے۔ واقعی میر زمان کی بات ٹھیک تھی۔ کاغذ دوکان کے اندر ہی تھا لیکن کہاں ایمبرائیڈری کی مشین کے اندر۔ جب پولیس نے گھیرا ڈالا تو سردار سادھو سنگھ کے ہاتھ میں یہ کاغذ تھا اور ہم اِسے چھپانے کی بات سوچ رہے تھے۔ سردار صاحب نے نہایت پھرتی سے مشین کے ایک پرزے کے اندر چھپا دیا

اوراوپر سے مشین کا ڈھکنا بند کردیا۔ پولیس کی نظریں اُدھر تک پہنچ بھی نہ سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگراُس وقت یہ کاغذ پولیس کے ہاتھ میں آجاتا تو نہ جانے کیا آفت آجاتی۔

بات ہی کیا ہے اگر آج ہوئے ہم برباد
کوئی تو اہلِ جنوں دہر میں آباد بھی ہے

(مولانا پوپلزئی)

☆☆☆☆☆

# جنگ آزادی اور جیل

انگریزی دور کا ہر واقعہ حریت پسندوں کے خلاف جبر وتشدد کی ایک داستان ہے۔

ذرا ہندوستان کی پرانی تاریخ پر نظر دوڑائیے۔ جب ایک صوبے نے دوسرے صوبے پر قبضہ کرنا چاہا تو بھلا وہ کونسا ہتھیار تھا جو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ کیا گیا ہو اور پھر جب متحدہ ہندوستان دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تو کیا کیا گل نہیں کھلائے گئے۔ ہاں تو میں انگریزی دور کی خونچکاں داستان بیان کر رہا تھا۔ برسوں تک برطانوی حکومت نے مجاہدین حریت پر بے پناہ ستم ڈھائے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جبر وتشدد کا طوفانی چکر صرف جیل سے باہر ہی نہیں چلا، جیل کے اندر بھی ظلم وستم کے ننگے ناچ دیکھنے میں آئے۔ جیل کی چار دیواری کے اندر سلاخوں کے پیچھے، قیدیوں کو گولیوں سے داغا گیا۔ کوڑے لگائے گئے، وزنی بیڑیوں سے پاؤں جکڑ دیئے گئے۔ برسوں کالی کوٹھریوں میں سرفروشانِ وطن کو رکھا گیا۔ سارا ہندوستان اس بات کا گواہ ہے۔ 1930ء کا ایک واقعہ سنئے۔

23 اپریل 1930ء کو جب قصہ خوانی بازار میں گولی چلا کر مجاہدین وطن کو جام شہادت پلایا گیا تو اس المناک واقعہ کی اطلاع پشاور سنٹرل جیل کے قیدیوں کو بھی مل گئی۔ یہ قیدی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، قتل، چوری، ڈاکے اور غنڈہ گردی کے یہ مجرم، اخلاقی قیدی بھی قصہ خوانی بازار کی خوں ریزی کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے جیل میں ہی ہنگامہ برپا کر دیا اور جس دن پشاور کے سرکردہ کارکن گرفتار ہو کر اس جیل میں لائے گئے تو ہنگامے نے پھر زور پکڑا، قیدیوں نے اپنی کوٹھریاں توڑ دیں اور سینکڑوں کی تعداد میں جیل کے بڑے میدان میں جمع ہو گئے۔ جیل کی بڑی دیوار ٹوٹنے والی ہی تھی کہ خود لیڈروں نے اس ہنگامے کو بند کرنے کے لئے کہا۔ قیدیوں نے اُن کی بات مان لی۔ جیل افسروں نے لیڈروں سے وعدہ کیا کہ وہ ان باغی قیدیوں کو کسی قسم کی سزا

نہیں دیں گے اور جب ان لیڈروں کو پشاور جیل سے نکال کر پشاور کے قلعہ بالا حصار میں پہنچا دیا گیا تو جیل کے چاروں طرف پولیس اور فوج کھڑی کردی گئی۔ جیل کے برجوں پر بندوق بند سپاہی تعینات کردیے گئے۔ اخلاقی قیدیوں کو کوٹھریوں سے نکالا گیا اور انہیں باغی کہہ کر وہ ستم توڑے کہ آسمان بھی رونے لگا۔ ایک ایک قیدی کو پچاس پچاس بید لگائے گئے۔ وزنی بیڑیوں سے اُن کے پاؤں جکڑ دیے گئے۔ قیدیوں کی سزاؤں میں اضافہ کردیا گیا۔ کئی قیدی دوسری جیلوں میں تبدیل کئے گئے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اخلاقی قیدیوں میں بھی آزادی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

پشاور کی جیل میں یہ پہلا ہنگامہ تھا جس نے دوسری جیلوں میں بھی بغاوت کا جذبہ پیدا کردیا۔ اخلاقی قیدی بھی سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ آخر اس ملک پر ہمارا بھی حق ہے۔ اور ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ آزادی کی اس آگ میں کود کر کبھی کبھی کوئی ہنگامہ کھڑا کردیں اور اس طرح سے اپنے جذبات کی تسکین کرلیں۔

پشاور سنٹرل جیل کے بعد دوسرا بڑا ہنگامہ ہری پور سنٹرل جیل میں ہوا۔ سردی کے دن تھے، جیل کے تمام کمرے، بارکیں اور کوٹھریاں سیاسی قیدیوں سے بھری پڑی تھیں۔ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے جیل کے احاطے میں خیمے لگائے گئے تھے اور اُن میں سیاسی قیدیوں کو پاؤں میں زنجیر ڈال کر رکھا جانے لگا۔ جیسے کوئی جانوروں کو باندھ دیتا ہے۔ قیدی اس بدتمیزی کے خلاف ہوگئے۔ جیل افسران بھڑک اُٹھے۔ انہوں نے بھی اس سخت سردی میں چار چار قیدیوں کو صرف ایک ایک کمبل دیا یعنی ایک کمبل میں چار قیدی۔ ہری پور سنٹرل جیل کی کوٹھریاں سیمنٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ اس لئے سردی کے دنوں میں اُس پر سونا قیامت سے کم نہ تھا۔ قیدیوں نے بڑی شرافت سے جیل کے قاعدے کے مطابق ایک قیدی کے لئے دو کمبل مانگے۔ اس جائز مانگ کو افسروں نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ اگر تمہیں آزادی ہی لینی ہے تو ننگے بھی رہ سکتے ہو۔ ادھر قیدی بھی کوئی کم نہ تھے۔ جیل کے تمام سیاسی قیدی لنگوٹے اور تہمد باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ بیچارے سردی سے کپکپا رہے تھے۔ لیکن اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ سارا جیل بغاوت کی صورت اختیار کرگیا۔ اُدھر قیدیوں نے روٹی کھانے سے انکار کردیا۔ حالات بگڑنے لگے۔ جیل افسران اور قیدیوں میں ٹھن گئی۔ افسران اکڑ رہے تھے۔ قیدی اپنی بات پر قائم تھے۔ اس دوران کشمکش بڑھ گئی۔ چند قیدیوں اور افسران میں تنخ

کلامی ہوئی۔ نوبت ہاتھا پائی تک آ پہنچی۔ جیل میں خطرے کا الارم بجا دیا گیا۔ جیل کی برجیوں پر توپیں رکھوا دی گئیں۔ جیل کے چاروں طرف فوج گشت کرنے لگی۔ اتنا ہی نہیں ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیل کے اندر بھی فوج آ گئی اور اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ کوٹھریوں میں قیدیوں کو گولیوں سے داغا گیا، بے شمار قیدی زخمی ہوئے۔ ہاہا کار مچ گئی۔ دن بھر یہ جبر وتشدد کا کھیل کھیلا گیا۔ لیکن سیاسی قیدی پھر بھی اپنی دھن کے پکے نکلے۔ سردی کی وجہ سے دو قیدی مر گئے۔ کئی نمونیہ میں مبتلا ہو گئے۔ آخر جیت اُنہی کی ہوئی۔ جیل افسران جھک گئے۔ ایک قیدی کو دو دو کمبل دیئے گئے۔ پاؤں میں زنجیر نہ باندھنے کا حکم دیا گیا۔ قیدیوں کو کپڑے اور چادریں بھی دی گئیں، لیکن اِس واقعہ کا اثر دوسرے جیلوں پر بھی ہوا۔ وہاں بھی قیدیوں نے جیل افسران کا ناک میں دم کر دیا۔ جیل میں سب سے بڑی اور سخت سزا بید زنی ہے۔ بعض اوقات ایک قیدی 10 بید پر 10 برس قید کو ترجیح دیتا ہے۔ جب جیل کا جلاد چار گز لمبا بید گھما کر قیدی کے ننگے جسم پر زور سے جماتا ہے تو خون کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ لیکن نو وارد قیدی اس سنگین سزا کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ تحریک آزادی کے دنوں میں جیل کے ایک سیاسی قیدی شری اجرج رام کپور کو 15 بید لگائے گئے۔ اِس مجاہد نے ہر بید پر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اُس کے بدن سے جوانی کے اُبلتے ہوئے خون کی پچکاریاں پھوٹ نکلیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اجرج رام کپور دبلے پتلے جسم کا نوجوان تھا۔ بید کھانے کے بعد جب ہوش میں آیا تو اُس نے پھر مانگ کی کہ اور بید مارو، میرا جذبہ شوق ان بیدوں سے مٹ نہیں سکتا۔

ہری پور سنٹرل جیل میں ایک سرخ پوش قیدی تھے 'لالہ حکم چند' ... ایک دن کی بات ہے جب جیل کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیلر سیاسی قیدیوں کے پاس سے گذرا تو لالہ حکم چند نے کہا، جیلر صاحب آپ کی دی ہوئی روٹی کا وزن جیل کے قو.عد کی رُو سے کم ہوتا ہے۔ اگر یونہی رہا تو ہم روٹی لینے سے انکار کر دیں گے۔ اس پر ڈپٹی جیلر آگ بگولا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد لالہ جی کو بلوایا گیا اور [illegible] بید لگوائے گئے کہ انہوں نے روٹی کا وزن کم کیوں بتایا تھا، جب اُن سے پوچھا گیا کہ روٹی کا وزن کم کیسے معلوم ہوا تو لالہ جی نے کہا، جناب میرے ہاتھ ترازو ہیں، انہی سے اندازہ کر لیا ہے اور اتنا ہی نہیں، پشاور سنٹرل جیل میں کسی بات پر سپرنٹنڈنٹ جیل سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ زمانہ جوانی کا تھا۔ میں نے ایک اینٹ اُٹھا کر صاحب بہادر پر دے ماری۔ مجھے تو علم نہیں کہ اینٹ

اُن تک پہنچی بھی یا نہیں، لیکن میرا جو حال ہوا، وہ یاد ہے۔ اینٹ ایک قدم آگے بھاگی ہوگی کہ صاحب بہادر کے حواریوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ گھونسہ بازی شروع ہوئی، لاتوں اور طمانچوں سے وہ تواضع ہوئی کہ خدا کی پناہ..... مجھے کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور جب میں نے اپنے بدن کی طرف دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں کسی نے ہوا بھر دی ہو، بدن سوجھ گیا تھا۔ مجھے اِس تھوڑی سی گستاخی کی سزا جانتے ہو، کیا ملی ایک ماہ کی تنہائی کوٹھری... اور، پیسنے کے لئے گندم۔ لیکن یقین جانئے میں نے گندم کا ایک دانہ بھی نہ پیسا اور اس کے بدلے میں مختلف سزائیں بھگتا رہا۔ ہری پور سنٹرل جیل میں ایک سیاسی قیدی تیرتھ رام سُوری کو کولہو چلانے پر مجبور کیا گیا، بیچارا سُوری بچہ ہی تھا، انکار کر دیا اور وہ طمانچے کھائے کہ ایک بار تو خان عبدالغفار خان بھی تلملا اُٹھے۔ ایک اور ننھے سرخ پوش کو عدالت نے 3 برس قید کی سزا دی۔ جب وہ جیل میں آیا تو اُس کے پاؤں میں وزنی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ ننھا قیدی دو قدم چلتا تو گر پڑتا... لیکن جیل والوں کو اِس سے کیا، آخر بیچارہ بیڑی کا عادی ہو گیا لیکن پاؤں زخمی ہو گئے۔

سرحد کی سیاسی تاریخ میں ہری پور سنٹرل جیل کو زیادہ دخل رہا ہے۔ آزادی کی تحریک میں ایک بار 50 سیاسی قیدی ہری پور سنٹرل جیل لائے گئے۔ ایک دن کی بات ہے کہ جیل خانے میں ''کرنل برائنڈلے'' تشریف لائے۔ پورے کروفر کے ساتھ، انہوں نے دیکھا کہ تمام قیدی ننگے سر ہیں۔ وہ غصے میں آ گئے اور پوچھا کہ تمہارا لیڈر کون ہے، کسی نے کہہ دیا، وہ کھڑا ہے عبید اللہ خان۔ کرنل نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا، اور غصہ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ وہ قانون کا احترام کریں۔ عبید اللہ خان نے جواب دیا کہ کام ملازموں کا ہے میرا نہیں، کرنل برائنڈلے غصہ میں آ گئے اور عبید اللہ خان کو گالیاں دیں۔ جواب میں کرنل کو بھی عبید اللہ خان نے گالیاں دیں۔ اِس پر کرنل سٹ پٹا گیا۔ ایک قیدی نے کرنل پر اینٹ دے ماری۔ معاملہ بگڑ گیا۔ کرنل کو غصہ آیا اور حکم دیا کہ گولی چلا دی جائے، اتنے میں قاضی محمد اسلم وکیل آ گئے۔ انہوں نے فائرنگ سے منع کیا اور کہا کہ اس واقعہ سے ہماری بدنامی ہوگی، کرنل نے واقعہ بیان کر دیا۔ قاضی نے کہا کہ واقعی تم نے غلطی کی ہے کہ عبید اللہ خاں کو گالیاں دیں۔ اب جا کر اِس سے معافی مانگ لو، اُس نے معافی مانگ لی۔ اس بات کا اثر خراب ہوا۔ قیدی بے باک ہو گئے۔ بدانتظامی شروع ہو گئی۔ آخر ایک دن فوج آ گئی۔ جیل کی برجیوں پر مشین گنیں جمع کر دی گئیں۔ جن قیدیوں کے خلاف شکایت تھی، انہیں

ایک احاطہ میں اکٹھا کر دیا اور بیڑیاں ڈال دیں ... 25 آدمیوں کو بیدزنی کی سزا دی گئی۔ احاطہ میں انہیں اکٹھا کر لیا گیا۔ ٹکٹکی منگوائی گئی اور بید لگوانے شروع کر دیئے۔ ہر روز 12-13 آدمیوں کو بید لگائے جاتے۔ چار دن تک یہ شیطانی سلسلہ جاری رہا۔ پانچویں روز عبیداللہ خان کو لایا گیا۔ کرنل برائنڈلے نے کہا کہ تمہیں 500 بید لگانے کا حکم ہے۔ عبیداللہ خان نے کہا کوئی پرواہ نہیں۔ کرنل نے عبیداللہ خان سے کہا کہ تم میرے دوست ڈاکٹر خان صاحب کے لڑکے ہو، اس لئے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اس کے بعد تمام قیدی معاف کر دیئے گئے۔ ان بیدوں کی سزا میں غلام محمد خان لونڈ خور بھی تھے، اُن کے ساتھ ایک دوسرے سرخ پوش لیڈر ڈیران شاہ بھی تھے۔ انہیں تیس تیس بید لگائے گئے لیکن اُف تک نہیں کی۔ ڈیران شاہ نے ہر بید پر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اس پر 5 بید مزید لگائے گئے۔ اُس نے ظالم حکومت مردہ باد کا کہا تو 5 بید مزید لگائے گئے۔ جب اُنہیں ٹکٹکی سے اُتار اگیا تو ڈیران شاہ نے کہا۔ کرنل برائنڈلے، پٹھانوں کو مت ڈرایا کرو، وہ ڈرتے نہیں ... (اخذ)

یہ تو رہی بات بیدزنی کی۔۔ جیل کے اندر وہ ستم توڑے جاتے تھے کہ انسان اس کے تصور سے ہی لرز اُٹھتا ہے۔ جیل میں دو بڑی خطرناک سزائیں اور بھی ہیں۔ ایک ڈنڈہ بیڑی، اور دوسری ٹاٹ دری

ڈنڈہ بیڑی وہ بیڑی ہوتی ہے جو دونوں پاؤں کے درمیان باندھی جاتی ہے۔ یہ لوہے کا ایک سنگین ڈنڈہ ہوتا ہے جو قریب قریب 2 فٹ کا ہوتا ہے۔ جب یہ ڈنڈہ پاؤں میں پڑ جاتا ہے تو بیچارہ قیدی ایک گز فاصلے کو بھی دس منٹ میں طے کرتا ہے۔ گویا اُسے رینگ رینگ کر چلنا پڑتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ڈنڈہ بیڑی کے ساتھ اُس کے پاؤں میں دوسری بیڑی بھی ہوتی ہے۔ جو پاؤں سے لے کر ناف تک چلی جاتی ہے۔ قیدی اُسے اپنے ازار بند سے باندھ دیتے ہیں اور صوبہ سرحد کے انقلابی قیدی اکثر اس سزا کا شکار ہوتے ہیں۔ ٹاٹ دری دراصل ٹاٹ کی بنی ہوتی ہے۔ قیدی کو ننگے بدن پر پہنا دی جاتی ہے۔ اُسے کڑکتی دھوپ میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیئے جاتے ہیں۔ جب سورج کی تیز شعاعیں دری سے ٹکراتی ہیں تو ٹاٹ کی وجہ سے بدن پر سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ قیدی اُس وقت تڑپتا ہے اور جیل افسران قہقہے لگاتے ہیں۔ اس سزا سے قیدی کا جسم خراب ہو جاتا ہے اور بدن پر ''سفیدی'' آجاتی ہے۔ سیاسی

قیدیوں نے اِس بے ہودہ سزا کو بھی مسکراتے ہوئے برداشت کیا۔

پشاور سنٹرل جیل میں مجھے ایک پٹھان قیدی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ انڈیمان جیل سے آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ میں نے انڈیمان جیل میں سیاسی قیدیوں پر انتہائی ظلم ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔ اُسے کسی کا نام تو یاد نہیں تھا، لیکن وہ اکثر ایسے مجاہدوں کا ذکر کیا کرتا تھا۔ جنہوں نے دس برس سے زائد کالے پانی میں کاٹ دیئے تھے۔ اُس نے ایک بڑا دل گداز واقعہ سنایا۔

> بنگال کا ایک انقلابی انڈیمان کی ایک کوٹھری میں متواتر چار سال سے بند تھا۔ وہ بے چارہ کوٹھری میں ہی پاخانہ اور پیشاب کرتا تھا اور وہیں اُسے کھانا دیا جاتا تھا۔ وہیں بیٹھنا، وہیں لیٹنا، اُس نے برسوں تک سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اندھیرے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اُسے روشنی سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اُس کے پاؤں میں سنگین بیڑیاں تھیں اور اُسے جو خوراک ملتی تھی وہ شاید جانور کو بھی پسند نہ آئے۔ اِس پر بھی اس قیدی نے کبھی شکایت نہ کی۔ ایک دن باہر سے آئے ہوئے ایک انگریز نے اُسے کوٹھری سے باہر نکلوایا تو آنکھ جھپکتے ہی وہ گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ وہ کوٹھری میں بیٹھنے کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ کھڑا رہنے کی سکت جاتی رہی۔

یہ تھے انگریزی دور کے جیل ۔ ایسے ہی جیلوں کے بارے میں خان عبدالغفار خان کی زبان سے سنئے:

> جب مجھے جیل لیجایا گیا تو میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں، اُن دنوں میرا وزن دو سو پونڈ تھا اور جسم بھی آج سے دُگنا تھا۔ کوئی بیڑی میرے پاؤں میں نہیں آتی تھی۔ بیڑیوں کو تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی اور جب مجھے بیڑیاں پہنادی گئیں تو ٹخنوں سے اوپر کا حصہ چھل گیا اور بہت سا خون بہا۔ افسران نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور کہا کہ کچھ ہی دنوں میں اِس کی عادت ہو جائے گی۔

اور واقعی جیل میں تو ہر بات کی عادت ہو جاتی ہے۔ ہمارے صوبہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی برسوں جیل میں رہے، وہ اکثر تنہائی کی کوٹھریوں میں رکھے جاتے تھے۔

انگریزی حکومت اُن سے اس قدر خوف کھاتی تھی کہ وہ انہیں جیل کی چار دیواری میں بھی کوٹھری سے باہر نہ رکھتی تھی اور اس پر اُن کے پاؤں میں اکثر بیڑیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ لیکن وہ مردِ مجاہد کبھی ان بیڑیوں سے نہیں گھبرایا اور نہ کوٹھری کی تنہائی کو محسوس کیا بلکہ وہ کوٹھری میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ جیل کے چھوٹے بڑے افسران خود اُنکے خفیہ کام کرتے تھے۔

جیل کی زندگی میں مجھے خود اُن کوٹھریوں سے واسطہ رہا، اور وزنی بیڑیوں سے بھی لگاؤ میرے کئی سوشسٹ ساتھی ان سزاؤں سے اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ اُن پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا، بلکہ جیل والے اکثر ان سزاؤں کو دیکھ کر گھبرا جاتے تھے، لیکن کیا مجال کہ ان مجاہدوں کی پیشانی پر بل دکھائی دے۔

بقول مرزا غالبؔ:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ادھر آ ستمگر ہنر آزمائیں
تُو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

☆☆☆☆☆

# سلاخوں کے پیچھے!

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انگریزی عہد میں جیلوں کی کیا حالت تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا ستم ہو جو جیل کی چاردیواری میں نہ توڑا جاتا ہو۔ بعض اوقات جبر وتشدد کا نتیجہ موت کی صورت میں نکلتا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے وہ اندھیر نگری ہوتی تھی کہ خدا کی پناہ۔ ایک زمانہ تھا کہ برسوں تک قیدیوں کو لوہے کے پنجروں میں رکھا جاتا تھا اور جو کوٹھڑیاں ان لوگوں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں وہ اتنی تنگ وتاریک اور گندی ہوتی تھیں کہ انسان تو کیا جانور بھی اُس کی اندرونی فضاؤں میں زندہ نہ رہ سکتے۔ ایسے مظالم زیادہ تر سیاسی اسیروں کو پیش آئے۔ 42ء کا انقلابی دور تھا۔ دنیا پر جنگ کے بادل چھا رہے تھے اور ہندوستان کے جیل سیاسی قیدیوں سے بھرے پڑے تھے، اُن میں عدم تشدد کے پرستار بھی تھے اور تشدد کرنے والے انقلابی بھی! ایک دن کی بات ہے کہ کچھ نوجوان جنگی قیدی بنا کر جیل میں لائے گئے۔ دوپہر کا عالم تھا۔ ہم لوگ اپنی بارک میں بیٹھے تھے کہ ایک خوبصورت صحت مند نوجوان ہماری بارک میں لایا گیا، یہ نوجوان مسلمان تھا اور کوئٹہ بلوچستان کا رہنے والا تھا، اُسے خفیہ سرگرمیوں کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نوجوان نے بتایا کہ میں بے بالکل بے گناہ ہوں۔ سیاست سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ بلاوجہ کسی کی دشمنی کے باعث گرفتار کر لیا گیا ہوں۔ دو دن تک یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہا۔ اچانک ایک شام اُسے جیل سے باہر لے جایا گیا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ پورے دس دن کے بعد نوجوان پھر ہماری بارک میں لایا گیا لیکن اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اُس کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک ہوا ہے۔ مجھے اب بھی اُس کے یہ فقرے یاد ہیں:

''بھائی صاحب کیا بتاؤں جو میرے ساتھ گذری۔ خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ یہاں سے مجھے سیدھا گاؤں لے جایا گیا۔ ایک پہاڑی چوٹی پر

پولیس چوکی تھی۔ پہلے دن تو میری خوب تواضع ہوئی۔ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن ہی اُن کی نظریں بدل گئیں۔ مجھے بے حد پیٹا گیا۔ چھت کے ساتھ اُلٹا لٹکا کر نیچے سرخ مرچوں کا دھواں دیا گیا۔ میری انگلیوں میں پن چبھوئے گئے ا تین رات تک سونے نہیں دیا گیا۔ جب پولیس اپنے مطلب کی باتیں مجھ سے نہ کہلوا سکی تو صبح کے وقت گاؤں کے باہر بہتی ہوئی ندی پر لے جایا گیا، میرے تمام کپڑے اُتروا لئے گئے، اور میرے ساتھ وحشیوں جیسا سلوک کیا گیا۔ میرے بدن میں چلم کا نیچہ گھسیٹر دیا گیا۔ میرے ساتھ بدفعلی کی گئی۔ اتنا کہتے کہتے وہ بے اختیار رونے لگا۔

پورب کا ایک دبلا پتلا نوجوان کسی قتل کی سازش میں گرفتار ہو کر پشاور سنٹرل جیل میں لایا گیا اُس کا رنگ سانولا تھا اور قد لمبا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے کہا کہ بھاگل پور میں ایک گورا قتل ہوا تھا، اُس کے جرم میں مجھے پکڑا گیا۔ پہلے تو مختلف پولیس چوکیوں پر کبھی تواضع ہوئی اور کبھی مار پیٹ اب بھگوان کا شکر ہے کہ پولیس کی اندھادھند مار سے بچ گیا ہوں۔ اتنا کہتے کہتے وہ رونے لگا۔ بچوں کی طرح میرے ساتھیوں نے کہا ارے بھائی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اب کیوں گھبراتے ہو۔ یہاں تو پولیس کا سایہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ میں اُس کے آنسو پونچھنے لگا تو یکا یک وہ ہنسا۔ بے اختیار ہنسی چھوٹ پڑی۔ معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ پولیس کی اندھی مار سے نیم پاگل سا ہو گیا ہے۔ اُسے جب جبر وستم کی یاد آجاتی تو وہ ڈر جاتا تھا اور جب مرغن کھانے تصور میں آجاتے تو بے اختیار ہنسی آجاتی۔ کچھ دن کے بعد اُس نے کہا، ایک رات کو چار سپاہی میرے پاس آئے، میرے تمام کپڑے اُتار دیئے اور لگے پیٹنے، اتنا زور سے پیٹا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ میرا بدن سوج چکا تھا اور میرے بدن کے مخصوص عضاء سے خون بہہ رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں اُس وقت ایک انسپکٹر آیا اور مجھے کہا تو اب تیار ہو جاؤ! موت سے تم بچ نہیں سکتے۔ چند لمحوں کے بعد ایک سپاہی آیا۔ اُس کے ہاتھ میں موٹی سی رسی تھی اور ایک ہاتھ میں جوٹ کی بوری انسپکٹر نے کہا باندھ لو اِس حرام زادے کو اور ڈال دو اِس بوری میں ..... اور دیکھو اسے بھی اُسی ندی میں ڈال آؤ جہاں کل فلاں سردار صاحب کو ڈال دیا تھا۔ اتنا کہتے ہی انسپکٹر افسردہ

دکھائی دیا اور کہا میرے بچے یہ تو بہت سزا ہوتی ہے ۔ اب تک آٹھ آدمیوں کو مجبوراً موت کے حوالے کر چکا ہوں۔ اب بھی خدا کے لئے مان جاؤ، کچھ بتلا دو! میں نے جواب دیا انسپکٹر صاحب! مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آخر بتاؤں بھی تو کیا۔ اس نے کہا چلو پولیس کے کہنے کے مطابق بیان دے کر جان چھڑا لو ورنہ میں تو مجبور ہوں کہ تمہیں موت کے حوالے کر دوں ۔ نوجوان کی بات سن کر ان سرخ پوشوں کی یاد آ گئی جنہیں ننگا کر کے ندی نالوں میں غوطے دیئے گئے تھے ۔۔ عبدالغنی نام کا ایک نوجوان جب گرفتار ہو کر جیل میں آیا تو اُس کے ساتھ انتہائی ذلیل حرکت کی گئی۔ پہلے تو اُسے جی بھر کر پیٹا گیا، جب مارتے مارتے ظالموں کے ہاتھ تھک گئے تو اُسے ننگا کر کے مونچھ سے بچارے کے بال اُکھیڑنے شروع کر دیئے۔ جوں جوں بال اُکھڑتے تھے، عبدالغنی انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتا تھا۔ عبدالغنی پنجاب کی سوشلسٹ تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے اَن تھک اور مخلص نوجوان تھے۔

پشاور سنٹرل جیل میں ایک دبلا پتلا نوجوان سات برس کے لئے قید ہو کر آیا۔ نام تو یاد نہیں آرہا ہے لیکن اُسے غازی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ جب اُسے پکڑا گیا تو اُس کے سوٹ کیس سے کچھ پستول، کارتوس ورخفیہ کاغذات نکلے، اس جرم پر اُسے سات سال کی سنگین سزا دی گئی، جب وہ جیل میں آیا تو اُس کے پاؤں میں وزنی بیڑیاں ڈال دی گئیں اور پیسنے کے لئے 20 سیر گندم دی گئی۔ غازی کا وزن شاید 20 سیر نہ ہوگا۔ وہ بیچارہ 20 سیر گندم کیسے پیستا اور پھر وہ تو پستولوں کے کھیل جانتا تھا، گندم کے دانوں کا کھیل تو اُسے آتا نہیں تھا۔ اُس نے گندم پیسنے سے انکار کر دیا۔ کوٹھڑی میں بند ہوا، ڈنڈا بیڑی پاؤں میں ڈالی گئی۔ کھلی ہتھکڑی سے ہر روز کئی گھنٹوں تک بندھا رہتا، ٹاٹ وردی پہنا کر اُسے گھنٹوں تک دھوپ میں کھڑا کیا جاتا۔ اُس کے منہ پر چپت رسید کئے جاتے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ بچارہ دو سال کے بعد چل بسا۔

لاہور کا شاہی قلعہ سیاسی لوگوں کے لئے قصاب خانے سے کم نہ تھا۔ یہی وہ منحوس جگہ تھی جہاں شری جے پرکاش نارائن اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو برف کے تودوں پر لٹایا گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پنجاب کے ایک انقلابی کے منہ پر گندگی کی پٹی باندھ دی گئی اور اُسے دھوپ میں بٹھا دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت ایک نوجوان کو اسی قصاب خانے میں لایا گیا۔ اُسے وہ مار دی گئی کہ بچارہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہا۔ اُسے ننگا کر کے کوڑے مارے گئے۔ اُس کے بدن میں

سوئیاں چبھوئی گئیں۔ رات رات بھر اُسے جاگنے پر مجبور کیا گیا۔ اُس کی ہتھیلیوں کو چارپائی کے نیچے رات رات تک دابا گیا۔ اُلٹا لٹکایا گیا۔ آنکھوں میں سرخ مرچیں ڈالی گئیں اور اس طرح برطانوی شہنشاہیت نے اپنے اخلاق کا ثبوت دیا...

ہری پور جیل میں ایک معصوم خدائی خدمت گار کو لایا گیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے سپاہیوں نے ننگا کر کے سڑکوں پر اتنا گھسیٹا کہ میرے بدن پر بے شمار چوٹیں آگئیں، اُس نے اپنی کمر دکھلائی جس پر ان گنت خراشیں تھیں۔ جیل میں اُسے کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ وہ بڑا شرارتی تھا۔ ہر وقت بغیر ضرورت کے کوٹھڑی میں نعرے لگا تا رہتا تھا اور خاص طور پر جب کوئی افسر کوٹھڑی کے آگے سے نکلتا تو اللہ اکبر اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر اُسے چڑا دیتا۔ ایک دن جیل داروغہ فضل دین نے غصہ سے اُس کے منہ پر زور سے چانٹا مارا، لڑکے نے جواب میں اُس کی موٹی توند پر لات ماردی اور پھر اس کے بدلے میں ہزاروں لاتیں برداشت کرنا پڑیں۔ جیل سپاہیوں نے اُسے خوب پیٹا، دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ کے سامنے اُس کی پیشی ہوئی۔ 50 بیدوں کی سزا کا فیصلہ ہوا۔ معصوم خدائی خدمت گار کو ٹکٹکی پر باندھ دیا گیا، جلادوں نے بید مارنا شروع کیئے۔ ہر بید پر وہ نعرہ لگا تا رہا۔ تیسرے بید پر وہ بے ہوش ہو گیا، جیل کے بید کم خطرناک نہیں ہوتے۔ اُس سے بدن کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں نوجوان بھارت سبھا پشاور کے ایک نوجوان کو بیس بید مارے گئے اور وہ ہر بید پر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا تا رہا۔ جب اُسے ٹکٹکی سے اُتارا گیا تو اُس کی رانوں سے خون کے دھارے بہہ رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ جیل سے جھگڑا کرنے پر مجھے ایک ماہ کے لئے کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ یہ کوٹھڑی بڑی چھوٹی اور اندھیری تھی۔ پاؤں پسار کر لیٹنا ممکن نہ تھا اور پھر کوٹھڑی کے اندر ہی ایک کونے میں پاخانہ کی ہنڈیا رکھی تھی، بھلا آپ سوچئے کہ تنگ اور تاریک کوٹھڑی اور بدبو بھلا کوئی بیمار نہ ہو تو کیا ہو؟ چند دن کے بعد مجھے بخار آگیا۔ لیکن جیل والوں نے کوٹھڑی سے نکالنے کی زحمت نہ کی، اس پر طرہ یہ کہ سزا کے طور پر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔ یہ ہتھکڑیاں صرف کھانے کے وقت عارضی طور پر اُتار دی جاتی تھیں۔

41ء میں جب میں گرفتار ہو کر پشاور جیل آیا تو مجھ سے قبل تو کچھ نوجوان جیل میں آچکے تھے۔ ایک دن غلطی سے یا جان بوجھ کر کسی نے ہم لوگوں کو شربت کے نام پر بھنگ پلا دی۔ زندگی میں

اس نعمت خداوندی سے مجھے پہلی بار روشناس ہونا پڑا۔ بجائے ایک کے دو گلاس پی لئے اور جب سر شریف جہاز کی طرح گھومنے لگا تو مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ شام کو ہمارے ایک ساتھی بھنگ کی ترنگ میں کسی سے لڑ پڑے اور غصے میں آ کر کوٹھڑی سے سر پھوڑ دیا۔ میرے ساتھ اِس جیل میں چونی لال کاوش بھی تھے۔ جو اُن دنوں فلمی کہانی کار تھے، اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ رات بھر وہ اپنے کسی معاشقے کی داستان دہراتے رہے۔ پہلے تو خوب ہنسے اور پھر رونے کی باری آ گئی اور روتے ہی چلے گئے۔ اپنی حالت کا تو کچھ علم ہی نہیں۔ تین دن تک بھنگ کا خمار رہا۔ اِس جیل میں میرے ساتھ لالہ جوالا داس دھون بھی تھے جو بڑے جاں باز اور دیش بھگت تھے۔ انہوں نے یہ راز کھول دیا کہ بھنگ جیل کے ایک بدمعاش نے پلائی تھی۔

اسیری نے سکھایا جذبہء وابستگی مجھ کو
میری زنجیر کے حلقے بھی آپس میں ملے آئے

☆☆☆☆☆

# پاگلوں کے ساتھ

پاگلوں کے لئے سرکار نے ملک کے اہم مقامات پر پاگل خانے بنا رکھے ہیں لیکن جس پاگل خانے کے بارے میں، میں کہہ رہا ہوں، وہ پاگل خانہ بھی ہے اور جیل خانہ بھی میرا مقصد پشاور سنٹرل جیل سے ہے۔ یہ جیل پرانی وضع کا بنا ہوا ہے اور اس کے ایک گوشے میں چھوٹا سا پاگل خانہ بھی ہے۔ جہاں وہ لوگ رکھے جاتے ہیں جو کسی جرم کی پاداش میں جیل میں آکر پاگل ہو جاتے ہیں۔ یا ایسا سنگین جرم کر بیٹھتے ہیں کہ انہیں پاگل خانے میں رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بھلے چنگے لوگ بھی پاگل خانہ کی زینت بنے۔ بات یوں تھی کہ آزادی کے جرم میں جب ہم کچھ ساتھی جیل میں لائے گئے تو ایک انوکھا طریقہ دیکھنے میں آیا۔ ان دنوں رواج تھا کہ جب کوئی حوالاتی یا قیدی پریڈ لگاتے تھے تو ہر آدمی اپنی چٹائی بچھا کر اور چوکڑی مار کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور جب جیل سپرنٹنڈنٹ کا قافلہ اُن کے قریب سے گذرتا تھا تو یہ بیچارے خاموشی سے اُن کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ اگر کسی نے جرات کر کے کوئی سوال کر دیا تو بس شامت ہی سمجھئے۔ جب ہم پشاور جیل پہنچے تو دوسرے دن معلوم ہوا کہ اگلے روز جیل خانے میں انسپکٹر جیل خانہ جات تشریف لا رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا جیل کے اندر صفائی ہونے لگی۔ قیدیوں کو سمجھایا گیا کہ وہ صاف ستھرے ہو کر پریڈ میں بیٹھیں لیکن کسی قسم کا کوئی سوال نہ کریں کوئی شکایت نہ کی جائے لہٰذا بارکیں دھوائی گئیں۔ احاطوں میں ''پوچے'' کرائے گئے۔ بیچارے قیدیوں نے کھانے کے برتن ریت سے گھس گھسا کر صاف کر دیئے۔ پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑوں کو دھو ڈالا، پسو اور کھٹمل اور جوؤں سے بھرے ہوئے کمبل بھی دھوپ میں ڈال دیئے گئے اور پریڈ کی پہلی شام کو قیدیوں سے کہا گیا، خبردار کوئی شکایت ہونے نہ پائے۔ سب قیدی چوکڑی مار کر خاموش بیٹھے رہیں۔ ہر آدمی دونوں ہاتھ اُٹھائے رکھے۔ یہ آخری بات ہمیں بری طرح کھٹکی، آخر اس کا مطلب

ہی کیا، بات سمجھ میں آ گئی۔ جیل والوں کو ڈر تھا کہ کہیں کوئی قیدی پتھر اُٹھا کر حملہ نہ کر دے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ جیل مظالم سے تنگ آئے ہوئے قیدی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں اور وقت پا کر جیل افسروں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہم چونکہ ابھی حوالاتی تھے اس لئے پریڈ لگانا ہمارے لئے زیادہ ضروری نہ تھا لیکن داروغہ جیل کا فرعونی حکم یہ تھا کہ ہم بھی اخلاقی مجرموں کی طرح بیٹھیں اور حکم کی تعمیل کریں۔

ہمارے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ انسپکٹر جنرل کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھکاریوں کی طرح بیٹھے رہیں۔ آخر ہمارا قصور ... ہم نے اُسی شام کو قیدیوں میں یہ پروپیگنڈہ کروا دیا کہ ہاتھ اُٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ تم ہی ہمارے خدا ہو۔ ہم تمہارے حق میں دُعا کرتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے جس کا پرچار ساری بارکوں میں ہو گیا۔ اور جب دوسرے دن صبح انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات جیل افسر کی حیثیت سے تشریف لائے تو قیدیوں کے تیور بدلے ہوئے دیکھے۔ کسی نے نہ تو ہاتھ اُٹھائے اور نہ ہی چوکڑی مار کر بیٹھے بلکہ ہر قیدی نے سوالات کا طومار باندھ دیا۔ شکایتیں زوروں پر ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد افسر واپس لوٹ گئے اور 12 بجے کے قریب داروغہ صاحب منہ پھیلائے، آنکھیں مٹکائے ہوئے آئے اور ہم سات آدمیوں کو ڈیوڑھی میں چلنے کے لئے کہا۔ یہ ایک لحاظ سے جیل سپرنٹنڈنٹ کے آگے ہماری پیشی تھی۔ جرم یہ تھا کہ ہم نے قیدیوں کو بہکایا اور شرارت کی۔ اتنی سی بات پر ہمیں ایک ہفتہ کے لئے پاگل خانے بھجوا دیا گیا اور کہا گیا کہ ہم پاگل خانے کی ''ٹوٹیاں'' (پانی کے نل) صاف کریں اور رات کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند ہوں۔ اب دیکھئے ذرا وہاں کی حرکت ... جونہی ہم نے پاگل خانے کی ''دہلیز'' پر قدم رکھا کہ ایک داڑھی والے صاحب نے ہمارا سواگت کیا اور جب احاطے کے اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پانی کے بہتے ہوئے نلوں کے نیچے مادرزاد ننگے جوان نہا رہے ہیں اور ہر جوان کے سر پر ایک قیدی نمبردار چھڑی لگائے کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ انہیں نہلایا جا رہا ہے اور انکار کرنے والے قیدی کو چھڑی سے پیٹا جاتا ہے۔ نہانے والے عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے۔ کوئی زور زور سے ہنس رہا تھا تو کوئی زار و قطار رو رہا تھا۔ کوئی نلوں پر پانی ڈلوا رہا تھا تو کوئی حضرت ... بیٹھ کر بہتے ہوئے نل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُن کے قریب سے گذر کر جب ہم ایک قیدی کے پاس آئے تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت 14 برس سے اسی پاگل خانے میں براجمان ہیں۔ قتل کے جرم میں انہیں عمر قید ملی ہے

اور جب تک اُن کا یہ پاگل پن ختم نہیں ہو جاتا، سزا کا دور شروع نہیں ہو گا۔ گویا یہ 14 برس یونہی کٹ گئے۔ اُن کا نام تھا ''مائی باپ''۔ یہ بظاہر درست معلوم ہوتے تھے اور انہوں نے بڑے اچھے انداز میں ہمارا سواگت کیا۔ اپنی کوٹھری میں لے گئے اور کہا بس یہی میرا غریب خانہ ہے، بیٹھیے، آپ چائے پی کر جایئے۔ بات کچھ عجیب سی تھی، جیل اور چائے وہ بھی کھلے بندوں لیکن جیل افسران ''مائی باپ'' سے ڈرتے تھے اور پھر طویل قید نے اُسے ہر ایک کا دوست بنا دیا تھا۔ اُس سے کوئی باز پرس نہیں کرتا تھا۔ مائی باپ نے ٹین کا ایک لوٹا آگ پر رکھ دیا، اور باتیں کرنے لگا۔ ہمیں بات چیت کے دوران میں ذرا بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ یہ پاگل ہے۔ ہم نے سوچا ہو سکتا ہے یہ بھی ہماری ہی طرح کا پاگل بنایا گیا ہو، مائی باپ نے جیل کی کئی باتیں سنائیں اور جب چائے اُبلنے لگی تو کہا ذرا میں نماز پڑھ لوں اور وہ چٹائی پر نماز پڑھنے لگا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ آخر یہ نماز کا وقت کونسا ہے، بہر حال خاموش رہے۔ مائی باپ نماز میں مشغول تھے کہ یکا یک اُس نے کہا'' کم بخت نماز غلط پڑھ گیا، دوبارہ پڑھتا ہوں۔ وہ پھر نماز میں مشغول ہو گیا۔ پھر اُس نے جھنجھلا کر کہا، لعنت ہے پڑھنے پر پھر نماز غلط ہو گئی۔ وہ پھر محو نماز ہو گیا اور ایک لمحہ کے بعد بگڑ کر بولا، آپ لوگ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ کیا کام ہے حرام زادو یہ باپ کا گھر ہے تمہارے اور پورے زور سے ہمارے ایک ساتھی کو چانٹا رسید کیا۔ ہم سب اُٹھ کر باہر کی طرف بھاگ نکلے۔ چائے کا اُبلتا ہوا ٹین کا ڈبا کوٹھڑی میں بکھر گیا۔ ہم بھاگے جا رہے تھے اور مائی باپ گالیاں بکتا ہمارے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ خود ہی کہیں دوسری طرف نکل گیا اور اس طرح ہم نے ایک پاگل سے نجات حاصل کی۔ یہ پہلی ملاقات تھی یک پاگل سے رات کو ہم الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کیے گئے لیکن نیند کہاں۔ پاگل رات کو جاگتا ہے، یہی اُس کے پاگل ہونے کی اصلی پہچان ہے۔ اب ذرا سنیے رات کی کہانی۔ ہماری پڑوسی کوٹھڑی سے آواز آئی۔

اوما جھے...... اُلو کے پٹھے...... کوئی سنا دے نہ گدل قوالی۔

مار دیا ما۔ یا ٹھہر کتے کے تخم۔ ابھی آتا ہوں اور ایک پاگل زور زور سے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

اُدھر سے کسی کے رونے کی آواز آئی اور پھر وہی آواز قہقہوں میں بدل گئی۔

اسی طرح رات بھر عجیب وغریب آوازیں سننے میں آئیں۔ صبح جب ہم کوٹھڑیوں سے باہر

نکلے اور ٹونیاں صاف کرنے کے لیے نلوں پر گئے تو پاگلوں نے ہمیں گھیر لیا۔کوئی کپڑے کھینچ رہا ہے تو کوئی بغل گیر ہو رہا ہے،کوئی گالیاں بک رہا ہے تو کسی نے پتھر اُٹھا لیا ہے۔ ہماری تو شامت ہی آ گئی۔ہم نے داروغہ جیل سے کہا۔

''ہم مشقت سے نہیں گھبراتے ہمیں سخت کام دے دیجیے،لیکن پاگلوں سے دور رکھیے۔''

جواب ملا..... ''ارے بھائی تم تو باغی ہو باغی آخر یہ بھی تمہارے بھائی ہی ہیں۔ذرا اِن میں بھی بغاوت پھیلا کر دیکھو۔''

اِس پاگل خانے میں 45 پاگل تھے اور 170 انتظام کرنے والے۔ پاگلوں کو جو دودھ ملتا تھا وہ رکھوالے کی بھینٹ ہو جاتا تھا۔اُن کی آدھی خوراک جیل اسٹاف کے گھروں کا اسٹاک بنتی تھی۔ پورے سات دن تک ہم پاگلوں کے ساتھ رہے۔اِس دوران میں ''مائی باپ'' سے ہماری دوستی ہوئی۔لیکن کبھی اُس کی کوٹھری میں نہ گئے۔وہ صرف اِس حد تک پاگل تھا کہ بار بار نماز کے چکر میں رہتا تھا اور اُدھوری نماز چھوڑ کر بھاگ اُٹھتا تھا،الطاف خاں نامی ایک پاگل سے بھی ہمارا واسطہ پڑا۔یہ میٹرک پاس تھا اور پروفیسر بننے کا شوق تھا۔یہ اِسی میں پاگل ہو گیا۔

اِن سات دنوں میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر جیل اسٹاف اور معالجہ کرنے والے ٹھیک طور طریقے سے پاگلوں کی نگہداشت کریں تو یہ بیچارے پاگل اِس مرض سے چھٹکارا حاصل کر سکتے تھے۔لیکن یہاں تو بھلے چنگے بھی آئیں تو پاگل ہو کر لوٹیں۔پاگلوں کی بھی کئی قسمیں ہیں،جیل میں ہمارے ساتھ ایک مدراسی ڈاکٹر قید تھے،سیاسی قیدی کافی عرصہ سے جیل میں تھے۔اُن میں بھی ایک کمی تھی وہ یہ کہ اگر کسی نے اُن کے فروٹ میں ذرا سا بھی ناخن چپکا دیا تو یہ حضرت فروٹ پھینک دیتے تھے اور ہم اکثر اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر فروٹ ہڑپ کر جاتے تھے۔

ہری پور سنٹرل جیل میں ہمیں ایک سکھ پاگل سے واسطہ پڑا۔وہ جب جیل میں لایا گیا تو اُس کا سارا بدن زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔بال بڑھے اور داڑھی لہرا رہی تھی۔حکومت نے اُسے باغی سمجھ کر پکڑا تھا۔یہ حضرت غیر علاقہ میں جا رہے تھے۔پولیس نے جی بھر کر بیچارے کی مرمت کی، آخر تنگ آ کر جیل بھجوا دیا۔ہم نے بھی اُسے پہچاننے کی پوری کوشش کی، پر وہ پاگل ہی نکلا۔حکومت نے اُسے چھوڑ دیا۔چند ماہ کے بعد پتہ چلا کہ پاگل سکھ کابل پہنچ گیا ہے اور وہاں سے روس جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔دراصل وہ پاگل نہ تھا،انقلاب کی راہ میں اُسے پاگل بننا پڑا۔اور جانے

ایسے کتنے پاگلوں سے حکومت کا واسطہ پڑا۔ ہاں تو بات تھی پاگل خانے کی.... سات دن تک پاگل خانے میں رہ کر ہم نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اور جب واپس اپنی بارک میں آئے تو معلوم ہوا کہ بے چارے قیدیوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہاتھ نہ اُٹھانے کے جرم میں اپنی کوٹھریوں میں بند کر دیئے گئے۔ اُن کو بیڑیاں پہنا دی گئیں اور چند ایک کو دوسری جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اُنہی دنوں ہم نے ایک نہایت افسوس ناک بات سنی۔ پاگل خانے کے ایک قیدی نے دوسرے قیدی کو قتل کر دیا۔ عید سے ایک دن قبل ایک نمبر قیدی رہا ہونے والا تھا۔ اُس نے نئے نویلے کپڑے پہن کر قیدیوں سے ملنا شروع کر دیا اور جب پاگل خانہ کے قریب پہنچا تو ایک پاگل بھاری ڈرمٹ سے سڑک کے پتھر کوٹ رہا تھا۔ وہ پہلے تو بڑے جوش سے بغل گیر ہوا اور پھر آن واحد میں بچارے قیدی کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک بچارے کا سر ''ڈرمٹ'' سے پھوڑ نہیں دیا۔ یہ دردناک موت انتہائی افسوس ناک تھی لیکن پاگل مسکرا رہا تھا اُس کی بلا سے۔

غریبوں کا بھی دُنیا میں اگر کوئی خدا ہوتا
تو سرمایہ پرستوں کے خدا سے کیا گِلہ ہوتا

☆☆☆☆☆

# جیل کی تنگ وتاریک کوٹھڑیاں......اور 26- جنوری

بات ان دنوں کی ہے جب سیاسی قیدی جیل میں 26- جنوری کا مقدس دن منایا کرتے اور اُس کی پاداش میں سنگین سزاؤں کو جھیلتے۔ وہ بھی کیا دن تھے ایک طرف جذبہ حب الوطنی، دوسری جانب جبر وتشدد۔ انگریزی حکومت جیل سے باہر بھی 26- جنوری کے دن منانے پر پابندی عائد کردیتی تھی تو بھلا یہ کیونکر ممکن ہوسکتا تھا کہ جیل کے اندر اِس دن کو منایا جائے۔ میری زندگی ـــــ میں ایسے کئی 26 جنوری کے دن آئے جب میں جیل میں ہوتا۔ لیکن چند یادیں اُن میں ایسی بھی ہیں جنہیں کسی صورت بھی بھلایا نہیں جاسکتا مثلاً 1931ء کا دور ۔ ہری پور سنٹرل جیل سیاسی قیدیوں سے بھرا پڑا تھا۔ اُن میں جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی، 13 برس کا ایک لڑکا بھی اور سو برس کا ایک بوڑھا بھی یہ تمام سیاسی قیدی سنگین مشقتیں کرتے تھے۔ چکی پیسنا، گراس چلانا، کمبل کتائی اور اور جو اس قسم کی مشقت سے انکار کرتا، اُس کو جیل کی تنگ وتاریک کوٹھڑی کا مہمان بننا پڑتا۔ اُن دنوں میں ایک دن وہ بھی تھا جسے 26- جنوری کہا جاتا تھا۔ ہم نے خفیہ طور پر پروگرام بنالیا کہ صبح اُٹھتے ہی جب مشقت کے لئے اکٹھے ہوں تو اُس وقت آزادی کا جھنڈا لہرایا اور آزادی کے حلف نامے کو دہرایا جائے لیکن سوال تھا کہ جھنڈا کہاں سے آئے، کچھ وچار کے بعد جھنڈے کا مسئلہ حل ہوگیا۔ جیل کے رنگ گھر سے ایک چادر کو دو رنگوں میں رنگ لیا گیا لیکن یہ کام بڑی خاموشی اور پوشیدہ طریقے سے ہوا۔ دوسرے دن جب صبح آفتاب کی سنہری کرنیں جیل کی سلاخوں سے ٹکرانے لگیں اور قیدی قطار در قطار اپنے اپنے احاطوں سے باہر آکر اکٹھے ہوئے تو اچانک ایک آواز آئی، بھارت ماتا کی جے۔ ..اور اس کے ساتھ ہی بے ترتیب رنگوں سے بنا ہوا جھنڈا لہرادیا گیا۔ قیدیوں نے حلف نامہ بھی پڑھ لیا۔ اُسے پڑھنے والے تھے ایک بوڑھے خدائی خدمت گار۔ انہوں نے جلدی جلدی حفف نامہ پڑھ لیا۔ دراصل اِس حلف نامے کی عبارت

بالکل وہ تو نہ تھی جو راوی کی اٹھتی ہوئی موجوں کے سامنے پڑھی گئی تھی کیونکہ نئی حلف نامہ آتا کہاں سے البتہ اس کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا۔

''ہم عہد کرتے ہیں کہ آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے''۔ اس حلف نامے کے بعد نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کی آوازیں سنائی دیں اور سب کام 5 منٹ کے اندر ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیل وارڈوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جیسے ہم نے بہت بڑا جرم کیا ہو۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب یہ حلف نامہ لے کر داروغہ جیل لالہ حکم چند نے غصے سے ڈنٹ پھینکتے ہوئے کہا، یہ جھنڈا کس نے لہرایا ہے تو ایک 13 سالہ لڑکے نے آگے آ کر کہا میں نے لہرایا ہے یہ جھنڈا داروغہ صاحب کا مضبوط ہاتھ اُس کے نرم و نازک گالوں پر یوں جم گیا جیسے جیل اسٹاف مجرم کی پانچوں انگلیاں سیاہ رنگ سے کاغذ پر لگواتا ہے ور پھر اتنا ہی نہیں بوڑھے خدائی خدمت گار کو بھی آزادی کی پاداش میں تنہائی کی کوٹھڑی کا مہمان بننا پڑا۔ باقی تمام قیدی مختلف سزاؤں سے نوازے گئے اور اس طرح سے ہم نے جیل میں 26 جنوری کا دن منایا دوسری بار 26 جنوری کا دن اس اہتمام سے منایا گیا کہ جیل افسران بھی دنگ رہ گئے۔ یہ بات بھی کوئی 26 برس پہلے کی ہے۔ اب کے قیدیوں نے چپکے چپکے فیصلہ کر لیا تھا کہ 26 جنوری کا دن بڑے تزک و اہتمام سے منایا جائے گا۔ کئی دن جیل میں چوری چھپے پروگرام بنتے اور بگڑتے رہے۔ یہ بات بریلی پور سنٹرل جیل کی ہے۔ 42ء کی تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کئی انقلابی جیل میں پہنچ چکے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں بھاگلپور کا ایک نوجوان بھی تھا جو سات برس کی قید بھگت رہا تھا۔ وہ ہندوستان کی کئی جیلوں میں رہ چکا تھا۔ وہ کسی جیل میں بھی کچھ ماہ سے زیادہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی فطرت میں ہنگامے تھے۔ وہ اسی لئے جیل کے اندر ہنگامے کرتا تھا۔ اب کے 26 جنوری کا سارا پروگرام اسی نوجوان کی پیش قدمی سے بن رہا تھا۔ وہ جدت طراز بھی تھا، لہٰذا 25 جنوری کی رات کو فیصلہ کیا گیا کہ چند نوجوان قیدی اپنے ننگے بدن پر لال رنگ پوت کر سرخ پوش بن جائیں اور جب صبح جھنڈا لہرانے کی رسم ہو تو لنگوٹ باندھ کر سرخ جھنڈے کو سلامی دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صبح دن چڑھتے ہی میری بارک نمبر 27 کے تمام سیاسی قیدی اپنے احاطے میں اکٹھے ہوئے اور بیرک کی چھت پر کھڑے ہو کر ایک نوجوان نے آزادی کا پرچم لہرایا۔ سرخ پوشوں نے سلامی دی اور اقبال کا ترانہ ''ہندوستان ہمارا'' گا کر اس

مقدس دن کو منایا لیکن یہ پروگرام بہت ہی مہنگا پڑا۔ ننگے بدن سرخ پوشوں کو کوڑے لگائے گئے۔ بھ گلپور کا نوجوان ہتھکڑیوں سے جکڑا ہوا دوسری جیل میں لے جایا گیا۔ اُن بیرک میں 57 قیدی رہتے تھے۔ اُن میں سے 15 آدمیوں کو ایک ایک ماہ کی تنہائی کوٹھڑی دی گئی۔ 9 قیدیوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔

تیسری بار 26 جنوری اُس وقت منائی گئی جب عبدالغفار خان جیل میں تھے۔ اُن دنوں جیل میں سیاسی قیدیوں کی بھرمار تھی لیکن ورکر اور لیڈر جیل کے مختلف حلقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ نظر بندوں کی بیرک قیدیوں سے الگ تھلگ تھی۔ ہمارے گروپ کا خیال تھا کہ اب کی بار بادشاہ خان کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا جاوے۔ لہذا ہم نے اس سلسلہ میں خان بابا سے بات چیت کی لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا۔ ہماری اسکیم کا پتہ وقت سے پہلے ہی چل گیا۔ جیل والوں کو کسی نے کہہ دیا کہ اس بار 26 جنوری کو قیدی ہلڑ مچائیں گے اور جیل کے اندر ہنگامہ آرائی ہوگی لہذا جیل والوں نے پہلے ہی سے پیش بندیاں شروع کر دیں اور انہوں نے سیاسی قیدیوں پر کڑی نگرانی شروع کر دی، اور ہمیں بھی اس بات کا مختلف حلقوں سے پتہ چلتا رہا۔ لیکن ہم نے تہیہ کرلیا کہ ہر صورت میں یہ مقدس دن منایا جائے گا۔ میں جس احاطے میں نظر بند تھا، وہیں بادشاہ خان تشریف فرماں تھے۔ جب میں نے اُن سے جیل والوں کی پیش بندیوں کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا سیاسی قیدیوں کو چاہیے کہ اگر وہ ایک جگہ اکٹھے نہ ہوسکیں تو اپنی اپنی بارکوں میں تو اس دن کی یاد تازہ کرلیں اور اپنے آپ ہی آزادی کا حلف نامہ دہرائیں اور ایسا ہی ہوا۔ 25 جنوری کی رات کو ہمیں معلوم ہوگیا کہ کل صبح بارکیں نہیں کھلیں گی۔ گویا 26 جنوری کا حلف آزادی سلاخوں کے پیچھے ہی دہرایا جائے گا۔ ہر بیرک کے باہر جیل کے داروغہ کھڑے ہوگئے اور وہ ہماری نقل وحرکت کو دیکھنے لگے۔ رات ہم نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی بھارت ماتا کی جے سے بارکیں گونج اٹھیں۔ انقلاب زندہ باد سے فضائیں گونج اٹھیں۔ قیدیوں نے اونچی آواز میں آزادی کا حلف نامہ دہرایا اور بادشاہ خان کی موجودگی میں ہم نے بھی قسم کھائی کہ آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دیں گے۔ اس دن کی تقریب یوں تو بڑے صبر وتحمل سے گذر گئی لیکن دوپہر کو پتہ چلا کہ بیرک نمبر 9 کے قیدی جب حلف نامہ دہرا رہے تھے تو باہر کھڑے ہوئے جیل کے وارڈن بھی زیر لب گنگنا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی آزادی کے اس پاس کردہ حلف نامہ کو خاموشی سے دہرا رہے

تھے لیکن دوسرے دن پتہ چلا کہ ان بے چاروں کو بھی دوسری جیل میں بھیج دیا گیا ہے کیونکہ وہ غلامی کی حنت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کچھ بھی ہو، جیلوں میں اس تقریب کو مناتے ہوئے خوشی ہوتی تھی، بے انتہا خوشی۔

☆☆☆☆☆

# بیچاری پولیس

پولیس کے نام سے آدمی کو پسینہ آنے لگتا ہے۔ جہاں لال پگڑی دیکھی وہاں دم خشک ہوا حالانکہ آزاد ملکوں کی پولیس پریشان زدہ جنتا کے لئے رحمت خداوندی سے کم نہیں ہوتی۔ دکھوں میں گھبرایا ہوا انسان جب پولیس کے مرکز تک پہنچ جاتا ہے تو فرطِ مسرت سے جھومنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں اُسے انصاف ملے گا۔ اُسے پناہ ملے گی اور ایک ہمارا ملک بھی ہے جہاں خاکی وردی اور لال طرہ نظر آیا، دم گھٹنے لگا۔ میرا مطلب آج کی پولیس سے نہیں، بات انگریزی دور کی ہے جب ہم پولیس سے اٹھکیلیاں کرتے تھے جب آنکھ مچولی ہوتی تھی۔ ادھر بم پھٹا، اُدھر پولیس دم دبا کر بھاگی، پگڑی کہیں اور چپل کہیں ور اگر کسی مقام پر بیچارے سپاہی کو برسوں کے بعد زنگ آلودہ بندوق چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ ہاتھوں میں ہی تھرک کر رہ گئی۔ مجھے پولیس کے ایسے نہ جانے کتنے سورماؤں سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پولیس والے بڑے بزدل ہوتے ہیں یا ڈرپوک۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ہاں تو بات ہے اُس دور کی جب آزادی کی تحریک جوبن پر تھی۔ پولیس اور خفیہ سی۔ آئی۔ ڈی والے انقلابیوں کے ساتھ یوں چمٹے رہتے تھے جیسے گوشت کے ساتھ ناخن
چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

سبھاش بابو کے فرار کے بعد پشاور کی پولیس بڑی سرگرمی سے اُن لوگوں کو پکڑنے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی جن کا تعلق اس فرار سے ہو سکتا تھا۔ خیر وہ بیچاری اصل آدمیوں کو کیسے پکڑتی، البتہ بے گناہوں کو پکڑ کر جیل میں ڈالنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ پولیس میرے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے اور کسی دن گردن دبوچ لے گی۔ اُدھر میں نے پہلے ہی سے بھاگنے کا منصوبہ باندھ رکھا تھا۔ ایک دوپہر کو پولیس نے میرا وہ مکان گھیر لیا جس میں میرا ٹھکانہ تھا۔ یہ مکان بازار

سے بچ میں تھا سرِ عام۔ جب میں نے پولیس کو دیکھا تو سوچنے لگا کہ اب کیسے بچ نکلوں۔ دروازہ اندر سے بند تھا، میں نے اوپر سے آواز دی ٹھہرو، دروازہ کھولتا ہوں اور بجائے نیچے کی طرف جانے کے اوپر کی طرف چلا گیا۔ اور دیوار پھلانگ کر مکان کی دوسری طرف نکل گیا۔ بچارے سپاہی میرا انتظار کرتے رہے۔ میں چپکے سے اپنے مکان کے سامنے والے مکان میں چلا گیا جہاں عام طور پر میرا ٹھکانہ ہوتا تھا۔ اس بڑے مکان کے ایک کمرے میں پولیس کا ایک سپاہی رہتا تھا۔ میں اس کے مکان میں چلا گیا۔ وہ تو گھر پر نہیں تھا البتہ گھر والی موجود تھی۔ وہ میری حرکتوں کو جانتی تھی۔ کہنے لگی کیا کر رہے ہو، وہ دیکھو مکان کے نیچے پولیس کھڑی ہے۔ اگر دیکھ لیا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں میں تھوڑی دیر کے بعد چلا جاؤں گا۔ اتنا کہہ کر میں کمرے میں بیٹھ گیا۔ کمرے کے باہر کھڑکی کے آگے چلمن لٹک رہی تھی۔ میں اس سے پولیس کو دیکھنے لگا۔ کافی انتظار کے بعد تھانے دار صاحب نے دروازہ توڑا اور اپنی فوج کو لے کر اوپر چڑھ گئے۔ کمرے کی تلاشی لی، ایک ایک چیز کو الٹا پلٹا گیا اور نیچے اتر آئی۔ البتہ چند سپاہیوں کو پہرے پر بٹھا دیا۔ تھانے دار صاحب مایوس واپس لوٹے۔ میں یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک سپاہی نمودار ہوا خاکی وردی لال پگڑی۔ ارے تم یہاں؟ سپاہی نے مجھے دیکھتے ہی کہا

اور میں نے جواب دیا بھائی کے گھر میں خطرہ ہی کیا ہے۔ وہ ہنس کر کہنے لگا مجھے مرواؤ گے کیا نیچے اب بھی بیچاری پولیس تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ خیر جوں توں کر کے میں وہاں سے نکل پڑا اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہیں سے کہیں چلا گیا۔ جب رات ہوئی تو میرے لئے بھی یہ ضروری ہو گیا کہ ایک بار اپنے مکان میں جا کر وہ کاغذات نکال لاؤں جن کا وہاں ہونا ٹھیک نہیں اگر وہ کاغذات پولیس کو مل گئے تو نہ جانے کتنوں کا بیڑا غرق ہو جائے، میں نے فیصلہ کیا۔ کچھ بھی ہو آج ہی رات کو جاؤں گا۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں مکان کی طرف آیا دیکھا، تو پولیس کے دو سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ اُن کی موجودگی میں دروازہ کھولنا آسان نہ تھا، دروازہ ویسے تو اب نام کے لئے ہی کھڑا تھا کیونکہ تھانے دار صاحب نے اُسے توڑ ڈالا تھا، اُس وقت رات کے 11 بج رہے تھے، دکان دار گھروں کو جا چکے تھے۔ میرے مکان کے نیچے والا نانبائی دوکان بند کر رہا تھا، جونہی میں اس کے پاس پہنچا تو اُس نے پولیس کی طرف اشارہ کیا۔ چند منٹوں میں ہی سپاہی وہاں سے چل دیئے۔ میں بے کھٹکے مکان کے اوپر چلا گیا۔ اندھیرے میں ہی کاغذات کا پلندہ نکالا، اندر

آتش کیا اور واپس لوٹ آیا۔ دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ سپاہی مہاراج تشریف لے آئے۔ وہ دونوں بیڑی لینے کے لئے کسی دوکان پر چلے گئے تھے اور جب انہیں پتہ چلا کہ میں مکان سے باہر نکل گیا ہوں تو بیچارے بڑے تملائے اور پھر میں کئی مہینوں تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ایک دن پھر پولیس کے چکر میں آ گیا۔ پولیس والوں کو معلوم ہوا کہ آج رات میں فلاں صاحب کے مکان پر آؤں گا۔ لہٰذا مقررہ وقت پر پولیس کا جمگھٹا وہاں پہنچا لیکن اسے یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ میں اُسی مکان کے قریب والے مکان کی چھت پر چھپا پولیس کی کارگزاریاں دیکھ رہا تھا۔ بیچاری پولیس تھک ہار کر ایک امیر زادے کی کوٹھی میں چلی گئی۔ وہاں تھانے دار صاحب نے شراب کے جام اُڑانا شروع کر دیئے۔ امیر زادہ اور تھانے دار صاحب کا آپس میں دوستانہ تھا، عجیب بات ہے کہ میری نظروں کے سامنے پولیس والے جام شراب اُڑا رہے تھے۔ مکان کو گھیر رکھا تھا اور میں اُن کی چھاتی پر مونگ دل رہا تھا۔ امیر زادے کے برخوردار میرے سیاسی دوست تھے، انہیں میری موجودگی کا علم تھا۔ معلوم ہوا کہ شراب کا پروگرام اُسی نے بنایا تھا تاکہ پولیس دریائے شراب میں غوطے کھاتی رہے اور میں اپنا اُلو سیدھا کرتا رہوں۔

قریباً آدھی رات کے میں وہاں سے چل آیا اور بیچاری پولیس اس بار بھی ناکام رہی۔

راولپنڈی سے ایک بار بالشویک نامی پوسٹروں کا پلندہ لے کر میں پشاور شہر کے ایک اسٹیشن پر اُترا، پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس کاغذوں کا پلندہ ہے۔ اُدھر میں بھی اُن کی نیت بھانپ گیا۔ لہٰذا جب گاڑی سے اُترا تو خالی ہاتھ، پولیس والے میرے تعاقب میں تھے اور میں خالی ہاتھ پلیٹ فارم سے باہر نکل گیا اور پیدل ہی چل پڑا۔ آخر سپاہی نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ جناب وہ کاغذ کہاں ہیں؟ کاغذ؟ کیسے کاغذ۔ میں نے کہا اور وہ حضرت اپنا سا منہ لے کر میرے گھر تک چپ سادھے پیچھے پیچھے آتے رہے۔ کاغذات مجھ سے پہلے ہی محفوظ مقام تک پہنچ چکے تھے۔

جنم اشٹمی کی رات تھی۔ میرے محلے کے ایک مندر میں کرشن جنم کا پروگرام منایا جا رہا تھا کہ اچانک مندر کے صحن میں چند کاغذات گرے۔ یہ انقلابی پرچے تھے جسے ایک پولیس والے نے اُٹھا لیا۔ دوسرے دن صبح میرے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پرچے تو نہ مل سکے لیکن پولیس نے گھر اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ اتنے میں انسپکٹر صاحب نے کہا اچھا اتنا بتاؤ کہ وہ پریس کہاں ہے جس پر یہ پرچے

چھپتے ہیں۔ میں نے جواب دیا، انسپکٹر صاحب میں ایسے بیکار کام نہیں کیا کرتا۔ آپ بے تکلفی سے ہر چیز کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ جب مایوس ہو کر انسپکٹر صاحب واپس چلے گئے تو میں نے نمک مرچ کی صندوقچی کو باورچی خانے سے اُٹھا کر کام میں لانا شروع کر دیا۔ اس صندوقچی کے پیندے میں بھر تو پریس بنا ہوا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میرے ایک دوست خفیہ طور پر کہیں سے کارتوس لائے تھے۔ جس وقت ایک انسپکٹر نے اُسے پکڑا تو اُس کے پاس سائیکل تھی۔ دوست نے سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی اور اپنی جامہ تلاشی دے دی۔ وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ انسپکٹر نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے سائیکل خود اُس کے حوالے کر دی۔ حالانکہ کارتوس سائیکل کی گدی میں پڑے تھے اور خود ایک بار میں نے ایسا کیا۔ مجھے اسلامیہ کالج پشاور سے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ الزام یہ تھا کہ میں کالج میں خفیہ پوسٹر بانٹنے جا رہا ہوں۔ اُس وقت میرے پاس جو سائیکل تھی، اُس پر سگریٹ کے چند بڑے بڑے پیکٹ تھے۔ میں نے پولیس کی مرضی سے وہ پیکٹ مرچنٹ کو دے دیئے۔ بیچارے سپاہی کو یقین تھا کہ سگریٹ کے ڈبے فروخت کرنا میرا عارضی روزگار ہے۔ اس لئے میں نے مداخلت نہ کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان ڈبوں میں ہی پوسٹرز تھے۔

خفیہ پوسٹروں کے دنوں میں پولیس نے ایک لڑکے کو گرفتار کر لیا۔

جب اُسے بمعہ پوسٹرز کے عدالت میں پیش کیا گیا تو اُس نے ڈرتے ہوئے کہا، جناب میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا حقیقت ہے۔ مجھے ایک راہ چلتے ہوئے آدمی نے ایک آنہ دیا اور کہا یہ پوسٹر لگا دو۔ سرکار اگر میں جانتا تو پوسٹر کو اُلٹا کیوں لگاتا۔ یہ بات درست تھی۔ جب اُسے پکڑا گیا تو وہ پوسٹر اُلٹا چسپاں کر رہا تھا۔ پولیس نے شہادت دیتے ہوئے اس بات کا تذکرہ کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکا انقلابی گروہ کا ایک سرکردہ رکن تھا۔

پولیس کے ایسے واقعات انقلابی تاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزی دور کی پولیس کبھی آسانی سے کسی اصلی مجرم کو نہیں پکڑ سکی۔ ناکامی کی صورت میں وہ جھوٹے مقدمے بنایا کرتی تھی۔ مجرم کھلم کھلا اُن کی چھاتی پر مونگ دلتے اور بے گناہ جیل کی چار دیواری میں دن کاٹتے تھے۔

بڑے بڑے سازش کے مقدمے پولیس کے لئے دردِ سر بن جایا کرتے تھے۔ میں نے جیل کی زندگی میں ایسے کئی واقعات دیکھے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا اور کئی بار یوں بھی ہوا

کہ مجرم جیل میں آیا اور پولیس کی کمزوری سے رہا ہو کر چلتا بنا۔ ایک بار پشاور کی پولیس کے ایک سردار صاحب کو اس بناء پر جیل میں ٹھونس دیا گیا کہ وہ سرحد اور افغانستان کے درمیان انقلابیوں کے لئے جاسوسی کرتے تھے۔ سردار صاحب آتے ہی نیم پاگل ہو گئے اور لگے واہی تباہی بکنے۔ آخر پولیس نے انہیں تنگ آکر چھوڑ دیا کہ کوئی پاگل پکڑ لیا گیا ہے۔ رہائی کے بعد انقلابیوں کی ایک چٹھی پولیس دفتر میں آئی جس میں لکھا تھا کہ دیکھا ہمارا شیر تمہیں بدھو بنا کر جیل سے بھی نکل آیا ہے۔ یوں تو پولیس تیس مار خاں سے کم نہیں ہے لیکن جھوٹے منصوبے بنانے میں بعض اوقات پولیس کی ناکامی کا سبب سی۔ آئی۔ ڈی بھی ہوتی تھی۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پولیس اور سی آئی ڈی والوں میں شروع ہی سے رسہ کشی چلی ہے۔ دونوں اس کوشش میں رہتے تھے کہ انقلابیوں کی گرفتاری ان کے ہاتھوں ہو۔ پشاور کے ایک پولیس ورکر میری بار بار کی گرفتاریوں سے ہی اچھی پوزیشن لے گئے تھے۔

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

(حسرت)

☆☆☆☆☆

# نظر بندی

نام کتنا عجیب ہے۔ نظر بندی  لیکن یہ بھی قید سے کسی طرح کم نہیں۔ قیدی کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ میں فلاں دن جیل کے جہنم سے آزاد ہو جاؤں گا لیکن بیچارے نظر بند کو یہ سہولت کہاں نصیب  برسوں جیل کی چار دیواری کے پیچھے تڑپتا رہتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم میں نظر بندی کا یہ عالم تھا کہ سرکار کو نئے نئے جیل اور کیمپ بنانے پڑے۔ اُن میں جھگی والے سے لے کر بڑے نیتا تک انگریزی عتاب کا شکار ہو رہے تھے۔ یو پی کیمپ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہاں سب کے سب نظر بند ہی تھے۔ ہر خیال کے نظر بند۔ سوشلسٹ اور کیمونسٹ زیادہ تھے۔ نظر بندی کے چکر میں مجھے بھی لگ بھگ پانچ برس تک رہنا پڑا یعنی اتنی طویل زندگی مجھے جیل میں ہی گذارنا پڑی۔ 24 مئی 1941ء کی نصف رات کو مجھے پکڑا گیا جبکہ میں پشاور سے باہر جانے کی سوچ رہا تھا۔ اُس رات پشاور کی پولیس نے میرے گھر کو گھیر لیا تھا۔ میں وہاں سے نکل کر پشاور کی تحصیل گور گھٹڑی سے گذر رہا تھا کہ اچانک مجھے سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر نے آ پکڑا اور مجھے کوتوالی جانا پڑا۔ اُسی دن سے میری جیل بندی شروع ہو جاتی ہے۔ جب مجھے پشاور سنٹرل جیل لے جایا گیا تو اس سے قبل میرے چند ساتھی یہاں تشریف لا چکے تھے جن میں لالہ جوالہ داس دھون (مرحوم) کامریڈ دوارکا ناتھ باغی، چونی کا دش، میاں احمد شاہ بیرسٹر، سردار سرن سنگھ وغیرہ۔ یہ سب ساتھی جیل کی ایک لمبی بارک میں بیٹھے اپنے مستقبل پر غور کر رہے تھے۔ ہر آدمی کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر سیاسی مجرم تھے۔ مجھے دیکھتے ہی احمد شاہ بیرسٹر نے کہا

چلو اچھا ہوا تم آ ہی گئے ورنہ پولیس تمہاری وجہ سے نہ جانے دوسرے لوگوں پر کتنے ستم توڑتی

میں نے جواب دیا میاں صاحب  اب آرام سے زندگی کے باقی دن جیل میں کاٹیں گے

اب تو یہ سوچو کہ کونسی گولی سے اُڑائے جاؤ گے  تم نے بھی سبھاش بابو کے فرار میں امداد کی

ہے۔ میں سوچنے لگا واقعی اب رہائی ممکن نہیں۔ نہ جانے اب کیا ہو۔ مجھے ابھی تک بھی یہ معلوم نہ تھا کہ جیل میں ہماری پوزیشن کیا ہے۔ جیل میں اُنہی دنوں حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی بھی موجود تھے۔ اُن سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ایک رات اچانک میں اور میاں احمد شاہ بیرسٹر پولیس کی حراست میں جیل سے باہر لیجائے گئے نامعلوم مقام پر پشاور چھاؤنی ریلوے اسٹیشن سے گاڑی پر سوار ہوئے، ہمارے ساتھ پولیس کے دس سپاہی، ایک تھانے دار اور سی۔آئی۔ڈی کے کچھ ورکرز تھے۔ جب آدھی رات ہوئی تو ہمیں پلیٹ فارم پر لایا گیا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ ہمارا قافلہ ہری پور سنٹرل جیل جا رہا ہے۔ یہاں سے گاڑی بدلنی تھی۔ دوسرے دن صبح ہی ہم جیل کے پھاٹک پر پہنچے۔ جیل والوں نے خلاف توقع ہمارا استقبال کیا۔ بڑی عزت سے سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا۔ داروغہ جیل ہمارے ساتھ یوں پیش آیا جیسے کوئی غلام ہوتا ہے۔ کچھ میں نہ آیا کہ بات کیا ہے۔ جیل والوں کا یہ انوکھا انداز دوزخ بات بات میں پھولوں کی مہک آخر پتہ چلا کہ ہم دونوں سنٹرل گورنمنٹ کے نظر بند ہیں۔ ہمارا تعلق صرف وائسرائے سے ہے۔ دفعہ نمبر 26 کے ماتحت ہم جیل میں رہیں گے۔ ہمارے ساتھ شاہی قیدیوں جیسا سلوک ہوگا۔ بستر، چارپائی، کپڑے، کتابیں، خوراک اور ہر طرح کا آرام میسر ہوگا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں میاں صاحب نے مجھ سے کہا، بیٹا اب مزے ہی مزے ہیں ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف لے آئے۔ مصافحہ کیا اور فرمایا کہ آپ خلاف توقع یہاں لائے گئے ہیں۔ سردست ہمارے پاس کوئی بہتر کمرہ تو نہیں ہے۔ دو تین دن آپ کو تکلیف ہوگی پھر خوبصورت کمرے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ سپرنٹنڈنٹ کا نام تھا مہتاب دین۔ مہتاب دین نے داروغہ سے کہا آپ انہیں فلاں فلاں جگہ دکھا دیں جو انہیں پسند ہو وہاں ان کی رہائش کا بندوبست کر دیا جائے۔ لاتنے میں ہمارے لئے چائے، توس اور مکھن لایا گیا اور پھر ہم دونوں داروغہ صاحب کی قیادت میں جگہ دیکھنے کے لئے جیل کے اندر گئے۔ ہمیں صرف ایک جگہ پسند آئی۔ وہ تھا ایک بڑا سا احاطہ جس میں سیمنٹ کی چکی اور عمدہ کوٹھڑیاں تھیں۔ سب کی سب خالی۔ آگے بہت بڑا میدان۔ بے ترتیب گھاس، معلوم ہوتا تھا کہ برسوں سے یہاں کوئی قیدی نہیں رہا گیا۔ بہر حال یہ جگہ ہم نے پسند کرلی۔ داروغہ کے اشاروں پر قیدیوں کا ایک جمگھٹا گھاس اُکھاڑنے اور صفائی کے لئے آ گیا۔ دو گھنٹے کے بعد جگہ ترتیب میں آ گئی اور ہمارے دیکھتے

ہی دیکھتے لوہے کی دو چار پائیاں، بستر، مچھر دانی، رسوئی کا مکمل سامان، میز، کرسی، پنکھا اور نہ جانے کیا کیا پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔ میاں صاحب! یہ نظر بندی ہے یا شادی مسکرا کر کہنے لگے۔ قربانی کا بکرا۔ عید سے پہلے برسوں تک بکرے کی پرورش کی جاتی ہے اور وقت پر اُسے خنجر تلے رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی حال ہمارا ہوگا۔ بھائی اب کرلو مزے چند دن۔۔ ۔اور میں سوچنے لگا۔ چار ماہ تک تو پشاور جیل میں تھے، وہی قیدیوں والی خوراک، چوری چھپے کی چائے، کوٹھری میں بند اور یہاں کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ واقعی دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ ساری کروفر، ساری شان و شوکت ایک دن رنگ لاکر رہے گی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یہ سب کچھ دیکھنا پڑا۔ اس سے قبل تک وہ تاریک کوٹھڑی ہی نصیب ہوتی، مار پیٹ الگ اور آج یہ ٹھاٹ۔۔۔۔۔ ع

رنگ لائے گی ہماری عیش و عشرت ایک دن

شام کے قریب داروغہ صاحب تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ چار قیدی تھے۔ فرمانے لگے۔ یہ قیدی آپ کی خدمت کے لئے ہیں دو باورچی اور دو خدمت گار اور چلتے ہوئے انکساری سے کہا میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بوالیے کیجیے۔ اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ داروغہ جیل اور خدمت۔ خیر وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ پہلے ہم قیدی ہوتے تھے اور آج شاہی نظر بند اور وہ بھی سنٹرل گورنمنٹ کے خدا سلامت رکھے وائسرائے بہادر کو کہ اس درجہ پر پہنچا دیا۔ یہ رات بڑے لطف کی گذری۔ 9 بجے کھانا تیار ہو گیا، کھانا میز پر رکھ کر باورچی نے کہا۔ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو بڑے صاحب سے نہ کہیے گا ورنہ وہ میری کھال تک اُدھیڑ دے گا۔ آپ بے شک ہمیں ڈانٹ لیجیے گا۔ ہم اب آپ کے زیر سایہ آگئے ہیں۔ باورچی کے اس انداز سے یوں پتہ چلتا تھا کہ خدا آپ کو برسوں تک جیل میں ہی رکھے اور ہم آپ کے زیر سایہ رہیں۔ ہم نے کہا یہاں سب ایک ہیں۔ تم اپنے کو الگ نہ سمجھو۔ کسی بات کی فکر نہ کرو، جاؤ تم بھی کھانا کھالو کھانے کے بعد اُس رات ہم نے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ میاں صاحب خوش باش طبیعت کے مالک تھے چھوٹی آنکھیں اور اُس پر چھوٹی آواز، وہ روس کی یاترا کر چکے تھے۔ رہائی کے بعد [illegible] اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ کمیونسٹ خیالات کے تھے اور سرحدی [illegible] ترقی پسند تحریک میں پیش پیش رہے۔ وہ ایک برس تک ہری پور جیل میں میرے ساتھ نظر بند رہے۔ وقت خوب کٹتا تھا۔ جب [illegible]

واپس بھیج دیئے گئے تو میں اکیلا اس بڑے احاطے میں رہ گیا۔ میں اور میرے ساتھی خدمت گار دونوں عمر قید تھے۔ رام لبھایا اور محمد کریم، دونوں نے قتل کیا تھا۔ رہائی کے بعد رام لبھایا کمیونسٹ خیالات کا ہو گیا، محمد کریم بیچارہ جیل میں ہی مر گیا۔ ایک دن دونوں خدمت گار میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے کہ جیل کا داروغہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ انہیں دیکھتے ہی بھڑک اٹھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ لوٹ گیا۔ دونوں کو دفتر میں بلوایا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان بیچاروں کا میرے ساتھ کھانا کھانا ایک خطرناک جرم ہے۔ ایک تو میں سیاسی نظر بند اور وہ اخلاقی قیدی۔ دوسرے وہ اپنی خوراک سے علاوہ میری خوراک میں کسی صورت بھی شریک نہیں ہو سکتے۔ جیل کے قانون کی نظروں میں یہ جرم ہے۔ عجیب بات ہے جو باورچی کھانا تیار کرے وہ خود اپنا منہ دیکھتا رہ جائے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ بہر حال میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے اُن کے کھانے کی رسمی اجازت لے لی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خود داروغہ صاحب ہر روز شام کو میرے پاس آتے اور شربت کا ایک گلاس شیر مادر کی طرح حلق سے اُتار لیتے۔ کئی بار میرے ساتھ چائے میں شریک ہوئے۔ خود سپرنٹنڈنٹ جیل کے بچے میرے ساتھ آکر کھانا کھایا کرتے تھے۔ یہاں قانون کی کوئی پابندی نہ تھی۔ چونکہ میں اکیلا نظر بند تھا اس لئے بے حد پریشانی تھی۔ میری خواہش پر مہتاب دین نے ہری پور سے ایک معزز زمیندار تاج محمد کو میرے احاطے میں بھجوا دیا۔ تاج محمد ایک قتل کے جرم میں دس برس کی سزا کاٹ رہا تھا۔ خوبرو نوجوان، زندہ دل، صحت مند اور ملنسار۔ وہ بی کلاس کا قیدی تھا۔ قانونی طور پر خوراک کا درجہ اُس کا مجھ سے کم تھا لیکن وہ ذاتی خرچ سے جیل میں بھی خوب عیش کرتا تھا۔ اُس کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ خیالات کا لیگی تھا۔ سردار بہادر خان کا دوست تھا۔ سردار اورنگ زیب کا گہرا آشنا۔ جیل والے اُس کی کسی بات کو نہیں ٹالتے تھے۔ یہ پہلا قیدی تھا جس نے جیل میں گراموفون منگوایا تھا۔ اُس کے باغات سے خوبانیاں اور میوے کے ٹوکرے جیل میں آتے تھے۔ میرے اُس کے ساتھ برادرانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ تاج محمد اس حد تک خود دار تھا کہ ایک بار سردار بہادر خاں نے کہا، تاج محمد تم اورنگ زیب کو صرف اتنی درخواست دے دو کہ میرے کیس پر غور کیا جائے، بس پھر تمہاری رہائی میرے ہاتھ میں ہے۔ اُس نے کہا یہ کام میرا نہیں ہے۔ کیا تم اور اورنگ زیب نہیں جانتے کہ میری سزا کی حقیقت کیا ہے؟ تاج محمد تھوڑا ہی عرصہ میرے ساتھ رہا۔ بعد میں اسے جیل کی کسی دوسری بارک میں بھیج دیا گیا اور پھر حضرت مولانا

عبدالرحیم پوپلزئی میرے ساتھ رہے۔ اُن کے بعد خان عبدالغفار خاں دو برس تک میرے ساتھ رہے لیکن نظر بندی صرف میری ہی تھی۔ مجھے ہر چھ ماہ کے بعد نیا حکم مل جاتا تھا۔ ایک بار تو مجھے جیل سے باہر لے جایا گیا۔ جیل والوں نے کہا کہ تم رہا ہوگئے ہو۔ لیکن جونہی جیل کے پھاٹک سے قدم باہر رکھا تو سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے مزید نظر بندی کا پرچہ دکھا کر اُلٹے پاؤں واپس جیل بھجوا دیا۔ شروع شروع میں مجھے جیل کے خرچ پر ہی گذارہ کرنا پڑتا تھا بعدازاں -/20 روپے ماہانہ ذاتی خرچ کرنے کی اجازت مل گئی۔ ویسے سرکار کی طرف سے مجھے پانچ روپے روزانہ ملتے تھے لیکن ٹھیکے دار تین روپے کا ہی مال پہنچاتا تھا۔ ہر سال موسم کے حساب سے کپڑے، جوتا، بستر وغیرہ بھی سرکاری خرچ پر ملتا تھا۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ الگ۔

کچھ عرصہ کے لئے میرے ساتھ غیر ملکی نظر بند بھی رہے۔ اُن میں چین، جاپان، ملایا، روس اور کابل کے نظر بند بھی تھے۔

میں اپنی طویل نظر بندی میں کبھی بیمار نہ ہوا تھا۔ لیکن ایک دن بخار نے آ دبوچا۔ میرے بہنوئی لالہ بھیم راج دھون راولپنڈی سے مجھے دیکھنے آئے۔ اُنہی کے مشورے سے میں نے فیصلہ کیا کہ چند دن کے لئے پیرول پر چلا جاؤں۔ علالت میں جب افاقہ ہوا تو میں نے پیرول کی درخواست دے دی۔ 15 دن کے لئے جیل سے رخصت مل گئی۔ جاتے جاتے میں نے باچا خان سے کہا کہیں ایسا نہ ہو میرے واپس آنے تک آپ رہا ہو جائیں اور کبھی پھر میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاؤں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پگلے! جب تک تم رہا نہیں ہو جاؤ گے میں جیل میں ہی رہوں گا۔ یہ بات صرف مذاق کی حد تک تھی۔ جیل سے آتے ہی میں پشاور میں اپنے ساتھیوں سے ملا۔ پہلی رات اپنے عزیز بھائی عبدالغفور آتش کے ہاں گذاری۔ راولپنڈی سے شیلا اور اُس کا شوہر دینا ناتھ جی بھی آگئے۔ وہ بھی ایک رات آتش صاحب کے مہمان رہے۔ آتش سے میرا تعلق گوشت اور ناخن کا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے دو قالب یک جان، دوسری بات ہے اُدبی ساتھی تو تھا ہی لیکن اُسے بھائی کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ میری عارضی رہائی بھی وبالِ جان تھی۔ پولیس سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ انہی دنوں اچانک اسمبلی کے کانگریسی ممبر جیل سے رہا ہو کر آگئے۔ اورنگ زیب کی حکومت ختم ہوئی۔ ڈاکٹر خان بہادر صاحب کی وزارت پھر سے منظرِ عام پر آگئی۔ مجھے ڈاکٹر خان صاحب نے کہا اب واپس جیل جانے کی ضرورت نہیں

تمہیں یہیں رہائی کا حکم مل جائے گا۔ میرے باہر ہوتے ہی باچا خان رہا ہو کر آ گئے۔ بڑا شاندار جلوس نکلا۔ چند منٹ کے لئے ان سے ملاقات ہوئی۔ پیرول کے آخری دن میں واپس ہری پور جیل چلا گیا۔ میرے پہنچتے ہی سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا آپ ناحق واپس آئے۔ ایک دو دن میں تو آپ کی رہائی کا حکم آنے والا ہے۔ میں نے کہا، حضرت شاید آپ نہیں جانتے کہ میرا اس جیل سے گہرا تعلق رہا ہے۔ میرے بے شمار دوست ہمدرد اور ہم نوا یہاں موجود ہیں۔ میرا سامان ابھی تک جیل میں ہی ہے بھلا آنکھیں چرا کر کیسے واپس نہ آتا۔ سپرنٹنڈنٹ کا رویہ اب کے میرے ساتھ بڑا ہمدردانہ اور پُرخلوص تھا۔ کہنے لگا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو معاف کر دینا اور ایسے ہی لفظ داروغہ صاحب نے کہے۔ میں مسکراتا ہوا اپنی بارک میں چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی قیدی بڑے خوش ہوئے۔ 4 دن جیل میں رہنے کے بعد آخر مجھے اپنے سامان کے ساتھ جیل کی چار دیواری کو چھوڑنا پڑا۔ یقین مانئے جیل چھوڑتے وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے اس جیل سے والہانہ محبت ہو گئی تھی۔ قیدیوں کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ میرے وہاں رہتے ہوئے اور خاص طور پر سیاسی قیدیوں کے رہتے ہوئے تمام مجرم قیدیوں کو آرام تھا۔ رہائی کے بعد میں سیدھا پشاور آیا اور سوشلسٹ پارٹی کے دفتر چلا گیا۔ دراصل یہ دفتر ہی اب میرا گھر تھا۔ گرفتاری کے بعد کرایہ کا مکان ہاتھ سے جاتا رہا۔ اپنے گھر میں بھی اب کوئی جگہ نہ تھی کیونکہ میرا مکان ایک رشتہ دار کے چنگل میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ رشتہ دار نے میری لاپرواہی اور بے تکلفی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا، بہرحال اب میں جیل سے آزاد تھا، پھر وہی سرگرمیاں، وہی جدوجہد، جنرل انتخابات کا طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ کانگریس، خدائی خدمت گار اور مسلم لیگ کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ہندو اور مسلم کے نام پر پروپیگنڈہ کا میدان گرم ہوا۔ مندر اور مسجد کے نام سے ووٹ دیئے جانے لگے۔ لیگ دو قوموں کی تھیوری کا شور مچا رہی تھی۔ کانگریس اور خدائی خدمت گار ایک قوم ہی کو مانتی تھیں۔ چناؤ میں جیت کانگریس کی ہوئی، ڈاکٹر خان وزارت پھر بن گئی۔ چند دنوں بعد ریفرنڈم کا نعرہ لگایا گیا۔ لیگ نے یک طرفہ ریفرنڈم کرایا۔ وطن پرستوں نے یہ کہہ کر رائے شماری کا بائیکاٹ کیا کہ چناؤ میں ہندوستان اور پاکستان کے نام پر ہماری جیت ہوئی ہے۔ یہ ریفرنڈم محض پٹھانوں میں خانہ جنگی پیدا کرنے کے لئے ہے لہٰذا ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق بٹوارہ ہو گیا۔ [illegible] وزارت [illegible] اختیارات سے توڑ دی گئی۔ عبدالقیوم کی حکومت نے جنم لیا اور

ہم سیاسی لوگ دم توڑ کر بیٹھ گئے۔ محبت اور خلوص کی جگہ نفرت اور غصے نے لے لی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر ایسی آزادی ہی ملنی تھی تو پھر ہم غلام ہی اچھے تھے! خاک ایسی آزادی پر جو بھائی کو بھائی سے الگ کردے۔ لیکن یہ اُدھوری اور بے جوڑ آزادی پھر بھی مجھے عزیز ہے۔

☆☆☆☆☆

# بکھری یادیں

انسان جب ماضی کی سمت دیکھتا ہے تو گزرے دنوں کی بہت سی یادیں اُس کے سامنے متحرک فلموں کی طرح تھرکنے لگتی ہیں۔ انہی میں کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دماغ پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں! مثلاً جیل کی یادیں۔

جیل تو ایک نہ بھولنے والی یاد ہے، تلخیوں کی یاد۔ مصائب و آلام کی یاد۔ درد و کرب کی یاد۔ میں جب پہلی مرتبہ جیل میں لایا گیا تو مجھے ایک عظیم شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ دوپہر کا عالم تھا۔ گرمی جوبن پر تھی۔ بیچارے قیدی پسینے میں تر بتر ہو رہے تھے میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ جیل کے اندرونی ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ نما انسان میرے قریب آ کر رُک گیا۔ درمیانہ قد، سانولا رنگ، سیاہ نوکیلی داڑھی، پٹے دار بال اور اُس پر چھوٹی سی پگڑی۔ یہ تھے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، عظیم مجاہد، ادیب، شاعر اور صوبہ سرحد کے مفتی اعظم۔ غالباً یہ بات ہری پور سنٹرل جیل کی ہے۔ مولانا صاحب اُن دنوں جیل کے ساتھ ایک نظر بندی کیمپ میں نظر بند تھے۔ اچانک ایک دن اپنے رفیقوں سے ملنے کے لئے جیل کے اندر چلے گئے۔ سنٹرل جیل اُن دنوں سیاسی قیدیوں سے پٹا پڑا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے ملتے ہوئے جب حضرت صاحب میرے قریب آئے تو فرمایا کہ تم بھی پشاور کے ہو؟ جی ہاں! خاص پشاور شہر کا، بازار کریم پورہ میں میرا گھر ہے۔ اس پر مولانا نے مجھ سے فرمایا۔ "یہ تو اچھی بات ہوئی۔ کریم پورہ بازار تو ہم انقلابیوں کا گڑھ ہے۔"

مولانا صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، سرسری ملاقات، لیکن نہ بھولنے والی یہیں پر مجھے مولانا صاحب کی عظمت کا احساس ہوا۔ اُن کے بارے میں کئی عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً جب 1930ء میں گرفتار ہو کر پشاور سنٹرل جیل میں لائے گئے تو انہیں دیکھ کر اخلاقی

قیدیوں نے بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت مولانا صاحب کی عظمت کا پیش خیمہ تھا۔ جن دنوں مولانا صاحب ہری پور سنٹرل جیل میں نظر بند تھے، اُن ہی دنوں اُن کے والد صاحب مفتی اعظم مولانا عبدالحکیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جب یہ اطلاع حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی تک پہنچی تو انہیں ضمانت پر مشروط رہائی کا حکم ملا۔ اُن دنوں صاحب زادہ عبدالقیوم خاں کی حکومت تھی۔ مولانا صاحب نے مشروط رہائی کا حکم ٹھکرا دیا۔ آخر مجبوراً حضرت کو رہا کرنا پڑا۔ مولانا کی ثابت قدمی کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ وہ جن دنوں پشاور جیل میں قید تھے تو اُن کی جوان لڑکی وفات پا گئی۔ لیکن انہوں نے مشروط رہائی قبول نہیں کی، اور یہ کہہ دیا کہ خدا کو جیسا منظور ہے ٹھیک ہے۔

27 اکتوبر 1942ء کی دوپہر بھی مجھے کیسے بھول سکتی ہے۔ کڑکتی دوپہر، گرم ہوائیں، اور جیل میں مکمل سناٹا۔ اچانک ایک لمبا تڑنگا بزرگ مٹیالے رنگ کی پوشاک پہنے جیل کے سپاہیوں کے جھرمٹ میں میرے احاطے کے اندر داخل ہوا۔ بزرگ کی ٹھوڑی، کان اور چہرے پر خون کے دھبے تھے۔ سفید داڑھی مٹی سے آلودہ تھی۔ یہ بزرگ تھے خان عبدالغفار خاں، عظیم رہنما! اُن تھک مجاہد اور بے لوث خدائی خدمت گار۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اُن کے قریب ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس سے قبل میں نے انہیں صرف تصویروں اور تحریروں میں ہی دیکھا تھا۔ باچا خان کے ساتھ اڑھائی برس تک مجھے جیل کے ایک ہی احاطے میں رہنے کا سنہری موقع ملا جو میری زندگی کے اہم برس شمار ہو سکتے ہیں۔

میرے دل و دماغ پر جن ممتاز ہستیوں نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، اُن میں باچا خان کا نقش اس قدر گہرا ہے کہ وہ نہ تو بھر سکتا ہے اور نہ ہی مٹ سکتا ہے۔ جیل کی زندگی میں اُن کی سرگرمیاں قابل یادگار رہیں گی۔ باچا خان کی وجہ سے قیدیوں کو گیتا اور قرآن پاک کے پاکیزہ اصولوں اور تعلیم سے روشناس کرایا گیا۔ امیر احمد خان قرآن کا درس فرماتے تھے اور پنڈت شمبھو ناتھ جی گیتا پڑھتے تھے۔ ''جشن حلوہ'' کا پروگرام بھی باچا خان کی جیل سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا۔ اتوار کی صبح کو کچھ سیاسی قیدی اور نظر بند مل کر جشن حلوہ مناتے تھے۔ اُس دن اقبال کے ترانے ''ہندوستان ہمارا'' سے یہ پروگرام شروع ہوتا تھا۔ مسٹر عبدالکریم، سادھو سنگھ سوز اور پنڈت شمبھو ناتھ اپنی سریلی آواز میں گیت گاتے تھے۔ گیت کے بعد تقریریں ہوتی تھیں۔ سیاست کے نشیب و فراز پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ ہر آدمی بلا روک ٹوک اپنے دل کی بات کہہ ڈالتا تھا۔ بسا اوقات باچا

خان سے بھی لوگ اُلجھ پڑتے تھے اور وہ خندہ پیشانی سے ہر بات کا تسلی بخش جواب فرماتے تھے۔ آخر میں باچا خان اپنے ہاتھ سے حلوہ بانٹتے تھے۔ اِسی طرح باچا خان کی قیادت میں نظر بند کھیل کود میں بھی حصہ لیتے تھے۔

ہری پور جیل میں جاپان کے بادشاہ اور وزیر اعظم نظر بند تھے۔ شائید آپ کو یقین نہ آئے۔ دونوں اِسی پوزیشن میں تھے۔ وہ جاپان کے ایک چھوٹے سے علاقے کے معطل شدہ بادشاہ اور وزیر اعلیٰ تھے۔ دونوں کو بمبئی سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بمبئی کے جیل سے وہ ہری پور جیل لائے گئے۔ انہیں رہنے کے لئے ایک بڑا کمرہ دیا گیا۔ دونوں سوائے اپنی مادری زبان کے کچھ نہ جانتے تھے۔ ایک دن بادشاہ سلامت کمرے کے برآمدے میں ٹہل رہے تھے کہ میں نے انہیں سلام کیا۔ لیکن وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اُنہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں انگریزوں کا دشمن ہوں اور جنگی قیدی ہوں۔ وہ بھی اپنے انداز میں کہے جا رہے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ ایک دن نہایت بری خبر ملی کہ بادشاہ سلامت کو ایک بدتمیز قیدی نمبردار نے پیٹ ڈالا ہے کیونکہ وہ سگریٹ نوشی کر رہے تھے لیکن نمبردار کو سگریٹ نہ دیا۔ بادشاہ سلامت میرے پاس تشریف لائے اور اشاروں میں اپنی بات کہی۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے اِس بات کا تذکرہ کیا۔ نمبردار ہٹوایا گیا۔ بادشاہ سلامت اچھل اچھل کر چیخنے لگے۔ زور زور سے زمین پر پاؤں مارنے لگے۔ اُن کے نتھنے پھول گئے، آنکھوں سے شعلے بھڑک رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ جیل نے میری بات سُن کر نمبردار کی پٹی اُتروالی اور اُسے پھر سے قیدی بنا دیا۔ بادشاہ سلامت بڑے خوش ہوئے۔ دو دن کے بعد میرے ہی کہنے پر قیدی کو پھر نمبردار بنا دیا گیا۔

پشاور سنٹرل جیل میں ایک روسی نوجوان نظر بند تھا۔ عمر بمشکل 24 برس ہو گی۔ اُن دنوں جنگ بہت زوروں پر تھی۔ روسی نوجوان ہر وقت کہتا رہتا تھا کہ کاش وہ اُس وقت اپنے گھر لینن گراڈ میں ہوتا تو چھکے چھڑا دیتا۔

یہ نوجوان جیل کے عام قیدیوں سے گھل مل گیا تھا جب میں نے بھوک ہڑتال کی تھی تو اُس نے بھی چار دن تک ہمدردی کے طور پر بھوک ہڑتال کر دی، انگریزی سرکار نے اُسے جاسوسی کے الزام میں پکڑا تھا۔ یہ نوجوان پشاور کی سڑکوں پر ہر پچاس قدم پر نماز پڑھتا دکھائی دیتا۔ اُس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ جیل میں قرآن پاک بھی تھا۔ اُس کا اصل نام ''ولادی میر'' تھا اور اسلامی نام

۔ گرفتاری کے وقت اُس کی جیب سے 14انچ چوڑا ایک کاغذ ملا جس پر پشاور کا نقشہ بنا ہوا تھا ۔ یڈا میر'' دو سال کے بعد بمبئی بھجوا دیا گیا۔ لیکن اُس کے جذبہ وطنیت کا مجھے آج بھی احساس ہے۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والے ایک اُدھیڑ عمر سردار صاحب جیل میں لائے گئے۔ اُس کے کپڑوں پر جابجا تیل اور پٹرول کے دھبے تھے۔ پتہ چلا کہ سردار صاحب ڈرائیور ہیں۔ انہیں علاقہ غیر کے قریب ایک ٹرک لیجاتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے۔ الزام یہ تھا کہ سردار صاحب مفروروں کو غیر علاقوں میں پہنچاتے ہیں اور اسلحہ کا لین دین بھی کرتے ہیں۔ جب اُنہیں گرفتار کیا گیا تو ٹرک خالی تھا نہ اسلحہ نہ آدمی۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی سردار صاحب دھر لیے گئے۔ اُنہیں ایک الگ کوٹھری میں رکھا گیا۔ سردار جی کے کپڑے بہت خراب تھے اس لئے ہم نے صابن دے دیا۔ سردار جی نے کپڑے دھو ڈالے۔ جب وہ ننگے تھے تو اُن کے بدن پر گولیوں کے نشان دکھائی دیئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ داغ گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے ہیں۔

ایک دن میں نے اُنہی سردار صاحب کو مولانا صاحب کی جیل کوٹھری میں دیکھا تو سوچنے لگا کہ اس معمولی آدمی سے مولانا صاحب کا کیا میل بعد میں پتہ چلا کہ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے سردار صاحب تعلیم کے لحاظ سے بی اے۔ تھے اور کئی بار روس جا چکے تھے۔ اُس کے طفیل بابا روڑ سنگھ اور دو بنگالی روس جا چکے ہیں۔ حکومت کی پوری کوشش کے باوجود سردار صاحب حقیقی شکل میں سامنے نہ آسکے۔ لہذا پولیس نے انہیں چھوڑ دیا اور اس طرح وہ سرکار کے آہنی پنجہ سے نکل گئے۔

پشاور سنٹرل جیل کی حوالات میں ایک ملا نما صاحب تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑے انقلابی ہیں اور بڑی تگ و دو کے بعد انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ جوں ہی یہ صا ب ‑الات میں آئے تو جیل داروغہ سے کہا، جناب میری داڑھی میں سخت کھجلی ہو رہی ہے لہذا کٹوا دیجیے۔ تھوڑی دیر کے بعد داڑھی چہرے سے اس طرح غائب ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ

دوسرے دن پشاور سی آئی ڈی کے رکن اعلی شیخ عبدالعزیز خان جیل میں تشریف لائے اور داڑھی والے انقلابی سے ملنا چاہا۔ لیکن وہ تو جا چکا تھا یعنی بغیر داڑھی والا انقلابی ہی جیل میں رہ گیا تھا، شیخ صاحب کے پاس داڑھی والی فوٹو تھی یہی اس کے پاس ثبوت تھا شیخ صاحب بہت سٹ پٹائے۔ جیل والوں پر گرجے لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ انقلابی دو دن کے بعد ضمانت پر رہا ہو گیا۔ جب اُسے عدالت میں پیش کیا گیا تو شیخ صاحب نے کہا کہ نوجوان پنجاب کا مشہور

انقلاب پسند ''مسٹر عزیز ہندی ہے''۔ یہ لمبی داڑھی بڑھائے ہوئے گدھوں کو ہانکتا ہوا آزاد قبائل کی حدود میں داخل ہو رہا تھا کہ میں نے اِسے گرفتار کر لیا۔ لیکن اِس کے نرم ہاتھ دیکھ کر محسوس کیا کہ یہ گدھوں کو ہانکنے والا کبھی نہیں ہو سکتا، ایسے آدمیوں کے ہاتھ تو کھردرے ہوتے ہیں۔

''عزیز ہندی'' نے جواب دیا کہ واقعی ''میں عزیز ہندی'' ہوں لیکن میں داڑھی کی شکل میں گدھوں کو ہانکتا ہوا گرفتار نہیں ہوا۔ آپ دیکھ لیجیے۔ میری داڑھی صفاچٹ ہے محض اتنی سی بات پر عزیز رہا ہو گیا۔

جن دنوں گاندھی جی نے ''اچھوت سدھار'' کے لئے مرن برت رکھا تھا تو سارے دیش میں کھلبلی مچ گئی! جب اُس کی اطلاع جیل میں پہنچی تو سیاسی قیدیوں نے فیصلہ کیا کہ ایک دن روزہ رکھا جائے۔ جب یہ خبر جیل اسٹاف کے کانوں تک رینگی تو انہوں نے قیدیوں کو ڈرایا دھمکایا۔ لیکن جب اس کا اُلٹا اثر ہوا تو یہ چرچا ہوا کہ گاندھی تو ''کافر'' ہے۔ وہ ہندوؤں کی حکومت چاہتا ہے۔ کافر کے ساتھ ہمدردی کرنا اسلام میں گناہ ہے گناہِ عظیم ۔ جیل والوں نے ایک نام نہاد انگریز پرست مُلّا سے فتویٰ بھی دلوا دیا۔ لیکن کوئی بات بھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ ایک دن کا روزہ رکھا گیا۔ گاندھی جی کے لئے درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی گئیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک پندرہ سالہ خدائی خدمت گار نے تین دن تک روزہ رکھا۔ جب یہ لڑکا جیل میں لایا گیا تو اُس کی پیٹھ پر لاتعداد زخم تھے۔ یہ زخم پولیس کی وحشیانہ مار پیٹ سے ہوئے!

جدوجہد آزادی میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی ''حج'' کرنے کے لئے گئے۔ انگریزی حکومت نے مجبوراً آپ کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔ جس دن آپ پشاور سے بذریعہ ریل بمبئی جا رہے تھے تو خفیہ پولیس کا گروہ مولانا کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ جب آپ گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے میں سوار ہوئے تو آپ کے پاس بمبئی کا ٹکٹ تھا اور میں اور کچھ دوسرے ساتھی بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اپنا ٹکٹ مجھے دے دیا اور میرا ٹکٹ خود لے لیا جو صرف نوشہرہ تک ہی تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک رکن نے ٹکٹ کلرک کے ذریعہ مولانا صاحب کا ٹکٹ معلوم کرنا چاہا۔ ٹکٹ دکھلایا گیا تو وہ نوشہرہ کا تھا اگرچہ یہ ایک مذاق تھا لیکن خفیہ پولیس والوں کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔ مولانا کو بٹھلانے کے لئے پانچ صد سے زائد لوگ سٹیشن پر آئے تھے اور قریب قریب ایک صد پولیس والے ۔ مولانا صاحب کی نگرانی کے لئے پشاور پولیس کا ایک خفیہ افسر ''حج''

کرنے کے لئے بھیج دیا گیا جس نے مقدس مقام پر بھی وہ گل کھلائے کہ توبہ... مولانا صاحب کی یہ "حج یاترا" بھی سیاسی نوعیت کی تھی۔ وہاں انہوں نے امیر امان اللہ خان سے مقدس ملاقات کی۔

خدائی خدمت گاروں کے مرکز سردریاب میں یک میٹنگ ہو رہی تھی۔ اِس کے لئے ضروری تھا کہ جو آدمی بھی میٹنگ میں شرکت کرے، وہ اپنا بستر ساتھ لائے اور اتنا ہی نہیں وہ بستر خود اُٹھا کر لائے۔ چنانچہ بڑے بڑے نیتا اور معززین کندھوں پر بستر اُٹھائے مرکز میں آئے، جب ڈاکٹر خان صاحب مرکز میں داخل ہو رہے تھے تو ایک خدائی خدمت گار نے کہا خان صاحب! آپ کا بستر کہاں ہے؟ اُس نے پیچھے آتے ہوئے ایک خدائی خدمت گار کی طرف اشارہ کیا جو بستر اُٹھائے آرہا تھا۔ خدائی خدمت گار نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ میٹنگ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اپنا بستر خود اُٹھا کر میٹنگ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اِس پر خان صاحب نے شرمندہ ہو کر اپنا بستر کندھے پر رکھ لیا۔

اِس میٹنگ میں ہر آدمی قطار میں بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد اپنے برتن خود ہی صاف کرتا تھا۔ بعد میں جب برتن دھونے کی باری آئی تو ایک خوشامدی نے آگے بڑھ کر برتن لینا چاہا۔ باچا خان نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا "تم کب سے خدائی خدمت گار ہو؟"

گاندھی جی دو بار پٹھانوں کے دیش میں آئے! اور پٹھانوں کے دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑ گئے۔ پٹھان بھی اُن کا اِس قدر گرویدہ ہو گیا تو اِس نے بندوق پھینک کر خالی ہاتھوں سے انگریزوں کی بربریت کا مقابلہ کیا، عدم تشدد اِس کا ایمان بن گیا۔ پہلی بار جب گاندھی جی اٹک کے اُس پار سنگریلی دھرتی سے گذرے تو لوگوں نے اِس ننگی ننگی ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھ کر تعجب کیا کہ یہ وہی عظیم مجاہد ہے جس کے نام سے انگریز تھراتا ہے اور جس نے عملی زندگی سے باچا خان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ میں اُن دنوں کسان تحریک کے سلسلہ میں جیل میں تھا۔ حکومت ڈاکٹر خان کی تھی۔ جیل سے میں نے گاندھی جی کو خط لکھا تھا، جس میں اپنی پارٹی کے جذبات اور پولیس سخت گیری کا تذکرہ کیا تھا۔

دوسری بار جب گاندھی جی تشریف لائے تو ہم چند نوجوان ایک وفد کی صورت میں خان صاحب کے بنگلے پر اُن سے ملے۔ زندگی میں گاندھی جی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی، وقتی طور پر گاندھی جی کی باتوں کا ہم ساتھیوں پر گہرا اثر ہوا۔ اِن کے خلوص، محبت اور اندازِ گفتگو نے ہمیں اُن

کا گرویدہ بنالیا۔ وہ شہروں میں بھی گئے اور گاؤں بھی۔ تنگ وادیوں سے بھی گزرے اور ٹیڑھے ترچھے پہاڑیوں کے دامن میں بھی۔

وزیرستان کی جنتا پر انگریزی حکومت نے بمباری کی تو پنڈت جواہر لال نہرو تڑپ اُٹھے اور وہ اس قدر غصے میں آگئے کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر سیدھے پٹھانوں کے دیش میں جا پہنچے، انگریزوں کو اُن کی آمد قطعی پسند نہ تھی۔ اُس وقت کے گورنر نے شیخ محبوب علی خان کو پٹھان قبیلوں میں بھیجا تا کہ نہرو جی کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا جائے۔ بدنام شیخ نے پنڈت جی کو قتل کر دینے کا ذلیل منصوبہ تیار کیا۔ جب پنڈت جی مالا کنڈ ایجنسی پہنچے تو اُن پر شدید پتھراؤ ہوا۔ اُس وقت ڈاکٹر خان صاحب کا پستول کام کر گیا۔ غنڈے پستول کو دیکھتے ہی رفو چکر ہو گئے۔ باچا خان کی دو انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ نہرو جی کی ٹھوڑی پر زخم آئے، خدائی خدمت گار غصے سے بھڑک اُٹھے۔ پٹھان بدلے کی بھاونا سے اپنے زنگ آلود پستول اور بندوقیں لے کر میدان میں آنے لگے۔ لیکن باچا خان کی بروقت مداخلت سے بچ رابختون خاموش ہو گیا۔ اور جب پنڈت جواہر لال نہرو کو سرد ریاب میں لانے کا پروگرام بنایا گیا تو پشاور سے سردریاب کے اُٹھارہ میل لمبے راستے پر وہ شاندار استقبال ہوا کہ سرحد کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ سردریاب کے عظیم اجتماع میں پنڈت جی کو راستے میں پختون پوشاک پہنائی گئی۔ سروریاب کے عظیم اجتماع میں آزاد قبائل کے سرداروں نے پنڈت جی کو ہی پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا۔ شاندار سپاس نامے پیش کیے گئے۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ میرا خون سرحد کی دھرتی پر گرا ہے۔

سرحد میں لیڈروں کی آمد کے سلسلے میں سبھاش بابو کا نام کیسے بھولا جا سکتا ہے۔ ایک چنگاری جو بنگال میں چمکی، وہ شعلہ بن کر سرحد میں بھڑکی۔

پہلی بار سبھاش بابو فارورڈ بلاک کی تشکیل کے لئے پشاور آئے، لوگوں نے اُن کی راہ میں نظریں بچھا دیں۔ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلا لیکن عین اُسی وقت ڈاکٹر خان صاحب کے لڑکے جان محمد بیرسٹر کی وفات پر سبھاش بابو نے جلوس رکوالیا اور ڈاکٹر خان صاحب کے پاس ماتم پُرسی کے لئے چلے گئے۔ شام کو عظیم الشان جلسہ ہوا۔

دوسری بار وہ ایک مفرور کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ کچھ وقت پشاور میں گزارا، پھر آزاد قبائل سے ہوتے ہوئے کابل کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے اٹلی کو پرواز کر گئے۔ لیکن

بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ کلکتہ سے اٹلی تک کی ساری سرگرمیوں میں بھگت رام جی کا ہاتھ رہا۔ بھگت رام جی شہید ہری کرشن کے بڑے بھائی ہیں۔ دیش بھگت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں! ان کے ساتھ ہی عبدالغفار خان اور وارث خان کا نام لینا بھی ضروری ہے جن کے بغیر سبھاش بابو اپنے مقصد میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

''پرنس آف ویلز'' ہندوستان سے گھومتے ہوئے پشاور بھی آئے! سرکار نے اُن کے استقبال میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے تھے لیکن سیاسی لوگ اُن کی آمد کے شدید خلاف تھے، میں اُن دنوں نیشنل سکول میں پڑھتا تھا۔ سکول کی طرف سے ہم بچوں کو پیتل کا ایک ایک میڈل دیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ جب پرنس کی موٹر سڑک سے گذرے تو ان کا پُر جوش سواگت کیا جائے، نعرے لگائے جائیں۔ دو دن تک ہم سکولی بچوں کو جلوس میں شامل ہونے کی تربیت دی گئی۔ پروگرام کے مطابق سکول ماسٹر ہم بچوں کو لے کر اس جگہ پہنچے جہاں سے پرنس نے گذرنا تھا۔ ہم دونوں طرف قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ کئی موٹریں فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر سے گذر گئیں۔ لیکن پرنس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور پھر ہم اُسے پہچانتے بھی کیسے..... جونہی ایک موٹر گذری تو بڑے زور سے آواز گونجی ''پرنس واپس جاؤ'' ''پرنس مردہ باد'' ہم نے بھی نعرے لگائے۔ اُن دنوں ہم زندہ باد اور مردہ باد میں زیادہ فرق نہیں جانتے تھے۔ جلوس بکھر گیا۔ سیاسی لوگ نعرے لگاتے ہوئے گھروں کو لوٹ گئے۔ سکول کے ماسٹر بچوں کو برا بھلا کر کہتے ہوئے انہیں واپس لے آئے۔ لیکن پھر مٹھائی کی ایک ایک ٹوکری ہر بچے کو دی گئی۔

1931ء میں ہری پور سنٹرل جیل سیاسی قیدیوں سے اس قدر بھر گیا تھا کہ جیل والوں کو مجبوراً خیمے لگانے پڑے۔ سیاسی قیدیوں کے پاؤں میں لوہے کا ایک کڑا ڈال دیا گیا تھا اور رات کو ایک لمبی زنجیر سے قیدیوں کو باندھ دیا جاتا تھا۔ اگر کسی کو پیشاب کی حاجت ہوتی تو سارے قیدیوں کو اُٹھنا پڑتا، بڑی جدوجہد کے بعد لمبی زنجیر کا سلسلہ ختم ہوا۔ ایک خیمہ میں ہری پور کے ایک پنڈت پرشوتم داس جی رہتے تھے۔ وہ بڑے پرہیز گار اور چھوت چھات کو ماننے والے تھے۔ جیل میں باہر سے کوئی چیز آسانی سے نہیں آسکتی تھی۔ صرف ایک ہی طریقہ آسان تھا جب جیل کا بھنگی گندگی کے ڈول باہر لیجاتا تو واپسی کے وقت اسی ڈول میں لوگوں کی چیزیں چھپا کر لے آتا تھا۔ وہ ڈول کو صاف کر لیا کرتا تھا، پھر چیزیں ڈال کر اُس پر گھاس پھونس ڈال دیتا اور جیل پھاٹک سے اندر

آجاتا، ایک دن پنڈت جی کو جیل میں باسی دال پسند نہ آئی۔ میں نے اُسے گڑ کا ایک ٹکڑا دیا جس سے اُس نے مزے لے کر روٹی کھائی اور پھر گڑ مانگنے لگا۔ میں نے جب پنڈت جی کو گڑ اور بھنگی والی بات سنائی تو وہ لگا اُلٹیاں کرنے۔ بولا تم نے میرا دھرم خراب کر دیا ہے لیکن رفتہ رفتہ بھنگی کے ذریعے لائی ہوئی چیزیں پنڈت جی کو بھی پسند آنے لگیں

---

الیکشن کے دنوں میں پنڈت جواہر لال نہرو راولپنڈی تشریف لائے تو اُن کے رہنے کے لئے شری گوکل چند بھسین کا مکان تجویز کیا گیا تھا۔ ہم چند ساتھی منشی احمد دین کے کہنے پر راولپنڈی آگئے تاکہ اُن کی موجودگی میں پنڈت جی سے ضروری باتیں کر لی جائیں۔ اِسی مکان میں منشی احمد دین بھی براجمان تھے۔ وہ اُن دنوں مفرور تھے۔ رات کو ہم لوگ پنڈت جی سے ملے، تھوڑی دیر کے بعد پنڈت جی اپنے کمرے سے اُٹھ کر منشی احمد دین کے کمرے میں آگئے، چارپائی پر بیٹھ گئے اور لگے سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے..... منشی احمد دین نے اُن سے خفیہ لٹریچر کی بات چیت کی، انقلاب کے مسائل پر غور و غوض ہونے لگا۔ نہرو جی ہر بات کا جواب دے رہے تھے، یہ ملاقات ایک انوکھی ملاقات تھی۔ ایک مفرور اور ایک عظیم رہنما کی خفیہ ملاقات ....جس کی یاد کبھی نہ بھول سکے گی۔ اِسی طرح لائل پور، گوجرانوالہ، راولپنڈی کی وہ کانفرنسیں بھی کیسے بھلائی جاسکتی ہیں جن میں انقلاب کے ہنگامے ہوتے تھے۔ زندگی اور موت کے منصوبے بنتے تھے۔ مفروروں سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ تشدد اور عدم تشدد کے تذکرے چھڑتے تھے۔ ساتھیوں کا آپسی اُلجھاؤ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں کسنے کی یاد بھی کہاں بھول سکتی ہے۔

غالباً فروری کا مہینہ تھا۔ جب میں چند دنوں کے لئے جیل سے پیرول پر آیا، آتے وقت میرے پاس سامان زیادہ تھا کیونکہ متواتر کئی سال نظر بند رہنے کے باعث سامان کا اکٹھا ہونا قدرتی بات تھی! نظر بند کو جو کپڑے، بستر، کمبل وغیرہ ملتے تھے وہ اُس کی ذاتی جائیداد ہو جایا کرتی تھی۔

جب ہری پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو قلی سے سامان اُٹھوایا، گاڑی میں بیٹھ گیا اور قلی کو ایک روپے کا نوٹ دیا تو وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا بابو جیل سے آئے ہو کیا؟ ہاں جیل سے ہی آیا ہوں! کیا بات ہے باقی پیسے واپس کرو۔ قلی نے کہا، بابو جی ایک روپیہ اور دیجیے، یہ تو سرکاری ریٹ ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ جب میں جیل گیا تو اُس وقت قلی ''ٹکہ''

کا ایک آنہ لیتا تھا۔اب چار آنے ریٹ ہوگیا تھا۔جیل سے پہلے چائے کی بڑی ڈبیہ دو آنے میں ملتی تھی،اب 5 آنے میں ملتی تھی۔ جنگ کی وجہ سے مہنگائی آسمان کو چھونے لگی تھی۔ اُس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ مہنگائی آنے والی مہنگائی سے شیطانی آنت کی طرح بڑھ جائے گی۔

مجھے اپنی انقلابی زندگی میں شیاما نامی ایک لڑکی کبھی نہ بھول سکے گی جس نے اپنی عقل ودانش کے مطابق میرا تھوڑا بہت ساتھ دیا۔صوبہ سرحد کی لڑکیوں میں سیاسی سوجھ بوجھ بہت کم تھی۔ عورتوں میں سیاسی جاگرتی برائے نام تھی۔شری متی نمودیوی اور سرسوتی دیوی کے علاوہ کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں جس نے آزادی کی تحریکات میں کوئی نمایاں کام سرانجام دیا ہو،البتہ چارسدہ کی اُس پختون عورت کی قربانی اب بھی میرے ذہنی پردوں پر تھرکتی ہے جس نے فوجیوں کی گولیوں اور سنگینوں کے سامنے اپنا سینہ ڈھال بنا کر رکھ دیا۔لیکن شیاما کی یاد بھی میرے دل سے کیسے دور ہو سکتی ہے جس نے ایک بار جان جوکھوں میں ڈال کر خفیہ لٹریچر کا پلندہ اُٹھا کر پولیس کو چکمہ دے کر گھر آ گئی تھی۔لٹریچر کا یہ پلندہ بم اور پستول سے کسی صورت بھی کم نہ تھا اور پھر اتنا ہی نہیں جب میں مفرور تھا تو بھی اِس لڑکی کا تعاون میرے ساتھ رہا، پشاور کی پولیس شیاما پر بھی نظر رکھتی تھی!جب میں آخری بار جیل کی طویل یاترا پر چلا گیا تو شیاما کی بے لوث قربانی بھی میرے ساتھ ہی چلی آئی! میں اُس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔شادی کے بعد وہ مجھے آخری بار ہری پور جیل میں ملنے آئی اور جب میں چند دنوں کے لئے پیرول پر آیا تو شیاما پھر اپنے شوہر دینا ناتھ جی کے ساتھ دو دن کے لئے پشاور چلی آئی۔وہ بڑی مخلص اور ہمدرد قسم کی لڑکی تھی۔

جموں میں ایک پرائیویٹ بس سروس کی ہڑتال تھی، ہمارا ایک جتھہ پشاور سے جموں گیا، راستے میں بس کو حادثہ پیش آیا۔مرنے والا ایک نوجوان رام سرن تھا لیکن غلطی سے یہ خبر میرے نام منسوب ہوگئی۔میں جموں کی ہڑتال میں زندہ سلامت رہا تھا اور اُدھر میرے ساتھی میرا ماتم کر رہے تھے۔میری نعش لینے کے لئے چند نوجوان راولپنڈی آ گئے،جب میں راولپنڈی پہنچا تو وہاں سے ساتھیوں کو اپنا ماتم کرتے دیکھا،اور جب میں نے پشاور کی دھرتی پر قدم رکھا تو دوستوں سے ملنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ پشاور کے اخبارات مرثیے شائع کر چکے تھے۔جھنڈے سرنگوں کر دیئے

گئے تھے۔ایک بڑی فوٹو پارٹی کے دفتر میں لٹکادی گئی تھی اور اس طرح سے میں نے زندگی میں ہی اپنا ماتم لوگوں سے منوالیا اور اب سوچتا ہوں کہ جب مروں گا تو شاید جنازہ اُٹھانے والا بھی بڑی مشکل سے ملے گا کیونکہ یہ ہندوستان ہے اور مجھ جیسے لوگوں کو پہچاننے والے لوگ یا تو مر کھپ گئے ہیں یا پاکستان میں رہ گئے ہیں اور جو زندہ ہیں اُن کی نظریں بدل گئی ہیں۔

اُڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

☆☆☆☆☆

# غلام حسین

غلام حسین... فرنٹیر کانگریس کمیٹی کا چپڑاسی... لیکن ایک مجاہد، ایک ہمدرد، ایک محافظ... اور اسی ناطے سے اُسے انسانیت کا پرستار بھی کہتا ہوں۔ وہ میرے بہت قریب رہا ہے۔ بہت ہی قریب... قصہ خوانی بازار میں، پراونشل کانگریس کمیٹی کا دفتر تھا۔ غلام حسین اس دفتر کا مالک... وہ ہمہ صفت موصوف تھا، چپڑاسی سے لے کر لیڈر... لیکن تھا بڑا باتونی، ایک ہی سانس میں دنیا بھر کی سیاست چھان ڈالتا تھا۔ چنڈو خانے سے لے کر ایوان اسمبلی تک کی ہر بات کا علم اُس کو رہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اَن پڑھ نہ ہوتا تو وہ ایک اچھا سیاست داں ہوتا۔ 1945ء میں جب ہری پور سنٹرل جیل سے رہا ہو کر میں اس دفتر میں آیا تو مجھ سے پہلا تعارف غلام حسین کا ہی ہوا۔ مذہبی طور پر وہ شیعہ تھا، محرم میں وہ کبھی کبھی سیاہ قمیص پہن کر سینہ کوبی بھی کرتا تھا۔ راتوں کو شیعہ مرکزوں میں بھی جاتا تھا اور وہاں سے چاول، مٹھائی اور حلوہ وغیرہ بھی دفتر والوں کے لئے لاتا تھا۔ وہ اتنا بے باک تھا کہ بلا کھٹکے ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم سرحد وزارت کے بنگلے میں گھس جاتا تھا۔ اُس کے مراسم لیگی وزیر اعظم سردار اورنگ زیب خاں سے بھی تھے اور عبد القیوم بیرسٹر سے بھی۔

بات پرانی ہے لیکن دلچسپ... جس دن عبد القیوم بیرسٹر حیدرآباد سے لیگی بن کر پشاور آئے تو شہر کے لیگیوں نے پُر جوش جلوس نکالا۔ ہم کچھ ہندو کانگریسی اُن سے ملنے ریلوے اسٹیشن گئے تو آپ نے آہستہ سے کہا میں اب بھی کانگریسی ہوں لیکن لیگی بننا ضروری ہو گیا۔ غلام حسین ہمارے ساتھ تھا، بھلا وہ ایسے موقع پر خاموش کیسے رہتا، پھٹ سے کہہ دیا، بیرسٹر صاحب الیکشن کے لئے ایمان بیچ دیا ناں! بیچارے بیرسٹر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اُس رات میں بھی غلام حسین کے ساتھ دفتر میں ہی رہا۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بڑھتے گئے... غلام حسین کانگریس کا ممبر بھی تھا، اُس کی منادی بھی کرتا تھا اور دریاں بھی بچھاتا تھا۔ بولتا بھی تھا۔ وہ جلسے کے خاتمے تک وہیں رہتا۔

جس دن الیکشن کے سلسلہ میں ہندوستان کے نیتا شاہنواز خان پشاور آئے تو بھی غلام حسین پیش پیش تھا اور جب حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پشاور میں جلوہ افروز ہوئے تو بھی غلام حسین اُن کی خدمت میں رہا۔ غلام حسین پھر بھی چپڑاسی ہی تھا منہ پھٹ چپڑاسی...... جب ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم بنائے گئے تو غلام حسین اپنے ہاتھوں سے پھولوں کا ایک خوبصورت ہار بنا کر اُن کی کوٹھی پر گیا۔ اُسی وقت کانگریسی نیتا، سرکردہ شہری اور خوشامدی لوگ بھی ہار لئے ڈاکٹر خان صاحب کی آمد کے منتظر تھے، ایسے موقع پر بیچارے چپڑاسی کی حقیقت ہی کیا۔ لوگوں نے اُسے پیچھے دھکیلنا چاہا۔ سرکاری ملازموں نے اُسے دھتکارنا چاہا لیکن وہ گالیاں دیتا، اوٹ پٹانگ بکتا، لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا جوں ہی آگے بڑھا تو ڈاکٹر خان صاحب آگئے۔ پہلا ہار غلام حسین کے ہاتھوں سے ڈاکٹر خان صاحب کی گردن کی زینت بنا کیونکہ ڈاکٹر خان صاحب نے اُسے دیکھتے ہی گلے سے لگالیا۔ دولت کے اندھے بیچاری اور خوشامدی ٹٹو منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔

ایک دن کسی نے کہا غلام حسین تم اَن پڑھ چپڑاسی ہو، اتنا آگے بڑھ کر کیا لو گے، تمہاری منزل تو صرف چپڑاسی تک ہی ہے۔ کہنے لگا ...... او نکمنے...... تو کیا سمجھتا ہے۔ میں اسی طرح کا رہوں گا۔ ارے غریب آدمی ہی بڑا بنتا ہے۔ میں لیڈر بنوں گا، لیڈر۔ غلام حسین لیڈر تو نہ بن سکا لیکن اُس نے ایک دو کام ایسے کئے جسے بڑے سے بڑا لیڈر بھی نہ کر سکتا۔

''ریفرنڈم'' کے دنوں کی بات ہے، لیگیوں اور کانگریسیوں میں ہندوستان اور پٹھانستان کے سوال پر کشمکش چل رہی تھی۔ دونوں طرف ہنگامہ آرائی تھی، لیگیوں کی طرف سے اشتعال انگیز پوسٹر اور پمفلٹ شائع ہوئے۔ پبلک جلسوں میں توہین آمیز الفاظ کہے جاتے رہے۔ جگہ جگہ جھگڑے ہوتے رہے، ایک دن لیگیوں نے ایوان اسمبلی کے باہر سیاہ جھنڈیوں سے مظاہرہ کیا۔ لیگیوں کا جم غفیر... سیاہ جھنڈے... شور وغوغا... گالیاں... نعرے ......اور ڈاکٹر خان بھیڑ میں گھس گئے۔ ایک لیگی نے اُن کے منہ پر طمانچہ مارا، پولیس نے بندوق کو حرکت دی... خان صاحب نے کہا... خبردار یہ میرے بچے ہیں، انہیں غصہ نکالنے دو...... غلام حسین کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... لیکن وہ بے بس تھا۔ اس ہنگامے نے شہر میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔ میں سیدھا کانگریس کے دفتر پہنچا۔ غالباً گیارہ بجے کا وقت ہوگا...... میں اور لالہ کنور بھان ممبر اسمبلی کانگریس دفتر کے اندر بیٹھے ہوئے اُس خنجر کا انتظار کر رہے تھے جو بیک وقت ہماری پسلیوں کو چیرتا

ہوا لیگیوں کی مسرت کا باعث بن سکے، کیونکہ اُس وقت دفتر کے نیچے غنڈے، خنجروں کی ننگی نمائش کرر ہے تھے اور با آواز چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ نیچے اُترو بزدلو... ہمارے خنجر تمہارے خون کے پیاسے ہیں، خنجر اور خون...... زندگی اور موت...... آخر ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ جس بازار میں ہم اکڑ کر چلا کرتے تھے، آج وہاں جھانکنا بھی موت کو دعوت دینا تھا۔ غلام حسین اِس وقت دفتر کے برآمدے میں بیٹھا غنڈوں کو گھور رہا تھا۔ معاملہ نازک صورت اختیار کرنے لگا تو میں نے ہی غلام حسین سے کہا ہم نیچے جاتے ہیں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن غلام حسین نے منع کر دیا۔ اتنے میں ایک یک چشم غنڈہ خنجر کو لہراتا ہوا سیڑھیوں میں آ کھڑا ہوا، اور کہا نیچے اُترو بزدلو...... میں نے پہلا قدم سیڑھی پر رکھا تو یک چشم غنڈہ نیچے اُتر گیا، ڈر سے نہیں.... دراصل وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ وہ نہ تو لیگی تھا نہ سیاسی آدمی، فقط غنڈہ تھا...... جھگڑے سے قبل وہ کبھی کبھار مجھ سے چائے پیا کرتا تھا۔ غلام حسین اب بھی برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں دُور دُور تک دیکھ رہی تھیں نہ جانے کیا... چانک غلام حسین بپھرے ہوئے شیر کی طرح دوڑ کر اپنے دفتر سے نیچے اُتر گیا۔ میں نے گھبراہٹ کے انداز میں برآمدے سے اچک کر دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا۔ غلام حسین ایک تانگہ کے پچھلے پائیدان پر کھڑا خنجر لہرا رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

آؤ بزدلو..... اِدھر آؤ۔ تم اِن بہنوں کو قتل کرنا چاہتے ہو.... بزدلو.... آج میرا خنجر بھی تمہارے خون کا پیاسا ہے۔

بات یوں تھی کہ دو لڑکیاں اسکول سے گھر لوٹ رہی تھیں۔ راہ میں فساد شروع ہو گیا۔ قصہ خوانی بازار میں دو غنڈوں نے تانگہ پر حملہ کر دیا۔ غلام حسین نے جان کی بازی لگا کر انہیں بچا لیا۔ غلام حسین ہمارے فسادی علاقے سے گذر کر اندرون شہر ہندو آبادی میں تانگہ لے گیا۔ سارے راستے میں اُس کا خنجر لہراتا رہا۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکلتی رہی اُس کا چہرہ پسینہ سے تربتر ہو گیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ ڈر کے مارے نہیں، غصے سے۔ لڑکیوں کو چھوڑ کر واپس دفتر لوٹا... غنڈے اُسے گالیاں بک رہے تھے، ہندوؤں کا کتا.... میں نے دیکھتے ہی اُسے گلے سے لگا لیا۔ وہ رونے لگا... بچوں کی طرح... بلک بلک کر...... لیکن اُس کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا کیونکہ آج اُس نے اپنی دو بہنوں کو موت کا شکار ہونے سے بچا لیا۔ اُس نے آج اسلام کی عزت کو چار چاند لگا دیئے تھے وہ چپڑاسی تھا لیکن ایک ایمان دار مجاہد تھا۔ اُس رات غلام حسین جاگتا

رہا۔ ہم دونوں کمرے کے اندر جاگتے رہے۔ نیچے اُترنا مشکل تھا۔ غلام حسین برآمدے میں بیٹھا رات بھر ایک لٹھ کو گھماتا رہا۔ میں نے پوچھا غلام حسین اِس کا کیا مطلب ہے، کہنے لگا غنڈوں کو معلوم ہو جائے کہ اِس کے پاس بندوق ہے ورنہ وہ رات کو دفتر پر حملہ کریں گے اور اِس طرح رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ دن چڑھتے ہی چند خدائی خدمت گاروں کی وساطت سے ہم کانگریس دفتر سے ڈھکی دالگراں تک پہنچے، یہ ہندو علاقہ تھا، یہاں سے ڈاکٹر خان صاحب نے سرکاری موٹر منگوائی اور ہمیں شاہی مہمان خانہ میں بلوالیا۔ جہاں اسمبلی کے ممبروں کی رہائش تھی۔ جس کمرے میں نارنگ صاحب اور میں لائے گئے، وہاں کی کھڑکیوں سے باہر کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا۔ رات بھر ہنگامے ہوتے رہے، راہ چلتے لوگوں کو مصائب وآلام کا شکار ہونا پڑتا تھا، دو دن کے بعد ہم لوگ یہاں سے اسمبلی ہال پہنچے اور وہاں سے خدائی خدمت گاروں کی سرکردگی میں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ غلام حسین اب بھی مجھ سے ملنے آتا تھا۔ فسادات کی آگ جب ٹھنڈی ہوئی تو پھر وہی غنڈے مجھ سے بے تکلفانہ بات چیت کرنے لگے۔ دراصل اِس قماش کے لوگ نہ تو فرقہ پرست ہوتے ہیں نہ وطن پرست، اُن کا ذریعہ معاش بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ اِس لئے وقت کی نزاکت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بہرحال مجھے غلام حسین کی یاد کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ غریب تھا لیکن ایماندار اور انسانیت دوست۔ ہندو مسلم تفرقات اُس کی نظروں میں صفر کے برابر تھے۔ اس کے عمل نے اتحاد اور یکجہتی کا زندہ ثبوت دیا۔ وہ آج مجھ سے بہت دُور ہے لیکن دل سے دُور نہیں۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیَر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

☆☆☆☆☆

# اٹک پار کے شاعر اور ادیب

اٹک پار کے مجاہد شاعروں میں خوشحال خان خٹک کا نام کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ایک ایسا شاعر جس نے قلم اور تلوار سے آزادی کی جنگ لڑی، جس نے میدان جنگ میں تیغ کے جوہر دکھلائے اور اپنے پُر جوش نعروں سے عوام کے جذبات کو بھی اُبھارا۔ خٹک کی شاعری نے سرحد کی پتھریلی دھرتی سے بے شمار ایسے شاعر پیدا کئے جنہوں نے غلامی اور آزادی کی لڑائی میں ایسے ایسے نغمے الاپے کہ دشمن حواس باختہ ہو گئے۔ خٹک پشتو اور فارسی کا شاعر تھا لیکن آزادی کی جنگ میں اُردو کے شاعروں کی بھی کمی نہ تھی۔ صوبہ سرحد میں جہاں ایک طرف پشتو کے باکمال شاعر پیدا ہوئے ہیں، وہاں اُردو شاعری بھی پیچھے نہیں۔ میرا روئے سخن اِس وقت صرف اُن شاعروں سے ہے جنہوں نے حریت کے نغمے گائے، جن کے گیتوں نے مجھ جیسے سینکڑوں وطن پرست پیدا کئے۔ اُن شعراء میں کچھ تو وہ حضرات ہیں جو شعر کہتے کہتے بارہا جیل کی سلاخوں سے ٹکرائے اور کچھ وہ ساتھی ہیں جنہوں نے صرف شاعری کے ذریعہ ہی کاروانِ حریت کا ساتھ دیا۔ وہ گیت گاتے تھے اور ہم جیل جاتے تھے، میرے سامنے اِس وقت حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی جنگ آزادی کے دوران بارہا جیل گئے اور جیل کی آہنی سلاخوں میں جنگ آزادی کے نغمے گائے۔ مولانا صاحب نے بہت ہی کم شعر کہے ہیں، لیکن جو کہا ہے خوب کہا۔ سودا تخلص فرماتے تھے لیکن شاید ہی کسی کو اِس تخلص کا علم ہو، سردار عبدالرب نشتر بھی اپنے وقت کے ایک اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے تقریریں بھی کیں، اور شعر بھی کہے، اور اِس جرم کی پاداش میں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں کو رونق بخشی، چیلا رام شوقؔ اور ولی محمد طوفانؔ کی شاعری آج بھی میرے دماغ کے پردوں پر رقص کرتی ہے۔ شوقؔ اور طوفانؔ دونوں تلوار کے دھنی تھے اور انہی دو شاعروں کے درمیان ایک نوجوان شاعر بخش کوثرؔ کا نام

بھی لیا جا سکتا ہے۔ کوثر نے شعر کہہ کر برطانوی شہنشاہیت کا تختہ اُلٹ دیا، باعمل شاعروں کے ساتھ جگدیش چندر کوکب کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ آزادی کی جنگ میں وہ لڑکپن کی منزل ہی طے کر رہے تھے، پھر بھی وطنیت کے نشے میں سرشار ہو کر اُنہوں نے آزادی کے گیت گائے ہیں اور بارہا غلامی کے وزنی تھپیڑوں سے ٹکرا کر وہ آگے بڑھے۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں، خاموش سرحدی کے نام سے بھی سرحد کے لوگوں کو بڑا اُنس رہا ہے۔ سازِ حریت پر اُن کے گیت بھی سرحدی فضاؤں میں گونجے، مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑانے والے خاموش بھی قافلہ آزادی کے ایک رکن رہے ہیں، طنزیہ انداز میں جوگندر ناتھ تیر نے بھی حکومت کی وہ دھجیاں اُڑائی ہیں کہ باید و شاید......

افسر آذری بھی کسی وقت صوبہ سرحد کے شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے جذبات کو شاعری میں ڈھال کر انگریزی حکومت کو خوب لتاڑا ہے۔ اِس زمرہ میں چونی لال کاوش کا نام بھی میرے سامنے ہے جنہوں نے ادب سے جیل تک کی منزل طے کی۔ مزاحیہ شاعری میں محمود پشاوری کو بھی یاد کر لیجئے گا۔ آزادی کی لڑائی میں انہوں نے بھی حکومت وقت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ مزاح اور طنز کے انداز میں گوراشاہی حکومت پر وہ پھبتیاں کسیں کہ خدا کی پناہ۔ اُردو شاعروں کو چھوڑیے، ذرا پشتو شاعروں کی طرف جھانکیے، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا، اٹک پار کے جن شاعروں نے جنگ آزادی میں مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے، وہ شاعر تھے پشتو زبان کے۔ استاد عبدالملک فدؔا کا نام میرے ذہن سے کسی وقت بھی اُتر نہیں سکتا۔ انہوں نے جتنے شعر کہے ہیں، اُن میں سے زیادہ تر جیلوں کی یادگار ہیں۔ فدؔا کی شاعری میں شعلے بھی ہیں اور پھول بھی، وہ گفتار کے دھنی بھی تھے اور کردار کے غازی بھی۔ خاں میر ہلاؔلی، استاد خلیق، ماسٹر عبدالکریم خان، عبدالغنی خان، کرامت شاہ، فولاد خان جلاؔلی، استاد خادم، عبدالکریم اکبر اور بے شمار ایسے شاعر میری فہرست میں ہیں جنہوں نے مردانہ وار انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کا پرچم لہرایا، جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں زندگی اور موت کی جنگ لڑی۔ مجھے آج بھی جیل کے وہ شاعر یاد آتے ہیں، آزادی کے یہ متوالے شاعر، جو جھوم جھوم کر جیل کے اندر آزادی کے گیت گاتے تھے۔ اتنا ہی نہیں کبھی کبھار یہ شاعر وبالِ جان بھی بن جاتے تھے۔ جیل افسران کی ترچھی نظریں، ان مظلوم شاعروں کو جبر و تشدد کی آگ میں جھونک دیا کرتی تھیں۔ بات پرانی ہے، 30ء کی ایک شام کو چند پٹھان نوجوانوں نے "درد" نام کا ڈرامہ کھیلا تھا، اُس ڈرامے کے لکھنے والے غالباً امیر نواز جلیا تھے

جن کی شاعری شعلے اُگلتی تھی، ڈرامے کھیلنے والے فرنگی حکومت کے غیض و غضب کا شکار ہوئے، اور دس دس برس کے لئے جیل کے مہمان بنا دیئے گئے۔ جیل کے اندر ایک شاعر تھے شرر بیچارے کی دونوں ٹانگیں خراب تھیں لیکن پھر بھی وہ حکومت کے لئے دردِ سر ثابت ہوتے تھے اور شاعروں میں فوقیت رکھتے تھے۔

شاعری کی دنیا سے ہٹ کر اگر ہم نثر نگاروں کی طرف رجوع کریں تو بھی ماننا پڑے گا کہ صوبہ سرحد نے بے شمار نثر نگار پیدا کئے ہیں۔ اُن میں ہم عطا اللہ خاں، مولانا عبدالحی خاں، ملک عالم اعوان، پیر بخش خاں، وکیل بخش غزنوی، محمد حسین عطا، عبدالغفور آتش، محمد یونس قریشی، فقیر چند سرحدی، فتح چند نسیم، نریندر ناتھ دت اور سردار ملاپ سنگھ آزاد ہیں۔

ان نثر نگاروں میں مجھے دو نام کبھی نہیں بھول سکتے، امیر نواز جلیا اور صنوبر حسن خان مہمند۔ جلیا نے انگار نام کا ایک اخبار نکال کر نثر میں وہ آگ برسائی کہ فرنگی حکومت کا تخت جھلس کر رہ گیا۔ صنوبر خان نے آزاد قبائل سے "اخبار سیلاب" نکال کر انگریزوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر رکھ دیا۔ نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ اگر صوبہ سرحد کے اِن اخباروں کا تذکرہ کر دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جنہوں نے صفحۂ قرطاس پر خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر انقلابی شہہ پارے لکھے اور لوگوں کو آزادی کا سبق پڑھایا، اِن اخباروں میں سب سے پہلا نام "سرفروش" کا لیا جا سکتا ہے۔ یہ اخبار نوجوان بھارت سبھا کا ترجمان تھا اور اُس کی سرپرستی کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، برق اور آتش کے مضامین اس اخبار کی آتش فشانی کا ثبوت ہیں اور حکومت ان مضامین سے سیخ پا ہوتی تھی، رائے عامہ اخبار بھی حضرت مولانا پوپلزئی کی قیادت میں شائع ہوتا تھا، ایڈیٹر تھے بخشی فقیر چند سرحدی، ایک عرصہ تک اوم پرکاش بھی "رائے عامہ" سے وابستہ رہے اور اپنے قلم کے جوہر بکھیرتے رہے۔ نامی صاحب اگرچہ پنجاب کے رہنے والے ہیں لیکن صوبہ سرحد سے اُن کا گہرا تعلق رہا ہے۔

'ترجمانِ سرحد' میر عالم اعوان کی ادارت میں نکلتا تھا، خدائی خدمت گار جماعت کے ترجمان 'پختون' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے پختونوں میں حریت کا بے پناہ جذبہ پیدا کیا۔ پختون کو صوبہ سرحد میں وہی اہمیت حاصل تھی جو ہندوستان میں ہریجن کو حاصل تھی۔ ہریجن گاندھی جی کا اخبار تھا اور "پختون" باچا خان کی قیادت میں نکلتا تھا۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ اخبار سرکاری

طور پر بند کر دیا گیا، اُردو زبان کا خدائی خدمت گار اور فرنٹیئر ایڈووکیٹ بھی سرحد کی سیاسی زندگی میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ پنڈت امیر چند بموال اُس کے رکن اعلیٰ تھے۔ بموال صاحب صوبہ سرحد کے ابتدائی مجاہدوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ سرحد کانگریس کی تشکیل کا سہرا اُنہی کے سر بندھتا ہے۔ وہ بہترین تاریخ دان اور صحافی بھی ہیں۔ ہند سندیش کے مدیر فتح چند نسیم بھی اپنی سرفروشانہ اور صحافتی سرگرمیوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ بٹوارے سے قبل ڈیرہ وال سندیش نکالتے تھے۔ شری کنور بھان نارنگ کو بھی میں اسی گروہ میں شامل کرتا ہوں۔ انہوں نے بھی قلم اور زبان دونوں سے ملک کی خدمت کی ہے۔ عبدالغفار نام کی جو کتاب شری ٹنڈلکر صاحب نے انگریزی میں لکھی ہے، اُس کی تخلیق میں نارنگ صاحب کا کافی حصہ ہے۔ اُن کے علاوہ مظلوم دنیا، چنگاری، اتفاق، رہبر، پربھات، سرحد وغیرہ بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ اٹک پار کی دھرتی علم و ادب سے خالی نہیں ہے۔ آج بھی وہاں فارغ بخاری کا نام میرے لئے قابل احترام ہے۔ فارغ سے میرا کوئی تعارف نہیں لیکن بٹوارے کے بعد انہوں نے جس بے خوفی اور جرات سے اپنے پاکیزہ جذبات کا اظہار نظم اور نثر میں کیا ہے۔ میرے دماغ میں اس کا گہرا اثر ہے چونکہ میرا یہ مضمون پاکستان بننے سے پہلے تک ہی محدود ہے۔ اس لئے آج کے ان شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ذکر نہیں کر رہا جن کی بدولت اٹک پار کی کنکریلی دھرتی علم وادب کے شہہ پاروں سے اَٹی پڑی ہے۔ اس مضمون کا تعلق ان شاعروں، ادیبوں سے بھی نہیں جو صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں اور آج بھی ہندوستان کے مختلف گوشوں میں نظم ونثر کے جواہرات بکھیر رہے ہیں لیکن اپنی تصنیف ''بٹوارے کے بعد کی یادیں'' میں اُن دوستوں کا ذکر کروں گا۔ شاعروں اور نثر نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ آزادی کے دور میں بھی مجھے چند کتابیں لکھنے کا موقع ملا اور پاکستان بننے کے بعد بھی کئی کتابیں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ غالباً ان سب کی تعداد 30 ء سے اوپر ہی ہوگی! رہا سوال مضامین کا سو یہ کہنا میرے لئے مشکل ہے کہ اُن کی تعداد کس قدر ہوگی، بہر حال لکھنا پڑھنا، میرا شوق ہی نہیں عادت بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

# پٹھانوں کے دیس میں

آزادی کی جدوجہد میں ہندوستان کے راہ نماؤں نے صوبہ سرحد کو بنیاد بنایا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جان چکے تھے کہ جب تک پٹھانوں کو اپنی طرف نہیں کریں گے آزادی کی لڑائی تیزی سے نہیں لڑی جاسکتی، اٹک پار کا علاقہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جہاں کے لوگوں نے انگریزی حکومت کے خلاف پرچم بغاوت بلند کیا تو فرنگی سرکار بوکھلائی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان کے کسی رہنما کو پٹھانوں کے دیش میں آنے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ لیکن کب تک؟ اٹک پار کی کنکریلی دھرتی پر بڑے بڑے لیڈروں نے قدم رکھا۔ پٹھانوں نے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں اور یقین دلایا کہ وہ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ میں نے اپنی سیاسی زندگی میں سب سے پہلے محمد علی جوہر کو دیکھا۔ جب وہ پشاور آئے، پٹھانوں سے ملے اور آزادی کے نغمے فضاؤں میں بکھیر دیئے۔ چند ہی دنوں بعد بابا کھڑک سنگھ تشریف لائے اور انہوں نے پٹھانوں کو اپنے خیالات سے اس قدر متاثر کیا کہ ہندو مسلم کی تفریق ختم ہوگئی۔ ہندو، مسلم اور سکھ تینوں نے قدم سے قدم ملا کر برطانوی حکومت کا مقابلہ کیا۔ یہ ابتداء تھی ہندوستانی رہنماؤں کے یہاں آنے کی، پھر تو لیڈروں کا تانتا ہی بندھ گیا۔ آج مولانا ظفر علی خان آرہے ہیں، تو کل عطاء اللہ شاہ بخاری کی آمد ہے۔ جلسے اور جلوسوں کا دور شروع ہوگیا۔ گاندھی جی نے پٹھانوں کے دیش میں قدم رکھا تو سرحد کے لوگوں میں نئی زندگی آگئی۔ نئی اُمنگ نیا جذبہ۔ یہ پہلا موقع تھا جب پٹھانوں نے لال کپڑے پہن کر گاندھی جی کو یقین دلایا کہ وہ عدم تشدد کو اپنا ایمان بنا چکے ہیں، اُنہوں نے بندوق پھینک دی ہے اور امن کی راہ اپنا لی ہے۔ اور گاندھی جی نے دیکھ کہ واقعی پٹھان بدل گیا ہے اور یہ تبدیلی اُس عظیم رہنما کی لائی ہوئی ہے جسے باچا خان کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے لوگ جسے پیار سے "سرحدی گاندھی" کہتے ہیں اور دنیا کی نظروں میں وہ عظیم مجاہد ہیں اسی لئے ایک بار

گاندھی نے کہا

''مجھے پٹھانوں سے اس لئے محبت ہے کہ وہ بہادر ہیں۔ انہوں نے بندوق پھینک کر عدم تشدد کی راہ اختیار کر لی ہے اور یہ ساری تبدیلی عبدالغفار خان کی وجہ سے ہے جسے وہ پیار سے باچا خان کہتے ہیں۔''

گاندھی جی دو بار پٹھانوں کے دیش میں آئے۔ بابو راجندر پرشاد، سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد بھی پٹھانوں سے ملے۔ یہ بات اُن دنوں کی ہے جب صوبہ سرحد میں پہلی بار کانگریس وزارت کی تشکیل ہوئی۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اُس وقت کانگریس کی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں لیکن جو اہمیت خان وزارت کو ملی، وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اُس وزارت نے برطانوی حکومت کا یہ دعویٰ غلط ثابت کر دیا کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں اور پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب انتہا پسند جماعتوں کے راہنما سرحد میں آنے لگے۔ چاریہ نریندر دیو، یوسف مہر علی، منشی احمد دین، مبارک ساغر، اور شری مسانی نے پٹھانوں کو سوشلزم کا نعرہ دیا۔ حالات پلٹے تو سبھاش چندر بوس نے پشاور میں قدم رکھا۔ فضاؤں میں نئے گیت گونجے اور سبھاش بابو پٹھانوں کی محبت اور خلوص سے اتنے متاثر ہوئے کہ جب انہوں نے ہندوستان چھوڑا تو سرحد کے راستے ہی سے غیر ممالک میں گئے۔ جب جواہر لال نہرو پٹھانوں کے دیش میں آئے تو فرنگی حکومت بڑی سٹ پٹائی اور اپنے پٹھوؤں کے ذریعے نت نئے ہنگامے کھڑے کروا دیئے لیکن نہرو کے لئے پٹھانوں نے جو خلوص پیش کیا، اُس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ 42ء کے انقلابی دنوں میں جے پرکاش کا نام لوگوں کی زبان پر آ گیا۔ پٹھان بڑے اشتیاق سے اُس جانباز انقلابی کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھے حالانکہ وہ اِس سے پہلے ایک بار پشاور آ چکے تھے۔ اُن دنوں عام لوگ اُن کے نام سے متعارف نہ تھے۔ انہوں نے پشاور میں ایک جلسے میں لوگوں سے خطاب کیا۔ جے پرکاش بابو دوسری بار پٹھانوں سے نہ مل سکے لیکن اُنکے دلوں میں اپنی یاد کے گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ ایک بار خالدہ ادیب خانم بھی پٹھانوں کے دیش میں آئیں۔ جب لوگوں نے اُسے دیکھا اور انقلابی تذکرے سنے تو وہاں کی عورتوں میں بھی نئی زندگی کا لہو دوڑنے لگا۔ القصہ سرحد کے لوگ ہندوستان کے رہنماؤں سے روشناس ہوتے رہے۔ مولانا حفیظ الرحمن، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، اندر گاندھی، ڈاکٹر سیف کچلو، ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر سید محمود، شیخ محمد عبداللہ، بھولا بھائی ڈیسائی،

مہا دیو ڈیسائی، شری پیارے لال نیّر نے بھی پٹھانوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور اتنا ہی نہیں، وہاں کے انقلابیوں نے بھی سرحد کو ہی اپنا اڈہ بنایا۔ بنگال ور پنجاب کے انقلابی خاص طور پر اس راستے سے افغانستان اور روس جاتے رہے۔ میرے لئے یہ بات انتہائی خوشی کی ہے کہ ان رہنماؤں اور انقلابیوں سے مجھے بھی کبھی کبھار ملنے کا موقع ملتا رہا۔ مجھے اُن کی قربت حاصل رہی۔

# انقلاب کی راہ پر

☆ 1901ء میں صوبہ سرحد نام کے ایک الگ تھلگ صوبے نے جنم لیا۔ اس سے قبل یہ علاقہ کمشنر کرنل میکسن کے ماتحت تھا۔ یہ بات 1849ء کی ہے۔ انہی دنوں ایک پختون مجاہد نے کرنل میکسن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ نامعلوم مجاہد کو قتل کی پاداش میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ غالباً یہ پہلی سیاسی پھانسی تھی۔ صوبہ سرحد کا پہلا سیاسی قتل اوسا خان کا ہو جس نے انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا آواز بلند کی تھی۔ خدا بخش خاں بھی ابتدائی شہیدوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اُسے 1919ء میں حویلیاں ضلع ہزارہ کے ریلوے اسٹیشن پر گولی سے اُڑا دیا گیا تھا، پھانسی پانے والوں میں شری پریتم خان، شری ہری کشن، شری حبیب نواز اور عبدالرشید کا نام سرحد کی تاریخ میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ پنڈت رام چندر بھاردواج بھی آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اُنہی کی ان تھک کاوشوں سے پشاور میں پہلی بار 1906ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد پنڈت رام چندر امریکہ چلے گئے اور وہاں غدر پارٹی سے وابستہ ہو گئے۔ پختون مجاہدوں میں شیر علی خاں افغان کا نام آج بھی سرفہرست ہے جس نے انڈیمان جیل میں لارڈ میو وائسرائے ہند کو اپنی چھری سے ہلاک کر دیا تھا اور جام شہادت پی گئے۔

☆ یکم دسمبر 1915ء کو کابل میں پہلی بار آزاد ہند حکومت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ راجہ مہندر پرتاپ صدر، ڈاکٹر برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا عبیداللہ سندھی وزیر داخلہ بنائے گئے، پنڈت امیر چند بموال عارضی حکومت کے سیکرٹ ایجنٹ مقرر ہوئے اور سید بخاری آزاد حکومت میں خاص ممبر بنائے گئے۔ یہ دونوں دیش بھگت پشاور سے تعلق رکھتے تھے۔ آزاد حکومت کی سرگرمیوں کا مرکز بھی پشاور ہی تھا۔ وہاں آزاد ہند کے نام سے باغیانہ پوسٹر چھاپے جاتے تھے اور لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا جاتا تھا۔

☆ 1917ء میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے 12 ہزار قبائلی قوم پرستوں نے ایک مضبوط فوج تیار کی جس کا مقصد یہ تھا کہ وقت مقررہ پر انگریز چھاؤنیوں پر حملہ کر دیا جائے۔ فوج کی تنظیم شمال سے جنوب تک سارے علاقے میں کی گئی اور ایک دن پوری طاقت سے سرحد کی انگریزی چوکیوں اور چھاؤنیوں پر زوردار حملہ کیا گیا۔ بلوچستان کے مقام پر پاؤنڈ خان نامی فوجی نے امریکہ سے آکر ایران کے راستے انگریزوں پر حملہ کیا۔ جگہ جگہ جم کر لڑائیاں ہوئیں۔

☆ انگریزی دور میں آزادی کی تحریکات کے ساتھ ساتھ مختلف پیشہ ورانہ تحریکیں بھی منظر عام پر آتی رہتی تھیں، اُن میں حصہ لینے والے الگ الگ خیالات کے لوگ ہوتے تھے لیکن اختلافات کے باوجود بھی آزادی کی جدوجہد میں سبھی برابر شریک تھے۔ صوبہ سرحد بھی اس نوعیت کی تحریکوں سے وابستہ رہا۔

☆ جب گاندھی جی نے خلافت کا سبز پرچم لہرایا تو سارے ملک میں خلافت کی تحریک چل نکلی۔ پختون بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، سرحد میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ اس کا پہلا جنرل سیکرٹری سردار گوربخش سنگھ تھا، ہندو مسلم اتحاد کا یہ پہلا شاندار ثبوت تھا۔

☆ سرحد کے لوگوں نے رولٹ بل تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ شہر و دیہات اور آزاد قبائل کے باشندے بھی اس اندولن میں شامل ہو گئے۔ پشاور اور اتمان زئی میں یہ تحریک بڑے زوروں سے چلی، اور اس کا اثر آزاد قبائل پر بھی ہوا۔

☆ پرنس آف ویلز کی آمد بھی پشاور کے لوگوں میں سیاسی ہلچل کا باعث بنی، لوگوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا، پشاور کے چوک یادگار پر سواگتی تقریب شور وغل میں ادھوری رہ گئی۔ پرنس صاحب دم دبا کر بھاگ نکلے اور فرنگیوں کے گھروں میں تاریکی چھا گئی۔

☆ ہندوستان سے ہوتا ہوا جب سائمن کمیشن اٹک کے اُس پار پشاور کی سنگلاخ دھرتی پر جلوہ گر ہوا تو سرحد کے لوگوں نے سیاہ جھنڈیوں سے زوردار مخالفت کی، حکومت کی تمام حفاظتی تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ پشاور کا گوشہ گوشہ کالے پرچموں سے ڈھک گیا، کالی پٹیاں، کالے بلے اور کالے ماٹوز

☆ گاندھی جی نے جب نمک بنانے کا اندولن چھیڑ دیا تو صوبہ سرحد کے لوگ بھی اس راستے پر چل پڑے۔ پشاور کے شاہی باغ میں عظیم الشان اجتماع ہوا، وہاں نمک بنایا گیا اور اُس کی

پڑیوں فروخت کی گئیں۔ نمک بنانے والوں میں خان علی گل خاں پیش پیش تھے۔

☆ غلہ ڈھیر کسان تحریک نواب غلام طورو کے نت نئے نظام کے خلاف انوکھی قسم کی بغاوت تھی، سرحد کے سوشلسٹوں نے تحریک کی قیادت کی، تحریک کا مرکزی دفتر غلہ ڈھیر کے اُس مکان میں تھا جہاں شہید ہری کشن نے جنم لیا اور جس کے پہلو میں شری بھگت رام، شری جمنا داس اور کشوری لال جیسے مجاہدوں نے پرورش پائی اور جہاں لالہ گرداس مل کی وطن پرستی نے آزادی کے گیت بکھیر دیئے، یہ تحریک ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔

☆ ڈاکٹر خان صاحب کے فرزند عبید اللہ خان نے مفتی آباد کے کسانوں کو منظم کر کے کسان تحریک چلادی۔ اُنہی دنوں ڈاکٹر خان صاحب کے دوسرے لڑکے بیرسٹر جان محمد کا انتقال ہوگیا جس پر ڈاکٹر خان صاحب سے کہا گیا کہ وہ عبید اللہ خاں کی رہائی کا حکم دے دیں تا کہ وہ اِس ماتم میں شریک ہوسکیں۔ ڈاکٹر خان صاحب نے جواب دیا کہ قانونی دائرے کے اندر رہ کر وہ رہائی کے لئے درخواست کرسکتا ہے۔ اپنے اور بیگانہ میں کوئی امتیاز میرے نزدیک مناسب نہیں۔ یہ تحریک بھی صوبہ سرحد میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

☆ صوبہ سرحد کی تاریخ میں ہزارہ کسان کانفرنس بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ پہلی عظیم الشان کانفرنس تھی جس میں ہزارہ کے قبائلی باشندے اور خاص طور پر درّہ کاغان کے کسان پیدل چل کر مانسہرہ پہنچے۔ کانفرنس کی صدارت سردار عبدالرب نشتر نے کی، ملک امیر عالم اعوان، مولانا عبدالحئی، میاں عبدالقیوم، مولانا عبدالرؤف، شری محمد فاروق اور حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی بے لوث قیادت کانفرنس کو حاصل تھی۔

☆ علامہ عنایت اللہ خان مشرقی کی رہنمائی میں خاکسار تحریک بھی وقتاً فوقتاً اپنا سر اُٹھاتی رہی، خاکسار جماعت کا جنم پشاور میں ہوا تھا۔ اُن دنوں علامہ مشرقی اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر تھے، خاکساروں میں زیادہ حصہ لینے والے کارکن وہی تھے جو سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن میں بشیر احمد کا نام قابل ذکر ہے، وہ بڑے مخلص اور ایماندار کارکن تھے، اور غازی عبدالرشید کے چچیرے بھائی تھے۔ پشاور کا ایک ہندو نوجوان بھی اس جماعت کا نمایاں رکن تھا۔

☆☆☆☆☆

# تاریک دن تاریک راتیں

تاریک دن اور تاریک راتیں ۔ جب یہ اندھیرے واقعات میری یادوں کے پردے پر رقص کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ خواب تھا۔ وحشت ناک خواب۔ لیکن سپنے کی باتیں تو بھول جاتی ہیں پھر یہ خواب تھا یا حقیقت؟

مجھے آج بھی وہ انسانیت سوز منظر دکھلائی دیتے ہیں جب انسان نے انسان کے گلے پہ چھری پھیری۔ جب آگ اور خون کے فواروں میں حیوانیت ننگی ہوکر ناچی۔ ہندو نے رام اور کرشن کے نام پر تلوار کے جوہر دکھلائے۔ مسلمان نے اللہ اکبر کے مقدس نعروں سے انسانیت کے ٹکڑے کر دیئے اور سکھ سورماؤں نے ست سری اکال کہہ کر لہو کے دریا بہا دیئے۔ رحم دلی اور شرافت نے تنگ دلی اور ذلت کا روپ بدل لیا اور اس ڈراؤنے روپ نے زندگیوں کے چراغ بجھا دیئے نہ مرد بچا نہ عورت ۔ نہ بچے محفوظ رہ سکے ۔ اور یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ امن اور آزادی کے نام پر ۔ انگریزی حکومت نے جاتے جاتے یہ گل کھلائے۔ سگے بھائیوں نے آپس میں دشمنی مول لی۔ زندگی بھر کی لڑائی۔ متحدہ ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ ہندوستان اور پاکستان۔ دو الگ الگ ملک۔ ایک بدن کے دو ٹکڑے۔ 14 اگست کی نصف رات کو پاکستان نے پرچم لہرا کر دو قوموں کی تھیوری کو جنم دیا اور ہندوستان 15 اگست کی اجالی صبح کو ترنگے کے سائے تلے آزادی کے گیت گانے لگا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا اسی کا نام آزادی ہے۔ اس بے بہا تحفے کے لئے ہم نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ برسوں جیل میں رہے۔ قید و بند کی مصیبتیں اُٹھائیں۔ ننگی چھاتیوں پر گولیوں کے وار سہے۔ پھانسی پر جھول کر وطنیت کے ترانے گائے۔ جوانوں نے اپنے شباب کی رعنائیاں عروس حریت پر نچھاور کر دیں۔ بوڑھوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیا۔ جاں نثاروں میں سبھی تھے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان ایک

دھرتی، ایک آسمان۔

وہ دن تھے کالے دن۔ وہ راتیں سیاہ راتیں۔ جب ہم چھپ چھپ کر آزادی کے کرشمے دیکھتے تھے۔ دن قتل و غارت میں گزرتا تھا۔ رات آگ کے بھیانک شعلوں میں جھلستی تھی۔ بچارا ہندو رات بھر جاگ جاگ کر زندہ رہنے کی کوشش کرتا تھا اور بدنصیب مسلمان کانپ کانپ کر موت کے آہنی جبڑوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اپنے کوچے میں نہ تھا۔ میرے مسلمان ساتھی چھپ چھپا کر کوچے کے بڑے دروازے پر آکر میری خیریت پوچھ لیتے تھے۔

وہ مسلمان تھے لیکن غم زدہ۔ کچھ تو اس لیے کہ اُن کے ساتھی زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہے تھے اور کچھ اس لئے پاکستان کے خلاف تھے کہ سیاسی چپقلش تھی۔ مسلم لیگ ان کے خلاف تھی۔ اُن پر بھی حملے ہوتے تھے۔ اُن کے گھروں پر بھی آگ کے گولے پھینکے جاتے تھے۔ لیکن جہاں کانٹے ہوتے ہیں وہیں پھول۔ فسادات میں ان کا ہاتھ تھا لیکن مسلم لیگی ہمارے معاون بھی تھے۔ بسا اوقات اُنہی لوگوں سے سودا سلف بھی منگوا لیا کرتے تھے۔ بابو نام کا ایک غنڈہ فساد میں پیش پیش تھا لیکن وہ اپنے کئی ہندو دوستوں کا محافظ تھا۔

جس گھر میں اُن دنوں میرا قیام تھا، اُسی میں میرے دوست چندر کو کب، مہاتما سراج، سوم ناتھ گھئی، شری لانبہ وغیرہ بھی تھے۔ ہم دوست دن بھر پنے گھر کے اندر بیٹھ کر گپیں اُڑاتے تھے اور رات کو سوتے تھے۔ ہمارے محلے میں ڈاکٹر خان صاحب کے بڑے لڑکے عبیداللہ تھے اور اُن کے ساتھ خدائی خدمت گار۔ یہ لوگ ہندو کو بچاتے تھے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر چوکیداری کرتے تھے۔ دن کو سکھوں کی حفاظت کرتے تھے۔ یہ دن اور رات ڈراونے بھی تھے اور پُر لطف بھی۔

ایک دن دہلی سے آئے ہوئے ایک مہاجر ہمارے محلے کے ایک مکان پر قابض ہو گئے۔ یہ مکان ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ فسادات سے پہلے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ مہاجر صاحب ان بے بہا چیزوں کو دیکھ کر بوکھلا اُٹھے۔ بچارے تھے تو میری ہی طرح کے غریب لیکن دعویٰ کرتے تھے لکھ پتی ہونے کا۔ حضرت نے چند ہی دنوں میں سامان بیچ کر راہ فرار اختیار کی۔

اُنہی دنوں ایک صاحب اور تشریف لائے۔ پولیس کی مدد سے ایک بڑے مکان پر قابض

ہو گئے۔ کمرے کے اندر ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک کونے میں بڑا سا ''ریڈیو گرام'' پڑا ہوا تھا۔ ہم نے کہا خان صاحب ریڈیو کھولیے، طبیعت بہل جائے گی۔ فرمانے لگے بھائی تم ہی کھولو۔ بات دراصل یوں ہے کہ میرے گھر میں نوکر ریڈیو کھولا کرتے تھے، مجھے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی کہ ریڈیو کھولوں اور بند کروں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مہاجر صاحب امرتسر سے تشریف لائے ہیں اور وہاں پرانی بوریاں بیچا کرتے تھے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو مہاجر بھی پاکستان میں آیا اور جو شرنارتھی بھی پاکستان سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ اُس نے لاکھوں کروڑوں کی باتیں ہی کیں۔ حالانکہ اُن میں سے اکثر پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ اور جو واقعی لکھ پتی تھے وہ بے چارے شرم کے مارے کچھ نہ حاصل کر سکے۔ کون جانے ان فلک بوس کوٹھیوں اور بنگلوں میں کتنے دھوبی، نائی، حلوائی، ڈھابے والے کباڑی، اخبار کے ہاکر، ٹوٹی پھوٹی بوتلیں بیچنے والے اور معمولی نوعیت کے حضرات جلوہ گر ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان خوبصورت موٹروں میں کروٹیں لینے والے صاحب بہادر فاقے پر فاقے کرتے تھے۔ یہ تو خدا بھلا کرے مسٹر جناح کا جس کے صدقے بٹوارہ ہوا اور دھوں جھونکنے والے پھولوں کی سیج پر سونے لگے اور پھر اتنا ہی نہیں یہ تو پاکستان ہی کی دین ہے کہ مجھ جیسا غریب آدمی بھی ہوائی جہاز کی سیر سے لطف اندوز ہوا۔ جس نے ہچکولے کھاتی بیل گاڑی پر سیر نہ کی تھی، وہ آسمان پر پرواز کرنے لگا واہ ری سیاست تیرا بول بالا۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا بھول بسری ایک رات کچھ غنڈوں نے ایک ہندو محلے میں آگ لگا دی۔ ہوا بڑی تیز تھی جس سے آگ کا رُخ ہندو محلے سے ہٹ کر مسلمان محلے کی طرف چلا گیا۔ وہ بے چارے گھر بار چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ سارے محلے میں کہرام مچ گیا۔ اللہ اکبر کی صدائیں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ چیخ وپکار نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ آباد گھر برباد ہو گئے۔ دوسرے دن سے غنڈوں نے آگ لگانے کا پروگرام ختم کر دیا۔ آگ کے ڈر سے بے چارے ہندو اور مسلمان دونوں اپنے گھروں پر پانی چھڑکتے رہتے تھے اور اتنا ہی نہیں ان فسادات کے وحشت ناک دور میں ہندو نے ہندو کو قتل کر دیا اور مسلمان نے بے چارے مسلمان سے پرانا بدلہ لے لیا۔ اور پھر دونوں نے ایک دوسرے پر الزام تراشنے شروع کر دیے۔ میرے سگے ماموں بشیشر ناتھ کو ایک مسلمان نے دن دہاڑے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ گولی مارنے والا میرے ماموں کا

قرض دار تھا اور میرا ماموں اُس سے بڑھ چڑھ کر سود لیتا تھا۔ قاتل نے گولی مارتے وقت نعرہ تکبیر بلند کیا تھا۔

اُنہی دنوں پشاور کے مسلم لیگی ایک دربار لگایا کرتے تھے اور لوٹ مار کا مال آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے۔ وہ صرف ہندوؤں کو ہی نہیں بلکہ غیر لیگی مسلمانوں کو بھی بُلا کر بے عزت کرتے تھے۔ لیکن اُن میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ہندو، سکھ دوستوں کی حفاظت بھی کرتے تھے۔ ہاں یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ صوبہ سرحد اور خصوصاً پشاور میں فسادات کی رفتار فرقہ وارانہ کم اور سیاسی زیادہ تھی۔ فتنہ انگیزی کا سب سے پہلا وار سرحد اسمبلی کے ہندو سکھ ممبروں پر ہوا جن کی موجودگی میں لیگی وزارت نہ بن سکتی تھی اور دوسرا سیاسی جماعتوں خصوصاً سرخ پوشوں پر ہوا جنہیں مخالف سمجھا جاتا تھا۔ انہی اوچھے ہتھیاروں سے عبدالقیوم بیرسٹر کی حکومت زندگی کے آخری سانس لیتی رہی اور میں یہ بات بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے صوبے کے مسمان اتنے شدید فرقہ پرست نہ تھے جتنے پنجاب اور دوسرے صوبوں کے تھے۔ مجھے اُن لیگیوں پر بھی ناز ہے جنہوں نے فرقہ پرستی کی آگ میں بھی دوسرے فرقے کے لوگوں کی حفاظت کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ فسادات کے انہی وحشت ناک دنوں کی بات ہے جب مجھے اپنے دوستوں نے کہا کہ اس آڑے وقت میں ایک خط باچا خان کو لکھا جائے۔ میں جانتا تھا کہ اس ہنگامے میں بچارے باچا خان کر ہی کیا سکتے ہیں۔ پھر بھی میں نے ایک خط ان کے نام لکھا اور بڑے پُراسرار ڈھنگ سے مرکز میں بھجوا دیا۔ خدا جانے یہ خط اُن تک پہنچا یا نہیں۔ اُنہی دنوں میں نے بیرسٹر عبدالقیوم کو بھی فون کیا اور کہا کہ آپ بے شک اس وقت لیگی وزیراعظم ہیں لیکن آپ سے ہمارے گہرے سیاسی مراسم رہ چکے ہیں۔ اس ناطے سے ہم لوگوں کو ہندوستان بھجوا دو۔ فون بیرسٹر صاحب نے خود ہی اُٹھایا تھا اور کہا تم کہاں سے بول رہے ہو۔ اپنا ٹھکانہ بتا دو۔ میں تمہیں عملہ بھجوا کر اپنے پاس بلوا لیتا ہوں۔ میں اپنے ٹھکانے کا پتہ دینے ہی والا تھا کہ میرے ایک ساتھی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس طرح فون کٹ گیا۔ میں نے ساتھی سے کہا بہت ہی برا ہوا۔ قیوم صاحب اس بات چیت سے بگڑ جائیں گے اور بدلہ لیں گے لیکن اچھا ہوا۔ یہ بات آئی گئی ہو گی۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم خوف کے مارے اس گھر سے یوں بھاگے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اُس رات مجھے نیند نہ آ سکی۔ اس بات کو آج برسوں بیت حالات نے رُخ پلٹا۔ فتنہ وشر

کے شعلے راکھ ہو گئے۔

قیوم کا دعوئی دور ختم ہو گیا۔ بیچارہ بیرسٹر آج پاکستان کی سڑکوں پر لاوارثوں کی طرح گھومتا پھرتا ہے اور یہ مصرعہ اُس کے لبوں پر تھرک رہا ہے۔ ؎

''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں''

فسادات کے دنوں مجھے طویل عرصہ تک پشاور شہر کے ایک محلہ ڈھوناں میں رہنا پڑا۔ یہ محلہ انگریزی دور میں انقلابیوں کا مرکز کہا جاتا تھا۔

شریمتی جولا دیوی، جوالا داس ڈھون اور پشاور ریوے بم کیس کے انقلابی بھی اسی محلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس محلہ میں درگاہ پیر رتن ناتھ بھی تھی۔ ہنگامے کے دنوں میں محلہ ڈھوناں کو لینن گراڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی، پشاور شہر کے گردونواح میں گاؤں سے لاتعداد ہندو اور سکھ اس محلے میں آکر اکٹھے ہو گئے تھے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو حفاظت سے یہاں پہنچانے میں خود مسلمان پیش پیش تھے۔ ایک گاؤں کی بات سُن لیجیے۔

گاؤں میں دو بڑے زمیندار تھے۔ جب فسادات شروع ہوئے تو کانگریسی خان کے حلقے میں رہنے والے ہندوؤں نے کہا کہ آپ ہمیں پشاور پہنچا دو۔ یہاں اب زیادہ دنوں تک رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ کانگریسی خان نے سب کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ہندوؤں کے گھروں پر پہرے لگا دیئے۔ اور ہندوؤں کے گھروں میں ضروریات کی چیزیں پہنچانی شروع کر دیں۔ جب لیگی خان کو پتہ چلا کہ کانگریسی خان کے حلقے میں پہرے لگا دیئے گئے ہیں تو لیگی خان نے بھی پہرے لگوا دیئے اور ہندوؤں کے گھروں میں ضروریات کی چیزیں پہنچانی شروع کر دیں۔ لیگی خان نے ہندوؤں سے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں، کسی کی اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے علاقے میں آکر آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس گاؤں سے جو پہلا ہندو قافلہ پشاور آیا وہ بھی لیگی خان کا تھا۔ پشاور کے شہری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ درجنوں لاریوں میں سبز پرچم لہرا رہے تھے اور اُن میں سے ہر ایک بس میں ہندو سکھ مرد عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ لاریوں پر چاروں طرف مسلمان خدائی خدمت گار پہرہ دے رہے تھے تاکہ کوئی شرارتی ہندوؤں کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ لیگی خان نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ کہیں کانگریسی خان مجھ

سے بازی نہ لے جائے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ لیگی خان اپنے حلقے کے ہندوؤں کو نہ بچا سکا۔ فسادات کے دنوں میں سب سے زیادہ نقصان سیاسی لوگوں کو پہنچا۔

بہر حال اُن دنوں کی یادیں ایک طویل داستان ہیں۔ کوئی کہاں تک بیان کرے۔ یہ داستانیں خون کے آنسوز لاتی ہیں اور قہقہے بھی بکھیرتی ہیں۔ دوستوں کی دشمنی اور دشمنوں کی دوستی اس داستان کا نمایاں پہلو تھا اور اِس داستان کو سمیٹے ہوئے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے پیارے وطن سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا حالانکہ میرے مسلمان دوست، کسی صورت سے بھی نہیں چاہتے تھے کہ برسوں کا اُن کا ساتھ چھوٹ جائے، وہ بے چارے بڑے دکھی تھے۔ اُن کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جب میں ہوائی جہاز میں پرواز کر رہا تھا تو میرے سامنے اپنے شہر کی وہ دھرتی تھی جس پر میں نے اپنے شباب کی رعنائیاں نچھاور کر دی تھیں، لہلہاتے کھیت تھے، جہاں انگریزی سامراج سے لڑتے ہوئے کئی بار مجھے چھپنا پڑا تھا، چھوٹے بڑے بازار، گلیاں، چوک، ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیاں، تحصیل، گاؤں اور شہر میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے، میری نظریں بار بار اپنے وطن کی طرف ہی اُٹھتی تھیں، خوبصورت پہاڑ، موجزن دریا، گرتی آبشاریں، جھومتے پودے اور ہراتے رنگ برنگے پھول مجھے اپنی سمت کھینچتے تھے، میری نظریں اب بھی پشاور کی عظیم الشان مسجد قاسم خان کی طرف اُٹھ رہی تھیں جہاں میرے سیاسی گورو مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی قبر تھی، مجھے اب بھی مرکز سرد ریاب دکھلائی دے رہا تھا جہاں انسانیت کا پرستار بیٹھا ہوا فرنگیوں کی کامیاب چالوں پر خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ میرے سامنے وہ لاکھوں خدائی خدمت گار تھے، لاتعداد مجاہد تھے، قصہ خوانی بازار تھا جہاں باچا خان نے آزادی کا بگل بجایا اور گاندھی جی نے محبت سے پٹھانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میرا وطن نظروں سے اُوجھل ہو رہا تھا، لیکن دماغ چکرا رہا تھا، کیا یہ آزادی ہے، ہماری قربانیوں کا نتیجہ جلاوطنی ہے، کیا میں ہمیشہ کے لئے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور ہمدردوں کی نظروں سے دور ہو جاؤں گا، کاش یہ آزادی۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

دوسرا حصہ

# دستاویزات

دستاویز(1)

# منزل کی طرف: پولیٹیکل کانفرنس 1945ء کی رُوداد

## مقدمہ

### فخرِ افغان خان عبدالغفار خان

### (پشتو سے ترجمہ)

پشاور کانگریس کمیٹی پولیٹیکل کانفرنس پشاور کی مکمل رُوداد شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، مجھ سے کہا گیا ہے کہ آزاد قبائل کے نام کچھ پیغام ان کو لکھ کر دوں، لہٰذا یہ چند سطریں سُپردِ قلم کرتا ہوں۔

آزاد قبائل کا مسئلہ کافی عرصہ سے میرے زیرِ غور رہا ہے۔ میں نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ یہ بات کئی بار واضح کی ہے کہ صوبہ سرحد کیا سارے ہندوستان کا مستقبل آزاد قبائل کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ ہم صوبہ سرحد کے رہنے والے آزاد قبائل کے لوگوں کو کسی حالت میں بھی اپنے سے الگ نہیں سمجھتے، ان کی تکلیف اور راحت کو ہم اپنی تکلیف اور راحت سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائی ہے جو آئے دن اُن پر ڈھائے جاتے رہے ہیں، انگریز نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ہم کو اپنے ان بھائیوں سے الگ رہنے دیا جائے جن کی رگوں میں وہی خون دوڑتا ہے جس نے ہم کو اپنے ملک اور وطن پر مر مٹنے کے لئے کھڑا کر دیا ہے، ہم کو ان سے کافی عرصہ تک نہیں ملنے دیا گیا۔ لیکن ہمارا مطالبہ سچائی پر مبنی تھا، خدائی خدمتگار تحریک کے سلسلے میں اسلامی اور قومی اخوت کا پیغام ان تک پہنچانے میں کسی طاقت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ

ہمیں روکے، لہٰذا انجام کار کافی تگ و دو کے بعد ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور اگست 1942ء میں ہمارے سرفروش وفود نے علاقہ غیر میں جا کر قومی اخوت کا پیغام ان تک پہنچا کر دم لیا، یہاں میں ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ کس طرح ہمارے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے رہے، کس طرح ہمارے وفود کو بدنام کیا گیا اور کیسی شرمناک سازشوں اور بیہودہ پروپیگنڈا کے ذریعہ ہمارے ان سادہ لوح بھائیوں کو ہمارے خلاف اُبھارا گیا۔ لیکن قانونِ فطرت کے مطابق چونکہ فتح ہمیشہ حق ہی کی ہوا کرتی ہے اس لئے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ میں اس مختصر سی تحریر کے ذریعہ تمام لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آزاد قبائل کا مسئلہ ہمارا گھریلو مسئلہ بن چکا ہے اور وہ دن دُور نہیں جبکہ ہم خدائی خدمتگار تحریک کے مضبوط سلسلے میں ایک دوسرے سے منسلک ہو جائیں گے، یہاں میں یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں جتنی بھی قربانی ہمیں دینا پڑے گی ہم اس سے دریغ نہیں کریں گے۔

عبدالغفار
سرورِیاب کیمپ
7- جولائی 1945ء

☆☆☆

## مُدعائے تصنیف

پچیس برس کی مسلسل جدوجہد آزادی کے باوجود صوبہ سرحد میں سیاسی لٹریچر کے لئے کوئی ادارہ نہیں، تا کہ عوام کے ذہنی اور ملکی انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے منظم پروپیگنڈا کر سکیں، اور جب تک ایک انسان سیاسی تعلیم سے بے بہرہ ہو، اس کے لئے انتہائی مشکل ہے کہ وہ سیاسی و ملکی انقلاب کو سمجھ سکے، یا دوسروں کی رہنمائی کر سکے۔ واقعات کی روشنی میں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس ملک کے عوام میں سیاسی اقتصادی مسائل پر سوچنے کی اہلیت تھی، وہ قلیل عرصہ میں کامیاب ہوئے اور وہ لوگ اپنے عزیز ملک میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

ہمارا صوبہ قربانی کے لحاظ سے جنگ آزادی کے صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے، اور انہیں قربانیوں نے صوبہ سرحد کا نام روشن کر رکھا ہے۔ اس جذبہ حریت کا محرک فخرِ افغان خان عبدالغفار خان صاحب ہی ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے حب الوطنی کا پاکیزہ درس دیا۔ آج کل صوبہ سرحد میں سیاسی بیداری کا چراغ جگمگا رہا ہے، یہ آپ کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک سیاسی اقتصادی تعلیم کا تعلق ہے اس وقت تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا۔ اس ادارے کو قائم کرنے کے لئے کوشش کرتا رہوں گا ور ایسے بیدار مغز نوجوانوں کی ملک میں کمی نہیں جو ملک کے سیاسی اقتصادی مسائل پر ہر پہلو سے روشنی ڈال سکیں۔ ں سلسلے میں یہ پہلی اشاعت ہے جو آپ کے سامنے آئی ہے۔

پشاور پولیٹیکل کانفرنس میں ملک کے سربرآوردہ رہنماؤں نے شرکت کی۔ اور انہوں نے ملک کے سیاسی اقتصادی حالات پر قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا۔ لیکن وہ خیالات مکمل طور سے عوام کے سامنے اخباروں کے ذریعہ نہ پہنچنے پر ہم نے محسوس کیا کہ مکمل تقاریر کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر کے پیش کیا جائے، تا کہ عوام اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب کی تصنیف و تالیف کا سہرا کامریڈ رام سرن نگینہ کے سر پر ہے۔ جنہوں نے شب و روز کی مسلسل کوششوں سے اسے تکمیل تک پہنچایا۔

محمد افضل خان

جنرل سیکرٹری کانگریس کمیٹی، پشاور

☆☆☆

## پیش لفظ

8۔ اگست کو انڈین نیشنل کانگریس نے ایک قرارداد پاس کی، جس کا مدعا برطانوی حکومت سے سیاسی طور پر آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے میں ابھی وقت تھا کہ حکومت نے پیش قدمی کی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کر لیا۔

لیڈروں کی اچانک گرفتاری اور حکومت کی متشددانہ روش نے ملک بھر میں کھلبلی مچا دی، ادھر

جبروستم کی مشینری متحرک ہوئی، اُدھر سربکف نوجوانوں کے جذبات بیدار ہونے لگے۔ آزادی کے متوالے خندہ پیشانی سے انگریزی استبدادیت کا مقابلہ کرنے لگے۔ چند ہی مہینوں میں ہزاروں نوجوان تختہ ستم ہوئے، سینکڑوں وطن کے لال مُسکراتے ہوئے پھانسی پر چڑھ گئے۔ لاکھوں آدمی تیغ جفا سے مجروح ہوئے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سیم و زر کے خزانے لُٹا دیئے، نوجوان لڑکیاں سرِ بازار گولی سے اُڑا دی گئیں۔ درختوں سے لٹکا لٹکا کر نوجوانوں کو موت کے حوالے کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن صوبہ سرحد میں ایسی صورت نمودار نہیں ہوئی۔ یہاں کے لیڈر جیلوں سے باہر تھے۔ انہوں نے کانگریس کے پروگرام کے مطابق سول نافرمانی کا آغاز کیا، پُرامن احتجاج کا سلسلہ جاری کیا، مالیہ کی عدم ادائیگی کا اعلان کیا، حکومت سے مقاطعہ جوئی کا فیصلہ کیا۔ اس سول نافرمانی میں زیادہ موثر طریقہ ''کچہریوں پر حملہ'' تھا، یعنی عدالت پر پکٹنگ، سرخ پوشوں کا جتھہ پُرامن طور سے کچہریوں میں جاتا تھا اور متعلقہ حکام سے مستعفی ہونے کی درخواست کرتا تھا۔ عدم انکار کی صورت میں عدالت پر قابض ہو جاتا تھا اور اس طرح اسے گرفتار کیا جاتا تھا، یہ پُرامن ایجی ٹیشن صوبہ سرحد میں خوب کامیاب رہی۔ سرخ پوشوں کے گروہ در گروہ ''احتجاج'' کے لئے آتے تھے، اور پولیس کی لاٹھیوں کا شکار ہوتے تھے، ہر روز نوجوان شدید زخمی ہوتے تھے، حتیٰ کہ فخرِ افغان خان عبدالغفار خان بھی پولیس کی لاٹھیوں کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے، دیہاتوں میں جس قسم کا تشدد ہوا اگر اس کا اظہار کیا جائے تو ایک آدمی بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے، سرخ پوشوں کو پیٹنا، ندی نالے میں ڈبونا، گھوڑوں کی دم سے باندھ کر دوڑانا، پُرامن شہریوں کو تپتی ریت پر ننگے بدن لٹانا، خاردار جھاڑیوں پر سے گھسیٹنا، یہ جبروستم کے نئے طریقوں میں سے چند طریقے تھے، لیکن اس پر بھی حریت پرستوں کے ارادوں میں لغزش پیدا نہ ہوتی تھی، حکومت کا منشاء تھا کہ جہاں تک ہو سکے جبر و تشدد سے کام لیا جائے، لیکن کانگریسیوں کو جیل نہ بھجوایا جائے، اگر ایک دفعہ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، تو قیدیوں کو سنبھالنے کی گنجائش نہ رہے گی اور ساتھ ہی دنیا بھر میں اس تحریک کی نشوونما کا اثر پڑے گا، یہی وجہ تھی کہ ہمارے صوبے کی کانگریس خلاف قانون قرار نہ دی گئی۔ لیکن پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پیرو جواں مردانہ وار آزادی کی جنگ میں شامل ہوئے، جامِ شہادت نوش کیا، گرم گرم خون سے نخلِ حریت کو سینچا، لیکن جب رہائیاں شروع ہوئیں، تو لوگوں میں وہ جوش و خروش نظر نہ آیا، جو دورانِ جنگ میں تھا، انقلابی فضاؤں میں خاموشی

سی معلوم ہونے لگی، اس وقت صوبے کے چند حساس نوجوانوں نے سیاسی بیداری کی طرف توجہ دی، منتشر نوجوانوں کو ایک مرکز پر لانے کا تہیہ کیا۔

## پولیٹیکل کانفرنس

اس پیہم سرگرمیوں اور مسلسل کوششوں کا سہرا پشاور کانگریس کے سر پر ہے، جس کی متواتر سعی سے پولیٹیکل کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا، کانفرنس کی تجویز ماہ جنوری میں ہوئی، فروری میں ڈاکٹر سید محمود کو واردھا میں صدارت کے لئے کہا گیا، پہلے یہ کانفرنس 6-7-8-اپریل کو ہونا قرار پائی، لیکن فخر افغان کے مشورے سے تاریخوں میں تبدیلی کر دی گئی، یعنی 21-22-23-اپریل کو کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا۔ یہ تبدیلی سیاسی نوعیت کے لحاظ سے مفید ثابت ہوئی، اور ساتھ ہی کانفرنس کی تیاریوں میں بھی کافی وقت مل گیا۔

### غلط پروپیگنڈہ

مخالف گروہ اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر ہر جگہ یہ کہتا پھرتا تھا، کہ پولیٹیکل کانفرنس کا انعقاد کانگریس وزارت کو کامیاب بنانے کے لئے ہے، درحقیقت یہ ایک ایسا بہتان تھا جو سیاسی مفاد کے لئے کانگریس کے سر تھوپا گیا، واقعات یوں ہیں کہ کانگریس کمیٹی پشاور نے جنوری 1945ء میں کانفرنس کا فیصلہ کیا، اس وقت لیگی وزارت کے ٹوٹنے اور نئی وزارت کے بننے کی تجویز پایہء تکمیل تک نہ پہنچی تھی، لیگی وزارت 9-مارچ کو ختم ہوتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کانفرنس وزارت کی کامیابی کے لئے بلائی گئی یا سیاسی بیداری کے لئے، جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں یہ کانفرنس دو اہم مقاصد کے پیش نظر منعقد ہوئی۔

1- صوبہ کے منتشر سیاسی نوجوانوں کو ایک مرکز پر لا کر صحیح راہ پر گامزن ہونے کی تعلیم دی جائے۔

2- اس کانفرنس کے ذریعہ ہندوستان کے عوام تک کانگریس کا صحیح پیغام پہنچایا جائے اور ہند کی موجودہ سیاسی جدوجہد، برطانوی کشمکش اور بین الاقوامی صورت حالات پر گہرا غور کیا جائے۔ یہی دو وجوہات تھیں، جس کی وجہ سے ہندوستان بھر کی نگاہیں سرحد کے کانگریس اجلاس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اور اسی اہمیت کے پیش نظر معتبر اخبارات کے نمائندگان کی

خاصی تعداد پشاور پہنچی۔

## بے مثل اجلاس

جن لوگوں نے کانگریس کا سالانہ اجلاس دیکھا ہے۔ پشاور کانفرنس کا اجلاس دیکھ کر بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اجلاس کانگریس کے سالانہ اجلاس کا نعم البدل ہے، اندازہ لگایئے کہ افغان نگر میں ہر وقت ایک لاکھ کی تعداد میں لوگ رہتے تھے، پھر بھی آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، لوگ حیران تھے، کہ مسٹر چرچل اور ایمری یہ کہتے نہیں تھکتے کہ کانگریس ہندوستان سے ختم کر دی گئی ہے اور اب اس کا نام لیوا تک باقی نہیں رہا، برطانوی طاقت نے عوام کے انقلابی جذبات کو فنا کر دیا ہے، پھر یہ جم غفیر کانفرنس کے اجلاس میں مخلصانہ جذبات لے کر شریک کیوں ہو رہا ہے، درحقیقت اتنی بڑی تعداد دیکھ کر کھلے بندوں یہ کہنا پڑتا ہے، کہ کانگریس پہلے سے زیادہ منظم ہو چکی ہے، لوگوں کے حریت پرستانہ جذبات سیلِ رواں کی طرح اُمڈ رہے ہیں، صوبہ سرحد کے معصوم بچے، نوجوان اور بوڑھے اپنے گرم گرم خون سے نخلِ حریت کو سینچنے کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں۔ سرفروشانِ وطن، آزادی کی شمع پر مثلِ پتنگ خاکستر ہو جانے پر تلے ہیں۔ بڑی سے بڑی فرعونی طاقت کی برہنہ شمشیریں نوجوانوں کے بدن کا ایک ایک انگ جدا کر دیں تو بھی ان کی فرعونیت غلامی کی بنیادوں کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتی۔

### اہمیت

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس کانفرنس کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ تھی، اس لئے مقررین کے خیالات کو زیادہ سے زیادہ اشاعت دینے کی ضرورت سمجھی گئی۔ اجلاس کی پاس شدہ تجاویز سے چند تجویزیں جن پر ٹھوس اور پر معنی تقریریں کی گئی ہیں قابلِ مطالعہ ہیں۔ کانفرنس ختم ہو چکی ہے۔ لیکن یہ باتیں اب بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جن پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔

## 4- ستمبر کا ریزولیوشن

1942ء کی سیاسی تحریک میں جس طرح 8- اگست کا ریزولیوشن بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بعینہ صوبہ سرحد کی انقلابی تحریک میں 4۔ ستمبر 1942ء کا ریزولیوشن اہم ہے۔ صوبہ سرحد میں کانگریس وزارت کے قیام پر اس قرارداد کی حیثیت کچھ بدل سی جاتی ہے، جس کے متعلق فخر افغان فرماتے ہیں:

> 4۔ ستمبر کے ریزولیوشن کے متعلق مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ موجود ہے یا نہیں، ہم نے اعلان کیا ہے، وہ بدستور موجود ہے، آزادی یعنی اپنے ملک کے لئے اختیارات حاصل کرنا ہے، یہ ہمارا نصب العین ہے، اور اس جگہ ہم اپنے ملک کو پہنچانا چاہتے ہیں، یہ چیز بدستور اسی طرح موجود ہے، اب اس کو حاصل کرنے کے لئے پروگرام مرتب کیا جاتا ہے، ایک طریقہ ہوتا ہے اور ہم نے اسی طریقہ سے جدوجہد شروع کی تھی، لیکن دُنیا میں مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پروگرام ہمیشہ بدل سکتا ہے، لیکن نصب العین نہیں بدل سکتا، ہمارا نصب العین مکمل آزادی ہے، لیکن اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے جو پروگرام ہم بنائیں گے۔ وہ ایک نہیں ہوسکتا۔ آپ موجودہ جنگ کو دیکھیں اس میں جرنیل وقتاً فوقتاً اپنے پروگرام کو تبدیل کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کا نصب العین نہیں بدلتا اور پروگرام قوم اور قوم کی طاقت کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔

## تعلیم

ڈاکٹر سید محمود صاحب تعلیم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کانگریسی وزیر تعلیم کا کام ہے کہ صوبہ میں عوام کی تعلیم کا کام شروع کریں اور جاہلیت کی لعنت کو صوبے سے دُور کیا جائے۔

تعلیم کا مسئلہ اتنا ہی اہم ہے جتنا ضروریات زندگی کے دوسرے مسائل، تعلیم ہر ملک کی سماج کا آئینہ ہے۔

بقول چودھری افضل (مرحوم) تعلیم شرافت و تہذیب کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل ناممکن ہے۔

تعلیم پر قوموں کی زندگی اور ملک کی ترقی کا انحصار ہے۔ اگر آج ہمارے ملک کے بچے

زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو جائیں، تو یقیناً ہندوستان غلامی کی آہنی زنجیروں سے نجات حاصل کر لے گا۔ اچھی تعلیم ذہنی انقلاب پیدا کرتی ہے، اور ذہنی انقلاب ہی سماجی انقلاب کا منبع ہے۔

ہمارے محترم وزیرِ تعلیم کا اولین فرض یہ ہے کہ اس طرف توجہ دیں، اگر وہ چاہیں تو اس سلسلے میں ہم ان کے سامنے بہترین تجاویز پیش کر سکتے ہیں۔

## تعمیری پروگرام

تعمیری پروگرام پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وزارت کو اس طرف خاص توجہ دینا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ تمباکو کی کاشت کی جائے، سگریٹ بنانے کا کام شروع کیا جائے بنجر زمینوں کو آباد کیا جائے، اور کچھ نوجوانوں کو وظیفہ دے کر باہر کام سیکھنے کے لئے بھیجا جائے، شوگر فیکٹریاں کھولی جائیں اور کپڑے وغیرہ کی صنعت کو فروغ دیا جائے۔

مذکورہ تجاویز صوبے کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے میں مددمعاون ہو سکتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اگر صوبہ بھر کے ستم رسیدہ کسانوں کو منظم کیا جائے، انہیں تعلیم دی جائے، اور دیہات سدھار کے لئے نوجوانوں کو تربیت دی جائے تو بلاشبہ ہمارا صوبہ ترقی یافتہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے عمل کی ضرورت ہے، اور عمل کے ساتھ سنجیدگی کی۔

## سان فرانسسکو کانفرنس

اس قرارداد پر بحث کرتے ہوئے رائے بہادر مہر چند کھنہ نے فرمایا

ہم نے اتحادیوں کی خاطر جنوبی افریقہ کی خاطر پکنگ ایکٹ بھی برداشت کیا، ہم نے امریکہ کے بچاؤ کے لئے ایمی گریشن لاء بھی برداشت کیا، ہماری بہنوں نے ننگا رہنا منظور کیا، لیکن کپڑا جنگ میں دیا، ہم بھوکے مرے، لیکن آٹا اور غلہ باہر بھیجا، لیکن آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے، کہ نیوزی لینڈ جیسی طاقت کو جس کی آبادی صرف 13 لاکھ ہے کو حق نمائندگی مل سکتا ہے، لیکن ہندوستان کی سٹینڈنگ آرمی جو جنگ میں حصہ لے رہی ہے، 25 لاکھ ہے، لیکن ہندوستان کو حقِ نمائندگی نہیں مل رہا،

ہماری نمائندگی کا حق صرف ایمری اور چرچل کو ہے۔ آج دو ڈیلیگیٹ
سان فرانسسکو کانفرنس میں بھجوائے جا رہے ہیں۔ وہ ہمارے نمائندے
نہیں ہو سکتے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان نے جنگ عظیم میں کتنی قربانیاں دیں، انگریزی اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، لیکن عوضانہ ملا تو کیا؟ جلیانوالہ باغ، رولٹ ایکٹ، اور اس جنگ میں بھی ہمارے 26 لاکھ جوان شریک ہوئے، محوریوں کے گولہ بارود کا شکار ہوئے، ہندوستان کے معصوم بچے نانِ جویں کو محتاج رہے، عصمت مآب عورتیں برہنہ تن حیات مستعار کے ایام کاٹتی رہیں، بنگال کے لاکھوں بے گناہ موت کا شکار ہوئے، لیکن ملا کیا؟ نام نہاد حقِ نمائندگی، مقام حیرت ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے سیاسی مسائل پر گفت وشنید کی ضرورت محسوس کرتی ہے، تو کانگریس کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے، لیکن جب نمائندگی کا سوال اُٹھتا ہے، تو ہندوستان کی مرضی کے بغیر دو آدمی منتخب کر لئے جاتے ہیں، کیا یُوں یہ سمجھ لیا جائے کہ دونوں نمائندے ہندوستان کے نمائندے نہیں بلکہ انگریزی حکومت کے نمائندے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں انگریزی اقتدار کو مسلط کیا جائے۔

## شیخ محمد عبداللہ

شیخ محمد عبداللہ کی مفصل اور جامع تقریر آپ کے زیرِ مطالعہ آئے گی۔ اگر اس تقریر کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے تو ایک بات اہم ہے، جو ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے، اور وہ ہے ''مسٹر جناح کی لیڈر شپ۔''

آپ فرماتے ہیں کہ

قائداعظم بننے میں جو خصوصیتیں ہونی چاہئیں وہ اُن میں نہیں، لیکن پھر بھی
اکثر مسلمانوں کا اعتقاد بڑھ رہا ہے۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ

مسلمان اندھا نہیں ہے، لیکن وہ اس کے باوجود جناح کے پیچھے لگا ہوا
ہے، وہ جب بھی آواز بلند کرتا ہے کروڑوں مسلمانوں کی نگاہیں ان کی

طرف اُٹھتی ہیں۔

شیخ صاحب کے مذکورہ فقرات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، آخر کیا وجہ ہے، کہ ایک آدمی آزادی کی راہ میں سنگِ گراں ہے، فکر وعمل کی قوت سے خالی ہے، اور علم وفضل میں کورا، لیکن اس کی آواز پر کروڑوں انسان کٹ مرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ آخر اس کشش کی بنیاد پر غور کرنا چاہئے۔

ان حالات میں ہمیں ایک بات ضرور ماننا پڑتی ہے، یہ کہ جناح کے پاس ایک ایسی مشعل ہے، جس کی روشنی کے مسلمان فریفتہ ہیں یا مسلمانوں میں قوتِ ادراک کی کمی ہے، مجھے دوسری بات وزن دار معلوم نہیں دیتی، مسلمانوں کی قابلیت کے روشن نمونے مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبداللہ سندھی، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، شیخ الہند مولانا ابوالحسن، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر اشرف، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان کے کردار سے نظر آتے ہیں۔

میں شیخ صاحب کی تقریر کے اس حصے پر بحث کرنا نہیں چاہتا، لیکن ڈاکٹر سید محمود صاحب کی تائید ضرور کرتا ہوں کہ "شیخ محمد عبداللہ کی تقریر کو میں اہم سمجھتا ہوں۔"

## وزیرستان پر بمباری

بے گناہ وزیریوں پر اندھا دھند بمباری کے متعلق خان امیر محمد خان پارلیمنٹری سیکرٹری نے ایک قرارداد پیش کی، جس میں آپ نے بتایا کہ

> 1935ء ایکٹ کے ماتحت وزارت کو جو اختیارات حاصل ہیں، ان سے وہ اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتی، یہاں جس طرز کی حکومت جاری ہے، ایک آئین کے تحت گورنروں کو اپنے وزیروں سے مشورہ کرنا پڑتا ہے، اور دوسرا گورنر، گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے ایجنسیوں وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔

بے گناہ وزیریوں پر بمباری کیوں ہوتی ہے؟ ان کے معصوم بچوں، شریف عورتوں، نوجوانوں ... بوڑھوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ کیوں اُتارا جاتا ہے؟ اس پر بحث کی ضرورت نہیں،

تاہم اتنا تو کہا جاسکتا ہے، کہ یہ تمام وحشت ناک واقعات سیاسی مفاد کے پیش نظر رونما ہوتے ہیں، یہ اغوا، ڈاکے، قتل و غارت ایسے ہتھیار ہیں، جنہیں اختیار کر کے سیاسی فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، خدا بخشے حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کو، جنہوں نے قبائلی کشاکش کا خوب مطالعہ کیا تھا، لیکن جب باتیں ظاہر کیں، تو انگریزی جبر و استبداد کا شکار ہوئے۔

## اپیل

عجلت کی وجہ سے کتاب کی ترتیب و تدوین میں کئی خامیاں رہ گئی ہیں، توقع ہے کہ کتاب بین حضرات اسی کمی کو شدت سے محسوس نہیں کریں گے، اگر حالات نے مساعدت کی تو دوسرے ایڈیشن میں خامیوں کو دور کر دیا جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ حریت پرست طبقہ عام لوگوں کو کتاب کے مطالعہ کی دعوت دے گا، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اشاعت میں اہم حصہ لے گی۔

## اظہارِ تشکر

غیر مناسب ہوگا، اگر میں ان معزز ساتھیوں کا شکریہ ادا نہ کروں۔ جنہوں نے کتاب کی تیاریوں میں عملی تعاون پیش کیا، مجھے اس سلسلہ میں کامریڈ عبدالغفور آتش کا شکریہ ادا کرنا ہوگا۔ جنہوں نے کتاب کے پروف پڑھے، جرائد دان مدیروں کا شکریہ ادا کرنا ہوگا، جنہوں نے اپنے اخبارات میں کانفرنس کی مفصل کارروائی شائع کی، اور جس سے میں نے حظ اُٹھایا۔ مجھے یہاں اخبار "پرتاپ لاہور" اور "پربھات پشاور" کا بھی شکرگزار ہونا پڑے گا، جنہوں نے بلاک دے کر کتاب کی زینت کو بڑھایا۔

نگینہ

کانگریس کمیٹی پشاور

26-جون 1945ء

☆☆☆

# فخرِ افغان نگر

شاہی باغ کے وسیع احاطہ میں فخرِ افغان نگر تعمیر کیا گیا...... ... ............افغان نگر میں ایک لاکھ انسان بیٹھ کر کانفرنس کی کارروائی سے مستفید ہو سکتے تھے، نگر کے چاروں طرف انقلابی ماٹوز آویزاں کیے گئے تھے۔ افغان نگر میں داخل ہونے کے لئے دو خوبصورت سڑکیں بنائی گئی تھیں، ایک راستہ سے پبلک کے داخلہ کا انتظام تھا اور دوسرے راستے سے خدائی خدمت گاروں کی آمد و رفت تھی، دونوں سڑکیں خدائی خدمت گاروں کے تسلط میں تھیں، اسٹیج تک پہنچنے کے لئے پاس تقسیم کیے جاتے تھے، بغیر پاس کے وہاں تک کسی کو بھی پہنچنے کی اجازت نہ تھی حتیٰ کہ وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری بھی بغیر پاس کے اسٹیج تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

## اسٹیج

ایک ہزار اشخاص کے بیٹھنے کے لئے شاندار اسٹیج تیار کیا گیا تھا، اسٹیج کا بیرونی حصہ بجلی کے قمقموں، موتی کی لڑیوں اور سنہری پردوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور اردگرد پھولوں کے گملے بوستان کا منظر پیش کر رہے تھے، اسٹیج کے زرّین دروازے پر مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، فخرِ افغانستان اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی قد آور تصاویر آویزاں کی گئی تھیں۔

## پریس گیلری

اسٹیج کے دائیں طرف پریس گیلری کا انتظام کیا گیا تھا جہاں بیک وقت 50 پریس رپورٹر کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لے سکتے تھے، کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ پریس رپورٹروں کی تعداد سے لگ سکتا ہے، حسب ذیل نمائندگان پریس نے اجلاس میں شرکت کی۔

امرت بازار پترکا، ہندو مدارس، جنم بھومی، ہندوستان ٹائمز، نیشنل کال، سول اینڈ ملٹری گزٹ، قومی جنگ، فورم، ٹریبون، ملاپ، پرتاب، ویر بھارت، احسان، زمیندار، ترجمان سرحد، پربھات پشاور، رائے عامہ، فرنٹیر ایڈووکیٹ، خیبر میل، شانتی راولپنڈی، ایسٹرن ٹائمز، ایسوسی ایٹڈ

پریس، یونائیٹڈ پریس، اورنیشنل پریس۔

## استقبالیہ کمیٹی

اسٹیج کے بائیں طرف ممبران استقبالیہ کے بیٹھنے کا اہتمام تھا، اور سامنے ورکرز کے لئے ایک گیلری بنائی گئی تھی، جہاں سات ہزار کے قریب ورکرز بیٹھ سکتے تھے۔ القصہ افغان نگر اور اسٹیج کی سجاوٹ خوبصورتی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ مجھے ایک پریس رپورٹر نے کہا کہ میں نے ہندوستان بھر کی صوبائی کانفرنسوں کے پنڈال دیکھے ہیں، لیکن ایسا دیدہ زیب اور خوشنما پنڈال میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے کہا، جناب عالی، یہ کانفرنس صرف پشاور کی طرف سے ہے، اگر صوبے کی طرف سے ہوتی، تو آپ آل انڈیا کانگریس کے پنڈال کو بھی بھول جاتے۔

## خدائی خدمت گار کیمپ

افغان نگر کے دائیں طرف خدائی خدمت گار کیمپ لگایا گیا تھا جس میں صوبے بھر کے خدائی خدمت گار رہتے تھے۔ کیمپ گیٹ کے ساتھ ہی فخر افغان کا خیمہ نصب کیا گیا تھا، جس کے باہر کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ دائیں اور بائیں طرف سالار اعظم اور پرائیویٹ سیکریٹریوں کے خیمے نصب تھے۔ کیمپ کے وسیع میدان میں 400 کے قریب چھوٹے چھوٹے خیمے لگائے گئے تھے جہاں خدائی خدمت گار رہتے تھے۔

## فوجی مارچ

کیمپ کا انتظام ڈسپلن کے ماتحت تھا۔ ہر روز طلوع آفتاب کے ساتھ ہی باوردی خدائی خدمت گار فوجی مارچ کرتے تھے، جن آنکھوں نے خدائی خدمت گاروں کا فوجی نظام دیکھا ہے، وہ ان لوگوں کے لئے جوابی دلیل ہیں جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ پٹھان لڑنے جھگڑنے کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ تنظیم کیا ہوتی ہے، اُن کی بلا جانے۔ اس تنظیم سے متاثر ہو کر پنجاب کی کمیونسٹ دیوی فریدہ بیدی اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتی ہیں:

''پٹھان ایک منظم طاقت ہے جو کبھی مرعوب نہیں ہوسکتی۔''

## خٹک ڈانس: سرحدی پٹھانوں کا روایتی مشغلہ

علاقہ خٹک کے پٹھانوں میں ڈانس کا پرانا رواج ہے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک، امیر سے لے کر غریب تک سب اِسی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یہ ڈانس لوگوں میں مجاہدانہ زندگی کی رُوح پھونک دیتا ہے۔ ''ناچ'' ڈھولک اور سرنا'' کی مستانہ تان کے ساتھ ہوتا ہے، اگر صوبہ سرحد کے پٹھانوں کی سیاسی بیداری کے آغاز پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اِسی ''ڈھولک اور سرنا'' کے پرکشش نغموں نے پٹھانوں کو تنظیم کی لڑی میں پرو دیا اور آزادی کی شمع پر مثلِ پروانہ جلنے پر آمادہ کیا، یہی جاذب دل نغمے تھے جس نے فخر افغان کو سرحد کے گوشہ گوشہ میں پھرایا، اور پٹھانوں میں حیاتِ ابدی کی رُوح پھونکی، فخر افغان کے ارشاد پر ڈاکٹر سیّد محمود اور دیگر مقتدر رہنماؤں کے سامنے باوردی خدائی خدمت گاروں نے ڈانس کیا۔ یہ ڈانس آرٹ کا بہترین نمونہ ہے، دیکھنے والے ہی میرے اِس دعویٰ کی دلیل بن سکتے ہیں۔ اِس ڈانس میں سرخ پوش جرنیل و کرنیل نے بھی حصہ لیا، سب سے بہتر ڈانس ایک ہندو لڑکے کا رہا۔

## قبائلی ڈیلی گیٹ

یہ ڈیلی گیٹ قبائل کی طرف سے خان عبدالغفار خان اور کانگریس کے لئے برادرانہ پیغام لائے۔ قبائلی ڈیلی گیٹ سے بات چیت کے بعد خان عبدالغفار خان نے ایک انٹرویو میں کہا کہ آج سے 2 سال پہلے قبائلی علاقے میں ہمارے معمولی سے کام نے سرحد پار ہمارے بھائیوں کے ساتھ گہرے دوستانہ و برادرانہ تعلقات پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر برطانوی گورنمنٹ امداد کرے تو ہم قبائل سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیں گے اور بدگمانی اور بداعتمادی دُور کر سکتے ہیں اور اس طرح ڈاکہ، اغوا اور قتل کی وارداتوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ ہمیں قبائل کے پاس دوست کی حیثیت میں جانا ہوگا نہ کہ دشمن کے۔ صرف اِسی طریقے سے ہم اس اہم مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔

## استقبالیہ کمیٹی

مجلس استقبالیہ کے اجلاس خدائی خدمت گار کیمپ میں ہوا کرتے تھے، ارا کین استقبالیہ کے

علاوہ رائے بہادر مہر چند کھنہ، نواب زادہ قیوم خان، خان عبدالصمد خان، شیخ عبداللہ شریک رہا کرتے تھے، اجلاس میں اہم مسائل پر گفتگو ہونے کے علاوہ گپ شپ کو بھی کافی دخل رہتا تھا، حکیم عبدالجلیل ندوی اور رائے بہادر مہر چند کھنہ کی نوک جھونک قابل تعریف رہتی تھی۔

## خاکساروں کی سرگرمیاں

افغان نگر کی تعمیر میں خاکسارں نے نمایاں حصہ لیا اور کانفرنس کے معزز مہمانوں کی سہولیات کے پیش نظر بڑے بڑے خیمے نصب کئے، 23 اپریل کے دن ڈاکٹر سیّد محمود کو شاندار سلامی دی گئی، آتشیں گولیوں سے معزز رہنماؤں کو خوش آمدید کہا گیا اور مختصر سے لفظوں میں ہندو مسلم اتحاد کی اپیل کی گئی۔

## اسٹوڈنٹس یونین

مجلس استقبالیہ کی طرف سے پشاور اسٹوڈنٹس یونین کے طلباء کا ایک جتھہ معزز مہمانوں کو ریلوے اسٹیشن سے لانے کی ڈیوٹی پر معمور کیا گیا، یہ جتھہ ہر وقت ریلوے اسٹیشن پر موجود رہتا تھا، بلاشبہ ان ساتھیوں نے مخلصانہ طور سے اپنی ذمہ داری کو سنبھالا۔ اس سلسلہ میں ذیل کے نوجوان رفقاء کا کام قابل ذکر ہے۔

مسٹر تاج محمد میر، مسٹر سریندر ناتھ، جگدیش چندر کوکبؔ، ہردت سنگھ خورشید، بدری ناتھ ناظم، مسٹر وشوا ناتھ، لالہ ستیام رام، مسٹر جوگ راج، لالہ مدن لعل، مسٹر رفیق، مسٹر عبداللہ جان، خان الٰہی بخش۔

## دیگر پارٹیاں

صوبہ سرحد اور پنجاب سے آئے ہوئے سوشلسٹ، کیمونسٹ اور بمبئی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلباء نے بھی کانفرنس میں شمولیت کی۔

## دفتر معلومات

عوام کی سہولیات کے پیش نظر دفتر معلومات کے نام سے ایک کیمپ لگایا گیا تھا۔ جس میں

خاص طور پر ٹیلی فون کا انتظام کیا گیا تھا تا کہ دُور دراز کے لوگوں کو ہر وقت معلومات مل سکیں، اس آفس کے انچارج خان محمد افضل خان، کامریڈ اللہ بخش برقی، اور راقم مقرر تھے، دفتر چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا، ٹیلی فون کا یہ حال تھا کہ شاید ہی چند منٹ فرصت ملی ہو، وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری بھی بسا اوقات آفس میں معلومات کے لئے آتے تھے، اگرچہ اتنی بڑی کانفرنس کے لئے ایک آفس کا ہونا تکلیف دہ تھا، پھر بھی اراکین آفس نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے کام کو بخوبی انجام دیا، اطلاع ہے کہ سات ہزار کے قریب اس آفس سے ورکرز گیلری کے پاس تقسیم کئے گئے۔

## لنگر خانہ

ہر بڑے اجتماع میں کھان پان کا انتظام دقت طلب ہوتا ہے۔ عام طور پر اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے کوئی تیار نظر نہیں آتا، اُس کی وجہ کام کی زیادتی نہیں، بلکہ ایک ایک منٹ میں پچاس پچاس مرتبہ لوگوں کا روٹھ جانا ہے، اور پھر آپ جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر روٹھے ہوئے دوستوں کو منانا جوئے کے مترادف ہے۔ ہماری کانفرنس میں لنگر کا مسئلہ جب زیر بحث آیا تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، آخر یہ بوجھ خان سبز علی خان نے اپنے نحیف کندھوں پر اُٹھایا، اور اختتام کانفرنس تک اِس ذمہ داری کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ لنگر میں ہر وقت دو ہزار سرخ پوش کھانا کھاتے تھے اور ساتھ ہی چائے بھی، لنگر کے کام میں دلچسپی سے کام کرنے والوں میں ذیل کے معزز دوستوں کا نام قابل ذکر ہے۔

ولی محمد خان جرنیل، لال محمد خان جرنیل، خان منیر خان نائب سالار مردان۔

## پانی کا انتظام

میونسپل کمیٹی پشاور نے پانی کا انتظام نہایت بہتر طریقہ پر کر رکھا تھا۔ جگہ جگہ پانی کی ٹینکیاں لگی ہوئی تھیں۔

## فائر بریگیڈ

آتش زدگی کے احتمال کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا، فائر بریگیڈ ہر وقت پنڈال میں موجود رہتی تھی۔

## اسپتال کا انتظام

مریضوں کے لئے خاص ہسپتال کا انتظام تھا۔ اگر کوئی شخص خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جاتا تھا، تو اُسے میونسپل ہسپتال میں پہنچایا جاتا تھا۔

## ٹٹیاں

میونسپل کمیٹی کی طرف سے ٹٹیوں کا خاص انتظام تھا۔

## دکانیں

افغان نگر کے بیرونی حصہ میں کوئی چالیس کے قریب اشیاء خُوردنی کی دکانیں لگائی گئی تھیں، جن کا انتظام نہایت شاندار طریقہ پر کیا گیا تھا۔

## مہمانوں کی رہائش کا انتظام

مجلس استقبالیہ کی طرف سے ہندوستان سے آنے والے معزز مہمانوں کا نہایت بہتر انتظام کیا گیا تھا، تاکہ کسی قسم کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہو، عام طور پر مسافر خانے، سرائے اور پرائیویٹ مکان اِسی کام کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں، لیکن یہاں صورت دوسری تھی، کانفرنس کے ڈیلیگیٹ صاحبان اور لیڈروں نے گورنر سرحد کے مہمان خانے کو استعمال کیا۔ یہ مہمان خانہ اسمبلی کے ممبروں اور گورنر کے خاص آدمیوں کے لئے مخصوص ہے۔ چند ایک معزز مہمان ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم کے بنگلے پر اور دیوان بھنجو رام صاحب کے بنگلے پر ٹھہرائے گئے۔

☆☆☆

# ڈاکٹر سیّد محمود صدر منتخب پولیٹیکل کانفرنس پشاور

ڈاکٹر سید محمود (جن پر سرحد کے خدائی خدمت گاروں کی نظر انتخاب سرحد پولیٹیکل کانفرنس

کی صدارت کے لئے پڑی ہے)1889ء میں بمقام سید پور بھتری ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام نامی ملا سیّد عمر ہے اور آپ کے ایک بڑے چچا مولانا شاہ اسماعیل شہید کے جھنڈے تلے آ کر جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ ہمارے صدر محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے ابتدائی کتابیں جون پور میں مولانا ہدایت اللہ خان سے پڑھیں۔ یہاں سے اپنے بہنوئی سیّد محمد عمر کے ساتھ بنارس چلے گئے۔ جہاں تین سال تک انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے۔بنارس سے 1900ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔

اُس زمانہ میں علی گڑھ میں ''انگریز بادشاہ اور ہم رعایا'' کا احساس زوروں پر تھا مگر جن طلبا کو اپنی محکومی کی ذات کا احساس تھا اُن میں سیّد محمود اور آپ کے چار دوست عبدالرحمن بجنوری، تصدیق احمد خان شیروانی، عبدالمجید بیرسٹر، قاضی تلمذ حسین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے کالج میں ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی اور علی گڑھ دو گروپوں میں تقسیم ہو گیا۔ایک گروپ کا نام ''باغی سرکار'' اور دوسرے کا شہنشاہیت پرست'' تھا۔اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے کسی طرح غیر ملکی سامراج کا خاتمہ کیا جائے۔اُس زمانے میں ڈاکٹر سیّد محمود نے ترکی کے مشہور حریت پسند اور محب وطن رہنما مصطفیٰ کمال پاشا سے خط و کتابت کی۔

1909ء میں جب ایران کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا تو آپ اُس وقت انگلستان میں تھے۔اُس وقت ایرانی قائدین مرزا یحییٰ اور آقا تقی سے ملاقاتیں ہوئیں اور ایک جلسہ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے عمل میں آیا۔جس میں یہ ریزولیوشن پاس ہوا کہ سلطان ترکی اور امیر افغانستان ایران کے مسئلہ میں مداخلت کریں۔ 1911ء میں جنگ طرابس چھڑی تو ڈاکٹر صاحب نے ترکوں کی حمایت میں انگلستان میں جلسہ کیا اور تمام یورپ کی نگاہیں آپ کی جانب اُٹھ گئیں۔

1913ء میں یورپ سے مراجعت فرمائے وطن واپس ہوئے اور پٹنہ میں پریکٹس شروع کی اور یہیں 1915ء میں مشہور محب وطن اور بزرگ قوم مسٹر مظہر الحق مرحوم کی صاحب زادی سے آپ کی شادی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب 1915ء سے کانگریس کے مستقل ممبر تھے اور جب 1921ء کا انقلابی دور آیا تو آپ خلافت تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔آپ نے پریکٹس چھوڑ کر خلافت کمیٹی کے سیکرٹری

کی حیثیت سے بمبئی میں کام کیا۔ 1923ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے علاوہ ایثار و قربانی کے نہ مٹنے والے نقش قائم کئے۔ 1925ء میں دوبارہ پریکٹس شروع کردی، پھر 1926ء میں دوبارہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری بنائے جانے لگے مگر آپ نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ بالآخر 1929ء میں کانگریس کی دعوت پر دوبارہ میدان میں آنے پر مجبور ہوئے اور 1929ء سے 1936ء تک مسلسل سات برس تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کے ممتاز عہدے پر سرفراز رہے۔

جس زمانے میں مسلم لیگ جناح لیگ اور شفیع لیگ کے دھڑوں میں تقسیم تھی اور مسلمانوں کی سیاست پر مسلم کانفرنس رجعت پسندوں کا قبضہ تھا۔ اُس زمانے میں آپ نے آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے قیام کی تحریک کی۔ جس کی وجہ سے مسلم کانفرنس کو حصہ دینا پڑا اور حکومت برطانیہ نے بھی کوئی اقدام کرنے سے گریز کیا۔ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس آپ کی کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔ اس کانفرنس کے بعد 1935ء کی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ 1935ء کی اصلاحات کے بعد جب اسمبلی کے لئے انتخابات کا فیصلہ ہوا تو آپ دو حلقوں سے کامیاب ہو کر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ بہار کی کانگریسی حکومت کے وزیر مقرر ہوئے اور جن صنعتوں پر صوبے کی تعمیر و ترقی کا دارومدار تھا یعنی تعلیم، صنعت و حرفت، تجارت کے محکموں کا قلم دان ڈاکٹر صاحب کے سپرد کیا گیا۔

1939ء میں جب موجودہ جنگ یورپ چھڑی، تو کانگریس نے حکومت برطانیہ سے آزادی کا مطالبہ کیا، اور جنگ آزادی کی شرط کے ساتھ امداد دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ لیکن برطانیہ نے ہندوستان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر کانگریسی حکومتیں مستعفی ہوگئیں، 1942ء میں کانگریس کی طرف سے ''ہندوستان سے چلے جاؤ'' کا نعرہ بلند ہوا اور اگست کی قرارداد آزادی پاس ہوئی۔ تمام چھوٹے بڑے کانگریسی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر گرفتار ہوگئے۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب کو بھی احمد نگر جیل میں بند کردیا گیا۔ جہاں سے 1944ء میں رہا ہو کر مہاتما گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اب سرحد پولٹیکل کانفرنس پشاور کی صدارت فرمارہے ہیں۔

# صدرِ منتخب کا پُر جوش خیر مقدم

## صوبہ سرحد کی سیاسی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جانے والا شاہانہ جلوس

21 اپریل ایکسپریس پر ساڑھے گیارہ بجے پشاور پولیٹیکل کانفرنس کے صدرِ منتخب ڈاکٹر سیّد محمود اور شری بھولا ڈیسائی اسٹیشن پہنچے جہاں ہزاروں خدائی خدمت گار، لاکھوں کی تعداد میں پبلک اور ممبران واستقبالیہ نے معزز رہنماؤں کا پُر خلوص استقبال کیا اور ایک بے مثل جلوس مرتب کیا گیا، سب سے آگے باوردی سرخ فوج تھی، اُن کے پیچھے ایک پھولوں سے لدی ہوئی موٹر پر ڈاکٹر سید محمود، بھولا بھائی ڈیسائی، خان علی گل خان اور سالار امین جان خان بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے ہزاروں باوردی خدائی خدمت گار تھے، انقلاب زندہ باد، ڈاکٹر سید محمود زندہ باد، فخرِ افغان زندہ باد، مولانا پوپلزئی، زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ جلوس دو میل لمبا تھا، انسانوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سیلِ رواں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا، شہر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا، شہر کے اہم مقامات پر بے شمار گیٹ بنائے گئے تھے، جن میں حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی گیٹ، فخرِ افغان گیٹ، بھگت سنگھ گیٹ، چیمور وآتش گیٹ، سید محمود گیٹ، سید اکبر شہید گیٹ، جواہر گیٹ اور آزاد گیٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جگہ جگہ پانی کا انتظام تھا، پبلک کی طرف سے قدم قدم پر گلاب اور پھولوں کی بارش ہوتی تھی، ذرا ذرا وقفے کے بعد گولوں سے معزز مہمانوں کی سلامی اُتار جاتی تھی۔

### یادگارِ شہدا

جلوس جب قصہ خوانی بازار میں پہنچا تو ڈاکٹر سیّد محمود اور بھولا بھائی ڈیسائی نے پھول چڑھائے اور شہیدوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

صوبہ سرحد کی سیاسی تاریخ میں یہ جلوس یادگار رہے، مجھے شہر کے اکثر بزرگوں سے یہ سننے کا اتفاق ہوا ہے کہ ایسا عظیم الشان جلوس کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندو مسلم اور سکھوں کا مشترکہ جلوس صدیوں تک متحرک تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ لاکھوں انسانوں نے معزز مہمانوں کا پُر خلوص استقبال کر کے سرحدی روایات کو زندہ کر دیا۔

☆☆☆

# آزادی چاہنے والوں کو سر پر کفن باندھ لینا چاہئے

## دُنیا اپنے جھنڈے پر قربان ہو رہی ہے

## ترنگا جھنڈا لہراتے ہوئے شری بھولا ڈیسائی کی حُریت افروز تقریر

21 اپریل کی شام کو ٹھیک ساڑھے سات بجے شاہی باغ میں خدائی خدمت گاروں کی چھاؤنی میں مسٹر بھولا ڈیسائی اپوزیشن لیڈر کانگریس پارٹی (سنٹرل) نے سہ رنگا جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر ہزاروں باوردی خدائی خدمت گار و فخر افغان خان عبدالغفار خان و دیگر رہنمایانِ قوم موجود تھے۔ مسٹر ڈیسائی نے جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی اور خدائی خدمت گاروں نے جھنڈے کو سلامی دی، بینڈ بجائے گئے اور گولوں سے بھی سلامی دی گئی۔

اِس موقع پر مسٹر بھولا ڈیسائی نے تقریر کرتے ہوئے کہا ''آج سے آٹھ برس کے بعد میں پھر اُس جگہ آیا ہوں، آج سے آٹھ برس پہلے بھی میں آپ کے پاس کانگریس کا پیغام لے کر آیا تھا، آزادی چاہنے والوں کو سر پر کفن باندھ لینا چاہیے، قربانیوں کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی، یہاں جو رسم ادا کی گی ہے مجھے اس پر فخر ہے، دنیا میں ہر قوم کا ایک جھنڈا ہوتا ہے، آج دنیا اپنے اپنے جھنڈے کے لئے لڑ رہی ہے، آپ کو بھی اِس جھنڈے کو سرنگوں نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ہماری جنگ کا طریقہ دوسرا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اب ہماری آزادی قریب ہے تاہم آزادی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بہشت سے تحفہ کے طور پر آپ کے لئے آئے گی۔ آزادی تو وہی پیدا کر سکتا ہے جس میں ہمت ہو، ہم نے اِس جھنڈے کے نیچے دنیا کو بتانا ہے کہ ایک اور طریقہ سے بھی آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آج جو کچھ بھی اِس صوبے میں ہو رہا ہے، جلد ہمارے ہندوستان میں ہو جائے گا۔'' آپ نے کہا کہ ''گذشتہ جنگ میں ہمارے ساتھ بڑے وعدے کئے گئے تھے اور اُس وقت مہاتما گاندھی سے لے کر میرے جیسے ادنیٰ آدمی نے بھی کافی مدد دی تھی۔ اُس وقت ہمیں پورا بھروسہ تھا لیکن آج ہم یہ کہتے ہیں اور ہم نے اسمبلی میں بھی یہی جواب دیا ہے

کہ اگر آپ کی آزادی کے ساتھ ہماری آزادی ملی ہوئی ہے تو ہم حاضر ہیں۔" آخیر میں آپ نے کہا کہ اس جھنڈے کو جو یہاں بلند کیا گیا ہے، ہمیشہ بلند رکھا جائے۔

## صدر منتخب کا شاہانہ خیر مقدم

جھنڈا کی رسم ادا ہونے کے بعد آٹھ بجے کے قریب فخر افغان خان عبدالغفار خان کی قیادت میں مجلس استقبالیہ کے معزز اراکین نے ڈاکٹر سید محمود صدر منتخب کانفرنس کا خیر مقدم کیا، انقلاب زندہ باد کے فلک رسا نعروں کے درمیان ڈاکٹر صاحب کو افغان نگر میں لایا گیا۔

## کانفرنس کی پہلی نشست

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب کانفرنس کے پہلے دن کی کاروائی شروع ہوئی۔ ابتداء میں چند حریت افروز نظمیں پڑھی گئیں اور بعد میں سید قائم شاہ وکیل جنرل سیکرٹری مجلس استقبالیہ پولیٹیکل کانفرنس نے ہندوستان سے متعدد رہنماؤں کے موصول شدہ پیغامات پڑھ کر سنائے۔ اُن میں بلبل ہند وسروجنی نائیڈو، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسین احمد مدنی، بابا کھڑک سنگھ، خواجہ عبدالمجید صدر آل انڈیا مسلم کانفرنس، سردار گنگا سنگھ، مولانا احمد سعید، مولانا سیّد، حبیب ودیگر اکابرین ملّت کے پیغام شامل تھے۔

## صدر استقبالیہ کا خطبہ

اس کے بعد خان علی گل خان صدر مجلس استقبالیہ پولیٹیکل کانفرنس پشاور نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔

## استقبالیہ خطبہ صدارت

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

محترم رہنمایان ملّت ونمائندگان قوم!

آج مجھے یہ شرف نصیب ہوا ہے کہ میں صوبہ سرحد کے غیور باشندوں کی طرف سے آپ کا

خیر مقدم کروں۔ آپ نے آج کل کے سفر کی زحمت گوارہ فرماتے ہوئے ہماری دعوت پر اس قدیم شہر میں آنے کی تکلیف اُٹھائی ہے۔ اس کے لئے اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات ہماری میزبانی کی کوتاہیوں سے ہمارے اندرونی خلوص کا اندازہ نہ لگائیں گے۔ کیوں کہ جو عزت اور محبت ہمارے دلوں میں آپ کے ساتھ ہے، ہم اس کے اظہار کی طاقت نہیں رکھتے۔

محترم بزرگو! آپ کو یہاں مدعو کرتے وقت ہمارے سامنے یہ بات تھی کہ آپ کو ہندوستان کے ایسے کونے کی سیر کرائیں جس کا چپہ چپہ تاریخی عظمت اور روایات سے بھرا پڑا ہے۔ جو زمانہ سلف سے اہم واقعات اور تہذیبی مدوجزر کا منبع رہا ہے جس کے مشہور راستوں سے ہندوستان کے سیاح باہر گئے اور بیرونی اقوام ادھر آئیں۔ جس جگہ ایشیاء کی تین پرانی تہذیبیں، یعنی چینی، ایرانی اور ہندوستانی آپس میں ملیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئیں۔ جہاں یونان نے ہندوستان کے ساتھ تخیلاتی رشتہ جوڑا۔ جس کو بدھ مت والوں نے اپنا صدر مقام بنالیا۔ جہاں ہندو تہذیب نے نئے روپ لئے اور دشوار وادیوں میں آخر کار اسلام نے اپنا گھر بنا کر نشو ونما پائی۔ یہ موقع اس سارے شاندار ماضی کے مفصل بیان کے لئے موزوں نہیں کیوں کہ میں اس وقت آپ صاحبان کو اس کی زندہ تاریخ کی جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں۔ جس نے پچھلے چند سالوں سے آپ اور ہم میں ایک نیا تعلق اور ایک نیا رابطہ پیدا کر دیا ہے اور جس کے ذریعہ آج ہم سب اس جگہ جمع ہوئے ہیں۔

حضرات! یوں تو یہ صوبہ قومی جدوجہد میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح ہمیشہ ہی حصہ لیتا رہا ہے اور رولٹ بل، خلافت، ہجرت اور پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ والی تحریکیوں میں برابر شامل رہا ہے مگر سال 30ء کے واقعات نے ہمیں ہندوستان کی عام قومی تحریک کے ساتھ مزید وابستہ کر دیا جبکہ حکومت برطانیہ کے ظالمانہ اور وحشیانہ رویہ، اور اس مصیبت کے وقت اکثر مسلم اکابرین کی سردمہری نے ہم کو کانگریس کے ساتھ ملنے کا موقع دیا اور اس طرح ہماری سیاسی زندگی کا ایک عظیم الشان باب شروع ہوا جو اب ایک مضبوط اور خوشگوار الحاق کا رنگ پکڑ گیا ہے اور جس پر ہم پٹھان بجا طور پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارا تعلق کانگریس جیسی زبردست جماعت کے ساتھ ہو گیا ہے۔ مجھے یہاں پر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سال 30ء سے پہلے صوبہ سرحد بے آئین کے نام سے مشہور تھا اور ہم کسی قسم کی ذمہ دار حکومت یا ابتدائی انسانی حقوق کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے۔

لیکن برطانوی سلطنت کا وہ ڈھونگ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا اور قدرت نے ہم پسماندہ لوگوں کی خدمت اور بھلائی کے لئے ایک بہادر اور مخلص رہنما پیدا کر کے اُس کے دل میں اپنے ہم وطنوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی اور اُس کو ایسی ہمت بخشی کہ حکومت وقت کا سارا زور وظلم اُس کا سر نہ جھکا سکا اور وہ مردِ مجاہد اپنے پیروکاروں کو کڑی منزلیں طے کرواتا ہوا ہندوستان کی آزادی کی طرف بڑھتا ہی گیا، اُس جواں مرد سے میرا مدعا خان عبد الغفار خان ہے جن کی قیادت پر اس صوبے کے ہر فرد و بشر کو پورا اعتماد اور ناز ہے اور ہماری عین خوش قسمتی ہے کہ وہ ایسے خطرناک دور میں ہماری رہبری کرنے کے لئے ہم میں آج موجود ہیں۔

محترم حضرات! اِس سے پہلے کہ میں کوئی دوسری بات کہوں، میرے لئے مناسب ہوگا کہ آپ صاحبان کے سامنے ماضی قریب کا ایک مختصر خاکہ کھینچ دوں۔ آپ سب کو یاد ہوگا کہ اِس جنگ کے شروع ہوتے ہی کانگریس نے حکومت سے جنگ کے اغراض ومقاصد دریافت کیے اور ہندوستان کے ساتھ سلوک کی بابت دریافت کیا۔ ناتسلی بخش جواب کے بعد جب کانگریس نے دیکھا کہ سلطنت برطانیہ ہمیں پہلے کی مانند محکوموں کی طرح ہی استعمال کرنا چاہتی ہے تو اُس نے اپنی آٹھ صوبائی وزارتوں کو حکومت سے عدم تعاون کا مشورہ دیا اور وہ فوراً ہی اپنی اِس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئیں۔ اِس کے بعد ہندوستان نے دوسرا قدم انفرادی ستیہ گرہ کی صورت میں اُٹھایا مگر جہاں باقی ملک میں ہزاروں بھائی بہنیں جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے وہاں سرحد میں حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے زیر اثر کوئی گرفتاری ہی نہیں کی اور دنیا کو یہ دکھانے کی غرض سے کہ مسلمانوں کا اس تحریک سے کوئی واسطہ نہیں، اس مسلم اکثریت والے صوبہ میں خاموش بیٹھی ہماری کارروائی دیکھتی رہی۔

حضرات! ابھی ہندوستان یہ منزلیں طے ہی کر رہا تھا کہ جنگ کی صورت بد سے بدتر ہوگئی اور آس پاس کے حالات سے متاثر ہو کر حکومت برطانیہ نے اپنے ایک نمائندے کو ہندوستان دوڑایا تا کہ وہ اُن کی تیار کردہ تجاویز کو کانگریس سے منوا سکے۔ مگر ہمارے رہنما اِس دامِ فریب سے بچے رہے اور انہوں نے دنیا پر واضح کر دیا کہ انگریزی حکومت اِس آڑے وقت میں بھی ہندوستان کے ساتھ دیانت داری سے پیش آنا نہیں چاہتی اور اب بھی اپنی مطلب برآری کرانا چاہتی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان بھر میں جو کچھ ہوا، اُس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت

نہیں۔ کیوں کہ وہ سب باتیں آپ حضرات کو یاد ہوں گی اور شاید اُن کا ذکر مختلف اصحاب اپنی تقریروں میں بھی کریں لیکن جہاں تک اِس صوبہ کا تعلق ہے۔ میں یہاں کے واقعات مختصراً آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

محترم حضرات! 8 اگست 42ء کے معرکہ خیز رن میں اور اُس کے بعد کے دل ہلا دینے والی خبروں نے ہم کو ایک مشکل امتحان میں ڈال دیا۔ لیکن ہمارے محبوب رہنما خان عبدالغفار خان یہاں کے خاص حالات کی وجہ سے بمبئی والی میٹنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ اِس لئے ہماری صوبائی کانگریس نے تحریک چلانے کے تمام تر اختیارات اُن کے حوالے کر دیئے اور انہوں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

حضرات! آپ کو معلوم ہو گا کہ حکومت کی اِس اچانک تخت گیری سے برا فروختہ ہو کر ملک کے بعض عناصر غم اور غصہ کی حالت میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ یہ ایک افسوس ناک صورت تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر افسوس ناک بات یہ تھی کہ حکومت نے اِن انفرادی واقعات کی آڑ لے کر ملک میں دہشت پھیلانی شروع کی۔ اور انتہائی ظلم وستم ڈھائے لیکن یہ صورت حال یہاں پیدا نہیں ہوئی کیوں کہ بادشاہ خان (فخر افغان) نے ہمارے سامنے وہ پروگرام رکھا جو کہ اس تحریک کے سلسلہ میں گاندھی جی کے ذہن میں تھا اور اگر وہ باہر ہوتے تو سارے ملک میں اس پروگرام کو عملی جامہ پہناتے۔ یہ پروگرام عدم تشدد کے پاک اور پاکیزہ اُصولوں پر مبنی تھا اور ہم سب کو یہ ہدایت تھی کہ ہر حالت میں عدم تشدد پر عمل کریں۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی ہم سے یہ توقع کی گئی کہ ہم اُس بدیشی حکومت کا تختہ اُلٹیں اور اُس کے وقار کو ختم کر دیں۔ اِس سلسلہ میں ہماری تحریک کا تعمیری حصہ قبائلی علاقوں میں جا کر مرکز کھولنا تھا تا کہ وہاں کے بسنے والی بھائیوں سے رابطہ قائم کریں اور اُن کی خدمت بجا لائیں اور یہ ہماری اِسی کارگذاری کا نتیجہ ہے کہ آج اِن آزاد قبائلیوں کا ایک نمائندہ وفد ہماری اِس کانفرنس میں شمولیت کے لئے یہاں آیا ہے اور جن کو ہم صدق دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

حضرات! حکومت کے خلاف عملی جدوجہد کے لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ باوردی خدائی خدمت گار مختلف عدالتوں اور دوسری سرکاری اداروں کا کام روکنے کے لئے جائیں۔ تحریک کی اصطلاح میں اس کو "ریڈ" کے نام سے بجا طور پر یاد کیا جاتا تھا۔ یہ خدائی خدمت گار وہاں جاتے،

سرکاری ظلم وستم سہتے، معلوم نہیں آپ میں سے کتنے صاحبان نے وہ خونی منظر دیکھے ہیں اور خاص طور پر وہ المناک وقت جبکہ خود فخرِ افغان صاحب بھی اِن سرکاری کارندوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر بے ہوشی کی حالت میں ہری پور جیل پہنچا دیئے گئے۔

لیکن باوجود اس اشتعال کے اور دوسرے انتہائی مظالم کے جو حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً ہم پر ہوتے رہے۔ مثلاً مردان میں پُرامن خدائی خدمت گاروں پر گولی کا چلانا، پشاور میں اُن کو موٹروں کے نیچے روندنا اور سید اکبر خان کو لاٹھیوں سے مار مار کر شہید کرنا ایسے واقعات تھے جو ہر انسان کو تشدد پر آمادہ کر سکتے تھے مگر ہم دعوی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے لیڈر کے ارشاد کے بموجب ان تمام اشتعال انگیز کاروائیوں کا پُرامن طریقے سے مقابلہ کیا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ کانگریس کے طریقہ کار یعنی عدم تشدد پر پٹھان کس طرح قائم ہے۔

محترم بھائیو! ایک طرف تو یہاں یہ مظالم ڈھائے جا رہے تھے تو دوسری طرف انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے نام نہاد اجارہ داروں کو عوام کے اصلی نمائندوں کی غیر موجودگی میں سندِ وزارت پر لا بٹھایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صوبہ سرحد کے لوگ لیگ کے پرچم کے نیچے آگئے ہیں اور ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ اس جماعت کے چھوٹے بڑے سب ہی اِس سحر میں آکر شادیانے بجانے لگے، کہیں پاکستان کا نعرہ اُٹھتا اور کہیں کچھ اور۔ لیکن جو چیز ہمارے کہنے سے واضح نہیں ہو سکتی تھی، وہ ان لوگوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دی اور بتا دیا کہ اِن کی اصلیت کیا ہے۔ یہ بات عوام پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اِن لوگوں کے سامنے انگریزی مفاد اور خود غرضی کے کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ باقی جہاں تک پاکستانی نعرے کا تعلق ہے تو اس کے ساتھ ہمارا اتفاق ہے مگر ہمارے اور اُن کے مفہوم میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ کیوں کہ پاکستان سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارا ملک اِس موجودہ بدیشی حکومت کی لعنت سے پاک ہو جائے جس نے گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے اِس کو گندہ کر رکھا ہے اور جس کو ختم کرنے کے لئے ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔

یاربّ وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

محترم حضرات! ہم آج اپنے ملک کی تاریخ کے ایک بڑے کڑے وقت میں اکٹھے ہوئے

ہیں۔ ہمارے دل ودماغ پر ابھی تک سال 1942ء کا اثر ہے اور ابھی تک حکومت کے لگائے ہوئے زخم بھرے بھی نہیں اور تو اور ہماری جماعت کا بیدار مغز صدر، مجاہد اعظم، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور ہندوستان کا مایہ ناز فرزند پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے مقتدر رہنمایان ملک ابھی تک جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں اور یہ چیز لازمی طور پر ہمارے غم اور غصے کو برطانوی حکومت کے خلاف بھڑکائے رکھتی ہے۔ تاہم اِس وقت سارے ملک کی نظریں ہم پر لگی ہیں، اور لوگوں کی توقع ہے کہ ہم اپنے فیصلوں کے ذریعے اُن کی رہنمائی کریں اور ملک کے سامنے اپنے کئے کی وضاحت کریں۔

بھائیو! اب میں اپنے خطبے کو ختم کرتے ہوئے ایک بار پھر آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں اور تمام انتظامیہ کمیٹی کی جانب سے اپنی انتظامی کوتاہیوں کے لئے معافی چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ دعا مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کانفرنس پر اپنی برکت نازل کرے اور ہمیں صراط مستقیم پہ چلائے (آمین)۔

## صدارت کی تجویز

مسٹر عبدالقیوم بیرسٹر کی تجویز اور حکیم عبدالجلیل ندوی کی تائید سے ڈاکٹر سیّد محمود صدر تجویز ہوئے۔ پبلک نے صدارت کی تجویز پر انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے اور تالیوں کی پُر جوش آواز میں ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم کیا۔

## خطبہءصدارت

1942ء کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی!
ہندوستان کی آزادی کے بغیر دُنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا!
انگریزی حکومت نے ہماری یک جہتی کو ختم کر رکھا ہے!
ڈاکٹر سیّد محمود کا پُر معنی خطبہ!

ڈاکٹر صاحب نے کہا جس جوش وخروش کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا گیا ہے، میں اُس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

## غلط فہمی کا ازالہ

آپ نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ کانفرنس صوبہ میں وزارت کی کامیابی کے لئے بلائی گئی ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ اِس کانفرنس کا خیال اس سے بہت پہلے یہاں کے اصحاب کے دلوں میں پیدا ہوا اور فروری کے مہینے میں واردھا میں اس کی صدارت کے لئے مجھے کہا گیا، اس لئے یہ کہنا کہ وزارت کی کامیابی کے لئے کانفرنس بلائی گئی ہے، غلط ہے۔

## سرحد کی محبت

میں ایک عرصے سے علیل ہوں اور آج بھی اچھا نہیں ہوں لیکن سرحد کی محبت اور آپ سے ملنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا ہے، سرحد سے میرا بچپن سے تعلق رہا ہے۔ ایک تو یہاں کے لوگوں کے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے اور دوسرے آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے چندر گپت نے یہاں کے لوگوں کی امداد سے ایک بہت بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ علاوہ ازیں میں اپریل 1940ء کو انڈین نیشنل کانگریس کی ایک کمیٹی لے کر یہاں آ رہا تھا جبکہ اٹک میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور 23 اپریل کو یہ واقعہ پیش آیا جس سے کئی سو آدمیوں کو گولیاں لگیں۔ سرحد کے لوگوں نے سینے پر گولیاں کھائیں اور اِس کے باوجود انہوں نے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ یہ عدم تشدد کی بہادری ہے۔

1930ء سے پہلے ہمارے دیش کے ہندوؤں کو صوبہ کے لوگوں پر اعتماد نہ تھا لیکن 1930ء میں یہاں کے لوگوں نے جو قربانیاں دیں، اُن سے سارے ہندوستان کے دل پر قبضہ کر لیا اور آج سرحد کے لوگوں کو ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔ 1930ء کے بعد تمام شبہات دُور ہو گئے، اُس سے آپ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ خدائی خدمت گار عدم تشدد کی تحریک ہے اور اِس کا علم آپ کو مجھ سے زیادہ ہے۔

## عدم تشدد کیا ہے؟

خان عبدالغفار خان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ عدم تشدد کی تعلیم دے کر یہاں کے لوگوں کو بزدل بنا رہے ہیں لیکن عدم تشدد کیا ہے؟ عدم تشدد غصے کو مارنے دشمن کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے

اور دشمن کو معاف کر دینے کا نام ہے۔ یہ مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ آپ ﷺ نے عدم تشدد کی تعلیم دی ہے۔ آپ نے پیغمبر اسلام کی زندگی کے حوالہ جات سے ثابت کیا کہ عدم تشدد اسلام کے لئے کوئی نیا نہیں اور کہا کہ اگر خان عبدالغفار خان اپنے رسول برحق ﷺ کی تائید کرتے ہیں اور آپ کو عدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ پٹھانوں کو بزدل بنا رہے ہیں، آپ کے سامنے بار بار کہا جاتا ہے کہ اسلام کا قانون بدلہ لینا ہے لیکن قرآن پاک میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ اگرچہ بدلہ لینا قانوناً جائز ہے۔ لیکن معاف کر دینا سب سے بڑی نیکی ہے۔ ایک انسان جو خدا کو مانتا ہے۔ قرآن پاک پر یقین رکھتا ہے۔ خدا کے کلام سے اُسے کیا گریز ہو سکتا ہے۔ یہ چیز صوبہ سرحد میں خاص طور پر کہنے کی ہے اور اس پر بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آپ کو اسلام کی تعلیم پر غور کرنا چاہیے اور خصوصیت سے قبائل کا جو وفد یہاں آیا ہوا ہے، اُس کی توجہ اِس جانب مبذول کراتا ہوں۔ بدلہ لینا اسلام میں قانوناً جائز ہے لیکن معاف کر دینا خدا کو سب سے زیادہ پیارا ہے۔ سرحد کے لوگ جو بدقسمتی سے اِس چیز میں مبتلا ہیں، انہیں اسلام کی تاریخ کا یہ رُخ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ اسلام نے جس قدر اتحاد اور اتفاق کی تعلیم دی ہے، آپ اُسے بھول چکے ہیں۔ آپ نے عوام کو تلقین کی کہ انہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "تفسیر القرآن" پڑھنی چاہیے۔ آپ نے کہا کہ ہم مذہبی مسلمان ہیں، سیاسی مسلمان نہیں۔ آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ خان عبدالغفار خان کی سب سے بڑی خدمت کیا ہے۔ سرحد میں اُن کی خدمات سے آپ واقف ہیں لیکن سرحد سے باہر انہوں نے جو خدمت کی ہے، وہ بہت بڑی ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں کو سرحد کے مسلمانوں سے طرح طرح کے شبہات تھے، انہیں خان عبدالغفار خان نے دُور کر دیا ہے اور یہ بات سرحد والوں کی محبت بتا رہی ہے۔ اِس کام کے لئے ہم کسی طرح بھی خان عبدالغفار خان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔

## ڈاکٹر خان صاحب کا ایک معجزہ

اُن کے دوسرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے حال میں ہی ایک معجزہ کیا ہے۔ اِس سے شاید آپ یہ خیال کرنے لگیں کہ انہوں نے وزارت بنالی ہے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر خان صاحب کے وزارت بنانے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اِس سے پہلے ڈاکٹر خان صاحب اور دوسری کانگریسی

وزیروں نے بتادیا ہے کہ اُن کے نزدیک پاؤں کی چپل اُتار کر پھینک دینا تو مشکل ہے لیکن وزارت کو چھوڑ دینا کوئی مشکل کام نہیں، لیکن ہم نے جب وزارتیں چھوڑیں تو ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ کانگریس والوں نے وزارتیں چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی، لیکن اعتراض کرنے والے یہ بُھول جاتے ہیں کہ جب یہ وزارتیں چل رہی تھیں تو لڑائی کا اعلان ہوا لیکن اُن سے مشورہ لئے بغیر ہندوستان کو لڑائی میں شامل کر دیا گیا۔ کانگریس کی غیرت اِس بات کو گوارہ نہیں کر سکتی تھی۔ آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں ڈاکٹر خان صاحب کے معجزے کا ذکر کر رہا تھا اور وہ معجزہ یہ ہے کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے بہت بڑے لیڈر مہر چند کھنہ کا دل بدل دیا ہے اور اب مہر چند کھنہ صرف ہندوؤں کے لئے جنگ نہیں کرتے بلکہ اُن کا دل اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اُس میں ہندو اور مسلمان دونوں سما سکتے ہیں۔ مہر چند کھنہ صرف صوبہ سرحد میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ اُن کا دل بدل دیا گیا۔ میں ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت بنانے کی مبارک باد نہیں دیتا، بلکہ اس بات کی مبارک باد ضرور دیتا ہوں کہ کانگریس صحیح معنوں میں ہندو اور مسلمانوں کی نمائندہ ہے اور بہت جلد وقت آنے والا ہے جب کانگریس کے لیڈر مسٹر ساور کر کا دل بھی موہ لیں گے اور اسی طرح ہندو سبھا کے موجودہ صدر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کے دل کو بھی موہ لینے پر یقین رکھتے ہیں۔

## قائداعظم ہمارے پلیٹ فارم پر آئیں گے

اب آپ کہیں گے کہ ہندوستان کی ایک اور بڑی شخصیت ہے جن کے دل میں آج سے چند برس پہلے سارا ہندوستان سمایا ہوا تھا لیکن آج کل وہ ہم سے بہت غصہ ہیں، وہ ہیں مسلمانوں کے قائداعظم۔ لیکن میں نہایت ادب سے کہوں گا کہ اُنہیں بے جا غصہ ہے۔ بہر حال امید ہے کہ ہمارے سچے جذبات اسی زندگی میں انہیں اس پلیٹ فارم پر لے آئیں گے، مجھے اس بات کا یقین ہے اور مجھے یہ یقین کانگریس لیڈروں کے سچے جذبات کی وجہ سے اور ہندو مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھنے کی وجہ سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کانگریس سے غلطیاں ہوئی ہوں، آخر اتنا بڑا ادارہ ہے اور میں تو یہ کہوں گا دنیا بھر میں کانگریس قربانی کرنے والوں کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور اتنے بڑے ادارے میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی ایک آدمی سے کبھی بھی غلطی نہ ہو سکے۔ اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ سہواً ہوئی ہے اور نیک نیتی پر مبنی ہے۔

## انگریزی حکومت نے ہماری یکجہتی کو ختم کر رکھا ہے

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا، میں اب اپنے ہندو بھائیوں کو مخاطب کروں گا جو بدقسمتی سے یہ خیال کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اس ملک کو غلام رکھنے کی سازش کی ہوئی ہے۔ لیکن میں انہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسمانوں کو اس ملک سے بہت محبت ہے اور یہاں آنے کے بعد مسلمان بادشاہوں نے جو کچھ کیا، میں اُسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ اسکولوں اور کالجوں میں یہ غلط طور پر بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے صرف ہندوؤں کے مندر ہی مندر گرائے ہیں اور انہیں تنگ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا، لیکن یہ باتیں غلط ہیں۔ یہاں مسمان اور ہندو باہمی میل جول سے ایک قوم بن گئے تھے، اُن کی طرزِ معاشرت ایک تھی اور اُن کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا ہوگئی تھی، لیکن ہماری بدقسمتی سے حکومت نے ہماری یکجہتی اور وحدت کی سب سے بڑی نشانی ہماری زبان کو بھی جھگڑے کا ایک مسئلہ بنادیا ہے۔

## مسلمانوں نے مندروں کے لئے جاگیریں اور وظیفے مقرر کئے

جن لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے صرف مندر گرائے۔ انہوں نے مندروں کے لئے جاگیریں اور وظیفے مقرر کئے اور اس بات کا ثبوت اکبر سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کے فرامین موجود ہیں اور کئی فرمانوں میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ مقررہ شدہ وظیفہ پجاریوں کو اُن کے گھروں میں پہنچایا جائے اور انہیں وظیفے کے لئے خود نہ آنا پڑے۔

## نیشنل ازم کا پرچار شیر شاہ سوری نے کیا

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں نیشنل ازم کو پھیلانے والے مسلمان تھے اور ہمیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے، لیکن بعض لوگ سیاسی غرض کی خاطر ملک کی وحدت کو اور اس بات کو جھٹلاتے ہیں اور اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے اُن سے انکار کرتے ہیں۔ ہندوستان میں نیشنل ازم پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے ایک افغان نے پیدا کیا یعنی شیر شاہ سوری نے۔ جس نے نیشنل ازم کے خیال کو اتنا پھیلایا کہ انگریز مورخ بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے

کہ جس طرح اس پٹھان نے ملک پر حکومت کی، اس طرح انگریزی حکومت بھی نہیں کر سکی۔ شیر شاہ سوری کے بعد نیشنل ازم کا پرچار ایک دوسرے افغان خان عبدالغفار خان نے کیا اور افغانوں کو اس بات کا فخر ہے کہ انہوں نے ہی اس کام کو شروع کیا اور انہوں نے ہی اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

## قربانیوں کا ثمر ملے گا

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ 1943ء میں جو کچھ ہوا، میں اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا لیکن عام طور پر ملک میں یہ سمجھا گیا کہ کانگریس مردہ ہوگئی ہے لیکن آج 1945ء میں یہ پہلی کانفرنس ہے، جو قانونی حیثیت سے اس صوبے میں ہو رہی ہے اور کانگریس کے زندہ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس تشدد اور تکلیفات کے بعد جو خدائی خدمت گاروں کو ہوئیں، جب پہلا موقع ملا ہے تو یہ جوش وخروش دیکھا جا رہا ہے، لیکن اب کام دگنا اور زیادہ تیزی سے ہو سکے گا۔ 1942ء کی قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی۔ قومیں قربانیوں سے ہی بنتی ہیں، ہاتھ پر ہاتھ رکھے رہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن خدا اُس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم اپنی حالت بدلنے کو تیار نہ ہو۔ ان دونوں سالوں میں ہندوستان میں جو کچھ ہوا جب کبھی موقع ملا آپ دیکھیں گے کانگریس کا مرجانا تو درکنار کانگریس اور زیادہ طاقتور ہوگئی ہے۔ ہندوستان کی آزادی معلوم ہوتا ہے کہ بہت دُور ہے لیکن بھائیو! ایسا نہیں ہے۔ خدا کا کارخانہ انصاف پر چلتا ہے۔ دنیا کی قوموں کی جو شامت ہو رہی ہے اور یورپین قومیں جس طرح لڑ کر اپنی تہذیب کو ختم کر رہی ہیں، اُن کی حالت سے ہندوستان کی آزادی بہت دُور نہیں۔ اگر ہندوستان آزاد نہ ہو تو ہمارے حاکم دنیا میں امن قائم نہیں رکھ سکتے۔ اور پھر ابھی تو بڑی بڑی سرگرمیوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ایشیاء کے لئے تیسری لڑائی کا نتیجہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن یورپ کا تیسری لڑائی میں خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا میں انسانیت کا جو سب سے بڑا رشتہ ہے، یورپ کئے لوگوں میں یہ بھی باقی نہیں رہا اور اب حالت وہی ہے کہ ہندوستان کو اور غلام رکھنا ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان کو آزادی حاصل ہوگی اور اسے حاصل کرنے کے لئے صوبہ سرحد کے لوگ سب سے آگے آئیں گے۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ لارڈ ویول انگلستان گئے ہیں، میں نہیں جانتا کہ لارڈ ویول کیا کرنے گئے ہیں لیکن وہ جس واسطے بھی گئے ہوں، اگر اب

بھی ہندوستان کو یہ نہ جتایا گیا کہ اس لڑائی کو اپنی لڑائی سمجھ کر حصہ لے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ برٹش حکومت کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ لڑنے والے ملکوں نے وہ قربانی نہیں دی ہوگی جو ہندوستان نے دی ہے۔ ان چار پانچ برسوں میں ہندوستان نے نہ صرف ڈیڑھ سو برس کے قرضے ادا کر دیئے ہیں بلکہ دس یا بیس گنا زائد قرض لینا بھی ہے۔ پہلے تو ہندوستان پر قرضہ تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ ہم قرضہ لئے بغیر کس طرف جائیں، لیکن اب یہ کہا جائے گا کہ ہم مقروض ہیں اور بغیر قرضہ ادا کیے کیسے چلے جائیں، ہماری جان تو کسی طرح چھوٹتی نظر نہیں آتی۔ ہمارے ملک کے کئی محبوب لیڈر قید و بند میں پڑے ہیں۔ انہیں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ جو جذبہ اس سلسلے میں ملک کے اندر موجود ہے، اُسے گورنمنٹ نہیں جانتی تو میرے بتانے کا کیا فائدہ؟

اب میں کچھ باتیں ڈاکٹر خان صاحب اور اُن کی وزارت سے کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے وزارت کیوں بنائی، کیا وزارت اس لئے بنائی کہ وزیر اعظم کہے جائیں اور اس پر فخر کریں یا اُن کے ساتھی وزراء خوش ہوں؟ اگر آپ وزارت بنانے کا مقصد یہ لیتے ہیں تو آپ کی بڑی بھاری غلطی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے وزارت بنانے کے بعد سب سے پہلا اعلان کیا کہ میں رشوت ستانی کو دُور کر کے رہوں گا۔ گذشتہ کانگریسی وزارت چاہے کتنا ہی اعتراض کیوں نہ کرے، کوئی انہیں کسی طرح بھی ملعون نہیں کرسکتا۔ سب سے بڑا کام جو وزارت کا ہوگا اور ہونا چاہیے کہ یہاں صوبہ سرحد کے غریب اور مزدور کی اصلی معنوں میں خدمت کی جائے، میں یہ بات اُن سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ غریبوں کی زیادہ سے زیادہ اور جلدی سے جلدی خدمت کریں اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو انہیں چاہیے کہ اسی گھڑی اعلان کر دیں کہ ہم وزارت کو لات مارتے ہیں۔ آپ نے کانگریس وزارت کی توجہ فوری طور پر صوبے کی تعمیری کاموں کی جانب مبذول کرائی اور آپ نے بتایا کہ بنجر زمینوں کو آباد کیا جائے، تمباکو کی کاشت کو ترقی دی جائے اور سگریٹ بنانے کا کام شروع کیا جائے اور کچھ نوجوانوں کو وظیفہ دے کر باہر کام سیکھنے کے لئے بھیجا جائے، شوگر فیکٹریاں تیار کی جائیں اور صوبے میں چمڑے وغیرہ کی صنعت کو فروغ دیا جائے۔ آپ نے کہا کہ موجودہ وزارت کو دس برس کے لئے ایک باقاعدہ پلان تیار کرنا چاہیے کہ کس طرح صوبے میں کارخانوں کے ذریعے، آب پاشی کے ذریعے، زراعت کے ذریعے اور دیگر ذرائع سے ترقی دی جاسکے گی۔

اس کے بعد آپ نے تعلیم کا ذکر کیا اور کہا کہ کانگریسی وزیر تعلیم کا کام ہے کہ صوبے میں عوام

کی تعلیم کا کام شروع کریں اور جاہلیت کی لعنت کو صوبے سے دُور کیا جائے۔آپ نے کہا کہ کانگریس کے وزیر تعلیم کو خود چوک میں کھڑے ہو کر پہلے تعلیم کا کام شروع کرنا چاہیے۔اب سوال رہ جاتا ہے کہ ان کاموں کے کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے؟ میں عرض کروں گا کہ سنٹرل گورنمنٹ نے صوبہ سرحد کے لئے 12 کروڑ روپیہ منظور کیا ہے۔ایسے صوبے میں جو ہندوستان کے بچاؤ کا صوبہ ہے، 12 کروڑ کی رقم نہایت ہی ناچیز ہے۔اس کانفرنس کو مرکزی حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ کم از کم 50 کروڑ کی رقم اس صوبے کے لئے منظور کی جائے۔میں آئندہ سنٹرل گورنمنٹ کی صورت ایسی دیکھنا چاہتا ہوں جو صوبہ سرحد کے اس مطالبہ کو منظور کرے یا برطانوی حکومت سرحد کو یہ رقم اپنے قرضہ میں سے دے دے۔اس پچاس کروڑ کی رقم سے بھی یہ سارا کام پورا نہیں ہوسکتا لیکن تاہم بہت سا کام ہو جائے گا۔

آخر میں آپ نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے دل میں صوبہ سرحد کے لوگوں کے لئے بہت محبت ہے۔وہ صوبہ سرحد کے لوگوں کو بہت اپناتے ہیں۔لیکن وہ بیماری کی حالت میں یہاں نہیں آسکتے، انہوں نے بھی کانفرنس کی کامیابی کے لئے پیغام بھیجا ہے اور اُمید کرتے ہیں کہ جو کام آپ نے شروع کیا ہے، اُسے آپ کی قابلیت پایہ تکمیل تک پہنچا دے گی۔

☆☆☆

# اجلاس کی دوسری نشست

دُنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

23-اپریل کو 10 بجے کے قریب کانفرنس کا کھلا اجلاس منعقد ہوا۔ڈاکٹر سیّد محمود انقلاب آفریں نعروں کی گونج اور تالیوں کی گہری آواز میں تشریف لائے۔چند انقلابی ترانوں کے بعد صدارت کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی گئی جس میں شری مہادیو ڈیسائی، کستوربا، بیگم آزاد، آغا لال بادشاہ، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، سیّد اکبر خان، سیّد احمد خان، کامدار خان اور ایس پنڈت کی

بے وقت موت پر اظہار تاسف کیا گیا اور اُن شہیدوں کو خراج تحسین ادا کیا گیا جنھوں نے آزادی وطن کی خاطر مسکراتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔

دوسری قرارداد میں اسیران چھپور و آشتی کی سزائے پھانسی کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا اور کانفرنس کی رائے میں سزا کو برقرار رکھنا سنگدلانہ قتل تصور کیا گیا۔

## عدم تشدد میں شکست اور مایوسی کا نام بھی نہیں ہے پشاور پولیٹیکل کانفرنس میں فخر افغان کی تقریر

بھائیو! میں چاہتا ہوں کہ آپ نہایت خاموشی کے ساتھ میری چند ضروری باتیں سنیں۔ میں خدائی خدمت گاروں اور دیگر سب اصحاب کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ بہت سے لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھے وقتاً فوقتاً تکلیف دیتے ہیں۔ اِس لیے میں مجبور ہوں کہ جو حالات ہیں، وہ آپ کے سامنے رکھوں۔ میری غرض اور مقصد جو کچھ ہے اگر آپ اُس میں میری مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو کریں کہ مجھے میرے کام کے لئے چھوڑ دیں۔ آپ نے کہا کہ بار بار لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ 4۔ ستمبر کو آزادی کا جو اعلان کیا گیا تھا اُس کا کیا حشر ہوا، اور اِس کے علاوہ لوگ مجھ سے وزارت کے متعلق بھی دریافت کرتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو تقریروں اور اخبارات کے ذریعہ پہلے بھی بتایا ہے کہ ہماری جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اِس کے علاوہ وہ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور وہ مجھے کچھ کرنے کو کہتے ہیں جو اُن کے دل میں ہوتا ہے چاہے وہ میرے اُصولوں کے مطابق ہو یا نہ ہو، اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمام خدائی خدمت گار میری باتیں غور سے سنیں:

1- 4۔ ستمبر کے ریزولیوشن کے متعلق مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ موجود ہے یا نہیں، جو ہم نے اعلان کیا ہے، وہ بدستور موجود ہے۔ آزادی یعنی اپنے ملک کے لئے اختیارات حاصل کرنا، یہ ہمارا نصب العین ہے اور اِس جگہ ہم اپنے ملک کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ چیز بدستور اِسی جگہ موجود ہے۔ اب اِس کو حاصل کرنے کی بات رہ جاتی ہے۔ اِس کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا جاتا ہے، ایک طریقہ ہوتا ہے اور ہم نے اسی طریقہ سے جدوجہد شروع کی تھی، لیکن دنیا میں مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پروگرام ہمیشہ بدل سکتا ہے لیکن نصب العین نہیں بدل سکتا۔ آپ اس بات پر غور نہیں کرتے اور اِس کے لئے مجھ سے پوچھتے ہیں۔

ہمارا نصب العین اپنے ملک کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن اِس چیز کو حاصل کرنے کے لئے جو پروگرام ہم بنائیں گے، وہ ایک نہیں ہوسکتا۔ آپ موجودہ جنگ کو دیکھیں، اِس میں جرنیل وقتاً فوقتاً اپنے پروگرام کو تبدیل کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کا نصب العین نہیں بدلتا اور پروگرام قوم اور قوم کی طاقت دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:

2- ہمارا پروگرام جو بدلا ہے، اِس میں خدائی خدمت گاروں کا قصور نہیں۔ قصور اگر ہے تو قوم کا، جس نے اِس طرف قربانی نہیں دی لیکن پھر بھی خدائی خدمت گاروں اور نوجوانوں نے جو قربانیاں دی ہیں، وہ ہمیں اپنی منزل کے قریب لے گئے ہیں۔ اگر آپ نے ہماری بات مانی ہوتی اور ہماری تھوڑی سی بھی مدد کی ہوتی تو آج ہم اپنے پروگرام میں کامیاب ہوتے۔ ہماری ناکامی کی وجوہات میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ اِس ملک کی خدمت محض خدائی خدمت گاروں نے نہیں کرنی اور نہ ہی یہ ملک محض خدائی خدمت گاروں کا ہے۔ جب ملک آپ کا ہے تو اِس کی خدمت آپ کیوں نہ کریں۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

3- میں پارلیمنٹری آدمی نہیں، میں انقلابی آدمی ہوں۔ جو لوگ جیل میں میرے ساتھ رہے ہیں۔ میرے خیالات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جب کچھ لوگ جیلوں سے رہا ہوئے تو میں نے انہیں کہا تھا کہ آپ گھروں میں نہ بیٹھیں اور اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو محض آواز بلند کریں، لیکن آپ سے اتنا بھی نہ ہوسکا، آپ سے آواز تک بھی نہ اُٹھائی گئی۔ آج میں آیا ہوں تو ہر ایک طاقتور بن گیا ہے۔ ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا، ابھی تو کام اسی طرح جاری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میں پھر وہ چیز پیدا کروں، وہ جذبہ پیدا کروں اور جب مجھے یقین ہو جائے کہ آپ تیار ہیں تو پھر دیکھئے کہ میں جنگ جاری کرتا ہوں یا نہیں۔ آپ لوگ تالیاں بجاتے ہیں لیکن تالیاں بجانے سے میں خوش نہیں ہوسکتا۔ میں تو عمل کا آدمی ہوں۔ کئی لوگ اپنے آپ کو بزرگ اور بڑے عالم کہتے ہیں، لیکن قوم کے لئے کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہماری قوم بہت سادہ ہے۔ آج ملک میں کئی طرح کی پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں اور لوگ کئی طرح کی باتیں کر رہے ہیں، لیکن ہمارے سامنے وہی پروگرام ہے، وہی نصب

العین ہے۔ تبدیلی صرف پروگرام میں ہوتی ہے۔ اب میرا پروگرام یہ ہے کہ جو مایوسی آپ میں پیدا ہو چکی ہے، اُسے دُور کروں۔ عدم تشدد میں شکست اور مایوسی کا نام نہیں۔

آپ نے وزارت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

4- جو لوگ میرے ساتھ جیل میں رہے ہیں انہیں میرے خیالات کا اچھی طرح علم ہے۔ آپ وزارت کو چھوڑیئے میں تو الیکشن کے بھی خلاف تھا، آخر جنگ کے دوران میں الیکشن کی کیا ضرورت ہے، لیکن جیل میں جب میں نے آپ کی دعائیں اور ختم دیکھے تو یہ بات میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا کہ آپ وزارت چاہتے ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ آپ جیل خانوں سے تنگ آ گئے تھے، میں تھوڑے سے وقت میں آپ کی نیت بھانپ گیا تھا، میرے سامنے کبھی تاریکی نہیں ہوتی، جب میں کوئی قدم اُٹھاتا ہوں تو میرے سامنے روشنی ہوتی ہے۔ صرف وہی لوگ اپنا قدم ادھر اُدھر کرتے ہیں جو پہلے سوچ کر قدم نہیں اُٹھاتے۔ میری آج بھی وہی رائے ہے جو پہلے تھی۔ وزارت میں جو طاقت ہے ہم اِس سے ملک اور قوم کی خدمت نہیں کر سکتے، میرا یہ اختلاف ہے اور اسی لئے میں یہ ذمہ داری نہیں لیتا۔ میں جس طریقہ سے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، اُسے وہ چیز پورا نہیں کرتی۔ لیکن ہم تو خدائی خدمت گار ہیں، خدائی خدمت گار میں صبر اور تحمل کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

آپ نے کہا کہ:

5- جو لوگ باہر تھے اور جن کا عقیدہ پارلیمنٹری پروگرام میں ہے اور علاوہ ازیں آپ لوگوں کا بھی تقاضا بھی تھا کہ اِس ملک میں جو عجب اندھیر مچا ہوا ہے، اُس کے لئے یہ چیز (وزارت) مفید ہو سکتی ہے اس لئے آپ لوگوں کا مطالبہ تھا، مجھے کہا گیا کہ اِس چیز سے ہم لوگوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ چونکہ میں خدائی خدمت گار ہوں، چنانچہ میں نے کہا کہ اگر آپ اس سے ملک اور قوم کی خیر کر سکتے ہیں تو میں آپ کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا، لیکن میں نے یہ بھی کہا کہ عوام کی آج ایک بات ہوتی ہے تو کل دوسری۔ لیکن وہ آپ کی تکالیف اور آپ کے مطالبات سے متاثر ہوئے ہیں۔ انہیں یہ بھی کہا کہ اگر میں نے دیکھا کہ آپ عوام کی خدمت کر سکتے ہیں تو پھر آپ کے ساتھ امداد بھی کروں گا۔ کچھ لوگ آتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ بادشاہ خان ہم تو جو کچھ کرتے ہیں، آپ کے لئے کرتے

ہیں، لیکن میں کس کے لئے کرتا ہوں، اگر کوئی میرے لئے کام کرتا ہے تو بالکل نہ کرے۔ اگر آپ خدا کے لئے کر سکتے ہیں تو کریں، اور اگر میرے لئے کام کرتے ہیں تو مت کریں۔ میں بھی جو کچھ کرتا ہوں، خدا کے لئے کرتا ہوں۔ میرا کسی پر احسان نہیں، میرا راستہ مصیبتوں اور تکلیفوں کا راستہ ہے۔ آپ اِس بات پر غور کریں۔ اگر آپ مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کر سکتے ہیں تو میرے ساتھ آئیں، ورنہ بالکل نہ آئیں۔ میں فقیر آدمی ہوں، میرے پاس خدمت ہے، اگر آپ خدمت کر سکتے ہیں تو آئیں۔ ہر شخص محض اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ لیکن آپ کو وہ کام کرنا چاہیے جس میں ملک کا فائدہ ہو، آپ ایسا طریقہ نکالیں کہ ملک اور قوم کی تکلیفات دور ہوں۔ لوگوں کو اپنے لئے نہیں مانگنا چاہیے بلکہ قوم اور ملک کے لیے مانگنا چاہیے، اسمبلی کے ممبروں کو بھی یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے۔ میں نے یہ باتیں آپ سے اِس لئے کی ہیں کہ آپ اِس پوزیشن کو سمجھ سکیں اور میرا وقت ضائع نہ کریں تا کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔ خدائی خدمت گاروں کی عزت سے ملاقاتوں میں نہیں بلکہ عوام کی خدمت سے ہے۔ ہمارے سامنے کام کا بہت بڑا میدان ہے۔ ہم نے اپنی سرحدات کے مسئلہ کو حل کرنا ہے کیونکہ خدائی خدمت گار بنی نوع انسان کی خدمت کے دعویدار ہیں۔

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:

6- میں نے اغوا، ڈاکے وغیرہ دُور کرنے کے لئے قبائل کو وفد بھیجا لیکن اُسے گرفتار کر لیا گیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اِس میں حکومت کا کیا نقصان ہے۔ میں آج دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر حکومت یہ مسئلہ حل کرنا چاہتی ہے اور ایمانداری سے حل کرنا چاہتی ہے تو ہم اُسے اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ اگر میری تجاویز پر عمل کیا جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ لوگ جنہیں ہندوستان کا دشمن کہا جاتا ہے، ہندوستان کے دوست بن جاتے ہیں یا نہیں۔ مجھے چند آدمیوں کی ضرورت ہے تا کہ میں اُنہیں تربیت دوں اور پھر وہ بے غرض خدمت کے لئے نکلیں۔

آخر میں آپ نے فلسفہ عدم تشدد پر روشنی ڈالی اور کہا:

7- عدم تشدد کو لوگ نہیں سمجھے ہیں۔ میں آج یورپ کی تباہی اور بربادی کو دیکھتا ہوں کہ وہاں خدا

کی مخلوق کے لئے ذرا رحم نہیں ہے تو میرا عدم تشدد پر عقیدہ اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ تشدد کیا ہے نفرت اور عدم تشدد کیا ہے محبت۔ تشدد...... آپ نے دیکھا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جو قومیں تشدد کرتی ہیں، انہیں شکست بھی ہو جاتی ہے لیکن عدم تشدد میں صرف فتح ہی فتح ہے۔ عدم تشدد کے جذبے کو ہی اسلام میں جہاد کیا گیا ہے اور یہ عدم تشدد ہی ہے، آپ ہندوستان کو دیکھیں اُن سے تشدد ہوا، ہم سے نہیں ہوا۔ آپ اپنی تحریک میں دیکھیں، آپ کا جذبہ بڑھا ہوا ہے، آپ میں 1932ء میں جو ڈر تھا، آج وہ ہے ہی نہیں۔ یہ کیا چیز ہے۔ آپ آگے ہی آگے جا رہے ہیں۔ پھر شکست کیسی ہے... تشدد کی جنگ کا نتیجہ جنگ ہے۔ ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ اور پھر اُس سے بڑی جنگ۔ جنگ سے قوموں اور ملکوں کی تباہی ہوتی ہے لیکن عدم تشدد کا نتیجہ محبت اور امن ہوتا ہے۔ 1913ء کی جنگ کے بعد آج اُس سے بھی بڑی جنگ ہو رہی ہے۔

آپ نے سان فرانسسکو کانفرنس کا ذکر کیا اور کہا کہ:

8- اتحادیوں کو چاہیے کہ مخالف قوموں کو پیار اور دوستی سے جیتیں، زبردستی اور جبر سے امن قائم نہیں ہو سکتا، پریم اور دوستی سے دنیا کو ہمیشہ تباہی اور بربادی سے بچایا جا سکتا ہے۔

## نیشنل گورنمنٹ

آپ کی تقریر کے بعد شری بھولا ڈیسائی نے نیشنل گورنمنٹ کے متعلق قرارداد پیش کی۔

## اللہ نواز خان

نواب زادہ اللہ نواز خان ایم۔ ایل۔ اے نے مسٹر بھولا ڈیسائی کے ریزولیشن کی تائید کرتے ہوئے تقریر کی جس میں آپ نے کہا کہ ''آزادی گردن کے خون دینے سے ملتی ہے، آئینی طریقوں سے نہیں ملتی، ہندوستان ایشیاء کا جیل خانہ ہے۔ اِس کے داروغے مسلم لیگ یا کانگریس بدلتے رہتے ہیں۔ ہم تو بالکل ہی اِس نظام کا تختہ اُلٹ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ گذشتہ لڑائی کے بعد آپ کو جلیانوالہ باغ اور رولٹ ایکٹ ملے۔ باتوں سے کچھ نہیں ملے گا، وہاں ہندوستان کے جو غدار نمائندے بیٹھے ہیں، وہ آپ کی ترجمانی کریں گے۔ سان فرانسسکو

کانفرنس کو کتنا بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے، ایشیاء کی غلامی ہرگز نہیں جائے گی۔ آپ کی جنگ آزادی 1857ء سے شروع ہوئی، اگر عبدالغفار خان کے سر پر لاٹھیاں پڑی ہیں تو آپ کے سر پر پڑی ہیں۔ غدر میں سرحد کے پٹھانوں، پنجاب کے سکھوں اور ڈوگروں نے انگریز کی امداد کی۔ میں چرچل اور ایمری سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے جنگ کے مقاصد اور ''ہندوستان چھوڑ دو'' میں کیا فرق ہے، اگر انگریز سچا ہے تو ہندوستان میں روس کی حکومت کا اعلان کر دے۔ ہندو اور مسلمان کا واسطہ چولی اور دامن کا ہے۔''

☆☆☆
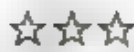
# شام کا اجلاس

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

## ڈرامہ: ''غریب کی جھونپڑی''

4 بجے قریب افغان نگر کی کشادہ اسٹیج پر ایک پولیٹکل ڈرامہ کھیلا گیا جس کی ڈائرکشن پشتو زبان کے بہترین شاعر خان اکبر نے کی۔ یہ ڈرامہ سیاسی نوعیت کا تھا جس میں بڑے زمیندار کی فرعونیت پسندانہ ذہنیت اور ستم رسیدہ روش کا منظر پیش کیا گیا تھا اور ساتھ ہی غریب کسانوں کی فاقہ کشی اور گھریلو تباہی کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ آخری پلاٹ میں فخر افغان کی پسلیاں توڑنے اور پولیس کے مظالم کی داستان بیان کی گئی تھی۔ ڈرامہ دیکھنے کے لئے 50 ہزار کے قریب اشخاص موجود تھے۔ عوام پر گہرا اثر ہوا۔

## مشاعرہ

7 بجے سے 8 بجے تک پشتو اور اُردو زبان میں مشاعرہ ہوا۔ قاضی عطاء اللہ وزیر تعلیم اِس کے صدر تھے۔ پشتو زبان کا مشاعرہ کامیاب رہا۔ صوبے کے بہترین شعراء نے اپنے کلام سے

پبلک کو نوازا۔

رات کے 10 بجے کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ صدر منتخب کسی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے، اس لئے عارضی طور پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ دستور کے مطابق ابتداء میں چند نظمیں پڑھی گئیں۔

## ارباب عبدالرحمان ایم۔ ایل۔ اے۔

آپ نے شری بھولا ڈیسائی کے ریزولیوشن کی تائید کی۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک کانگریسی رہنماؤں کو رہا نہیں کیا جاتا، ہندوستان میں قومی حکومت قائم نہیں ہو سکتی، آپ نے فرمایا کہ امریکہ، برطانیہ، روس کی آبادی ہندوستان سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہندوستان کی آواز نہیں سنی جاتی، ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک انگریز موجود ہے اتفاق نہیں ہوگا اور جب تک دنیا کا 1/5 حصہ یعنی ہندوستان غلام رہے گا، دنیا میں حقیقی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کی آزادی کا سہرا پٹھانوں کے سر پر ہوگا۔ نیشنل گورنمنٹ کے متعلق آپ نے کہا کہ جب پنڈت نہرو، مولانا آزاد جیسی...... ہستیاں جیلوں میں ہیں، کسی قسم کی قومی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

## بابا مون سنگھ گاگا

قرارداد کی تائید کرتے ہوئے بابا مون سنگھ گاگا نے کہا کہ صوبہ سرحد کے متعلق مجھے پہلے سے یقین تھا کہ وہاں کے پٹھان آزادی کی خاطر کٹ مرنا جانتے ہیں، لیکن اپنی آنکھوں سے سرخ فوج کو دیکھ کر میرا دل بڑھ گیا ہے۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ ہندوستان اب غلام نہیں رہ سکتا۔ انگریز زیادہ دیر تک ہندوستان پر جبر و استبداد کا دور نہیں چلا سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ سکھ پیدائشی کانگریسی ہیں۔ شری گورو گوبند سنگھ جی نے سکھوں کو قربانی کا درس دیا ہے۔ سکھ ازم اور غلامی دو متضاد نظریے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو پہلے ہندوستانی بننا چاہیے۔ سنٹرل اکالی دل کی طرف سے آپ نے فرمایا کہ وہ کانگریس کے ساتھ ہے اور ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہے۔

## مفتی ضیاء الحسن

صدر مسلم مجلس لاہور نے کہا کہ پشاور وہ سرزمین ہے جس نے ہندوستان کے اندر آزادی کی تحریک کو چار چاند لگائے ہیں، ہندوستان میں آزادی کی لہر کا منبع شہدائے سرحد کا خون ہے، لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ آزادی مانگنے سے نہیں ملا کرتی، ہم نے دنیا کی آزادی کے لئے اپنے لاکھوں نوجوان قربان کئے ہیں، لیکن خود آزادی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ سان فرانسسکو کانفرنس کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان کی طرف سے جو نمائندے منتخب کر کے بھیجے گئے ہیں، وہ ہرگز ہندوستان کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔ قومی جنگ کا نعرہ لگانے والوں سے آپ نے اپیل کی کہ وہ کانگریس کے ترنگے جھنڈے تلے آجائیں۔ آپ نے کہا کہ ہماری مصیبتوں کا واحد حل قومی حکومت ہے۔

## اگر دنیا کا 1/5 حصہ غلام ہے تو دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا بلوچ گاندھی کی تقریر

خان عبدالصمد خان صدر انجمن وطن بلوچستان نے ریزولیوشن کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سرحد کے پٹھانوں سے گہری واقفیت ہے۔ خیال تھا کہ پختون انگریزوں کو 1942ء کی جنگ میں نکال دیں گے لیکن تین برس کے بعد بھی ہم اسی منزل پر ہیں۔ یہ ہماری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ "ہندوستان چھوڑ جاؤ" کا نعرہ کہتا ہے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا، اطمینان اور تسلی نہ ہوگی۔ اگر دُنیا کا 1/5 حصہ غلام ہے تو دُنیا کے باقی چار حصوں میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ مرکزی حکومت نے بعد از تعمیر جنگ صوبہ سرحد کے لئے 12 کروڑ روپیہ منظور کیا ہے۔ دہلی اور اجمیر کے علاقوں کی تعلیمی حالت پر ہر سال 25 لاکھ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے لیکن بلوچستان جیسے علاقے میں صرف ساڑھے تین لاکھ روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مرکز میں اورنگ زیب کی حکومت نہیں، جو ایک عدم اعتماد سے گر جاتی ہے بلکہ وہاں انگریز کی حکومت ہے جسے بارہا شکستیں ہوئیں۔ صوبہ سرحد کی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ فرنٹیر کرائم ریگولیشن، جرگہ سسٹم وغیرہ اب تک موجود ہیں۔

## مولانا داؤد غزنوی

ابھی تک حکومت کے تشدد کی مشین چل رہی ہے لیکن اس کے باوجود کانگریس نے لوگوں کے دلوں میں جو جگہ پیدا کر لی ہے، انگریزی طاقت اُسے نکال نہیں سکتی۔ یہ کانفرنس اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کانگریس وزارتوں کے ساتھ زندہ ہے، محض پروپیگنڈا ہے، کانگریس کی زندگی اُس کے پاکیزہ اصولوں کی وجہ سے ہے۔ آپ نے جنگی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ایشیاء کی آزادی وابستہ ہے۔ اگر اب بھی ہندوستان کو آزاد نہ کیا گیا تو یاد رکھیے، یورپ چین سے نہیں بیٹھ سکتا اور ایک تیسری جنگ کے لئے میدان صاف کر رہا ہے۔ اگر آج ہٹلر اور مسولینی کو ختم کر دیا جائے اور انگریز کی غلامانہ ذہنیت کا یہی حال رہے تو پھر کل مسولینی اور ہٹلر پیدا ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک ہندوستان کے رہنماؤں کو رہا نہیں کیا جاتا، ڈیڈلاک ختم نہیں ہو سکتا۔

## سرحد کا پٹھان قربانی کا پُتلا ہے، وطن سے محبت کرنا ہمارا جزوِ ایمان ہے، ڈاکٹر کچلو

ڈاکٹر سیف کچلو نے تقریر کرتے ہوئے کہا میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو تجاویز کے قائل نہیں، تجاویز پاس کرتے کرتے تو ناک میں دم آ گیا ہے، اگر آپ یہ خیال کریں کہ محض تجاویز پاس کرنے سے آزادی مل جائے گی تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ہندوستانیوں کے اختلاف کا بہت ڈھونگ رچایا جاتا ہے، ہم اپنے یہاں چاہے لڑیں یا کچھ کریں، اس سے کسی کو کیا۔ مجھ کو آج 40 کروڑ ہندوستانیوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو ہندوستان کی آزادی نہ چاہتا ہو۔ مسلم لیگ یا اکالی یا ہندو سبھا سب کے سب مکمل آزادی کے حق میں ہیں، کوئی بھی آزادی کے خلاف نہیں۔

آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جس ملک کو آزادی ملی ہے، وہ نوجوانوں نے لی ہے۔ ہندوستان کے نوجوانوں کو بھی ہم بوڑھوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے، ہر ہندوستانی جو اس ملک میں پیدا ہوا ہے، ہمالیہ کی چوٹی سے لے کر سمندر کے آخری کنارے تک ایک ایک انچ زمین اُس کی ہے۔

میں پاکستانی نہیں ہوں اور نہ ہی وطنیت کے خلاف ہوں۔ میں نے کئی کتابیں پڑھی ہیں لیکن میں آج تک پاکستان کو نہیں سمجھ سکا۔ وطن سے محبت کرنا ہمارا جز وایمان ہے۔ ہم وطن کے لئے ہر قربانی کو تیار ہیں۔ آپ نے کہا اگر انگریزوں کے دعویٰ درست ہوتے تو سان فرانسسکو کانفرنس میں ہندوستان کے اصلی نمائندوں کو بلایا جاتا۔ یہ سر فیروز خان نون کس کا نمائندہ ہے۔ آخر انہیں کیوں ہمارے سر پر ٹھونسا جارہا ہے۔ آپ نے کہا سرحدی پٹھان جسے جاہل کہا جاتا ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب سے آگے ہے اور جو مثال آپ لوگوں نے پیش کی ہے وہ ایسی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ آخر میں آپ نے کہا کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو نیچا دکھا کر بہت بڑی بات کی ہے۔ فرقہ پرست لوگ اِس بات کی کوشش کریں گے کہ وزراء کو فیل کیا جائے لیکن سرحد کے لوگوں کو ووٹوں کے ذریعے بھی فرقہ پرست لوگوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ آزادی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ایک پیدائشی حق ہے اور مسلمان کی شان اسی میں ہے کہ وہ فوراً آزاد ہو اور دوسروں کو بھی آزاد کرائے۔

## میونسپل کمیٹیوں کے مشترکہ انتخابات

آپ کے بعد حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں کانگریس حکومت کے اس فیصلے پر اظہار مسرت کیا گیا کہ اُس نے تمام لوکل باڈیز کے الیکشن کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انتخابات مشترکہ ہوں گے اور اقلیتوں کے لئے نشستیں مخصوص رکھی جائیں گی، اس ریزولیوشن میں بھی مطالبہ کیا گیا کہ فہرستوں کی ترتیب کا کام ایسے ہاتھوں میں دیا جائے جو پارٹی بازی سے بالاتر ہوں۔ آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا میونسپل کمیٹیاں اور دوسرے لوکل ادارے یہ ایسی جگہیں ہیں جہاں فرقہ وارانہ جھگڑے پیدا کرنے کی بنیادیں ہیں، اگر اس جڑ کو کاٹ ہی دیا جائے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ ہندوستان میں صوبہ سرحد کی وزارت ایک ایسی رہنمائی کررہی ہے جس پر سارا ہندوستان ناز کرے گا۔

## تائید

خیر محمد جلالی نے اس ریزولیوشن کی تائید کی اور کہا کہ جمہوریت کی ابتداء لوکل باڈیز سے ہوتی

ہے۔آپ لوکل باڈیز کو غیر اہم خیال نہ کریں اور مخلوط طریقہ انتخاب ہندوستان کے لئے بہترین مثال ہے اور اس کے لئے ڈاکٹر خان صاحب اور آپ کی وزارت مبارک باد کی مستحق ہے۔

☆☆☆

# اجلاس کی تیسری نشست

بات ہی کیا ہے، اگر آج ہوئے ہم برباد
کیا کوئی اہل جنوں دہر میں آباد بھی ہے

(مولانا پوپلزئی)

23 اپریل کو کانفرنس کے کھلے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی جس میں چند اہم تجاویز پاس کی گئیں۔

سید قائم شاہ وکیل نے ایک ریزولیوشن میں حکومت کو صوبہ سرحد کی صنعت کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ ایک کمیٹی فوری طور پر مرتب کی جائے جو چھ ماہ کے اندر ایک پروگرام زرعی اور آب پاشی اور معدنیات کی ترقی کے متعلق مرتب کرے، جس سے موجودہ صنعت کو ترقی ملے اور نئی صنعت کو جاری کرے۔ اس ریزولیوشن کی تائید عبدالقیوم خان صواتی جنرل سیکرٹری پراونشل کانگریس کمیٹی نے کی۔

## وزیرستان کے متعلق ریزولیوشن

امیر محمد خان نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس کے ذریعے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وزیرستان پر بمباری نہ کی جائے۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں بتایا کہ 1935ء ایکٹ کے تحت وزارت کو جو اختیارات حاصل ہیں، اُن سے وہ اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ یہاں جس طرز کی حکومت جاری ہے، ایک آئین کے تحت گورنروں کو اپنے وزیروں سے مشورہ کرنا پڑتا ہے اور دوسرا گورنر، گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے ایجنسیوں وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔

## پیر شہنشاہ کی تقریر

قرارداد کی تائید کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ وزیرستان کو بمباری کے ذریعے غلام نہیں بنایا جاسکتا، یہ غلامی قبول نہیں کریں گے۔ وزیرستان کا بدلہ اب اُن سے اُن کے اپنے ملک میں لیا جارہا ہے۔

## نواب زادہ قیوم کی تقریر

آپ نے کہا کہ ہندوستان کو کسی دوسری قوم نے فروخت نہیں کیا بلکہ ہم نے خود اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔ یہ آفتیں ہم پر مغربی لائے ہیں۔ مغرب اور مشرق کا تصادم لازمی ہے۔ سابقہ گورنمنٹ کا نصب العین پرمٹ بازی اور رشوت خوری تھا، اب وقت ہے کہ انگریز ہم سے صلاحیت طلب کرے، ایسا نہ کیا گیا تو نفرت کی آگ اُن کو جھلسا دے گی۔

## تعمیری پروگرام

خلیفہ فضل دین نے گاندھی جی کے تعمیری پروگرام کے متعلق قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعمیری پروگرام نہایت اہم چیز ہے۔ اس صوبے میں اس کام کے لئے کانگریسی ورکرز اسمبلیاں بنائی گئی ہیں۔ تعمیری پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے اندر عوام کی تکلیفیں دُور ہوں۔ آپ نے عوام کو چرخہ کاتنے، کھدر پہننے اور چھوت چھات کو دُور کرنے کی تلقین کی۔

### تائید

آپ کی تقریر کے بعد شریمتی امر کور نے ریزولیشن کی تائید میں تقریر کی اور کہا کہ یہاں کا جوش وخروش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں 1937ء میں بھی یہاں آئی تھی۔ جو لوگ چرخہ اور کھدر کو اپناتے ہیں، انہیں آج چرخہ کی اہمیت معلوم ہوگئی ہے۔ آپ لوگوں کو دوسروں کی دستکاری کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ آپ ان چیزوں کو اپنائیں جو ہماری ہیں۔ آپ نے کہا کہ مردوں کو عورتوں کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ انہیں دوش بدوش چلانا چاہیے۔ تعمیری پروگرام میں چھوت

چھات کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔

آپ کی تقریر کے بعد چوہدری محمد شفیع نے تقریر کی اور کہا کہ تعمیری پروگرام کے بغیر ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

## ہندوستانی نمائندوں کے ووٹ لارڈ ہیلی فیکس کی جیب میں ہوں گے

## سان فرانسسکو ریزولیشن

## رائے بہادر مہر چند کھنہ کی تقریر

اس پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس ریزولیشن کے متعلق کل شری یت بھولا بھائی ڈیسائی، خان عبدالقیوم خان اور ڈاکٹر سیف کچلو نے تقریریں بھی کیں لیکن ایک چیز اور ہے اور وہ یہ کہ اس کے متعلق ہندوستان کی مایہ ناز ہستی مہاتما گاندھی جی نے بھی ایک جامع بیان دیا ہے۔ دو سال ہوئے مجھے بھی ایسی کانفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا تھا، ایسی کانفرنسوں میں جو ڈیلی گیٹ چنے جاتے ہیں وہ گورنمنٹ چنتی ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر کہہ رہا ہوں کہ ایسی کانفرنسوں میں ہندوستانیوں کی آواز نفی کے برابر ہوتی ہے۔ ان ڈیلی گیٹوں کو جو لے جایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ہندوستان کی نمائندگی کریں بلکہ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد وہ پانچ یا چھ ماہ باہر کسی ممالک میں رہتے ہیں اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے محض پروپیگنڈہ نہیں کرتے بلکہ لیکچر بازی کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور سکھ متفق نہیں، ہندوستان میں مختلف مذہب ہیں، بیسیوں قسم کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ ایک غیر نمائندہ جماعت ہی نہیں بلکہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جاپان اور جرمنی کی معاون اور مددگار ہے۔ ان تمام چیزوں کی ذمہ دار برٹش گورنمنٹ ہے۔ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہم نے بڑے عرصہ تک بربادی اور تحمل سے کام ہی نہیں لیا بلکہ ہم نے اتحادیوں کی خاطر جنوبی افریقہ کی خاطر پیگنگ ایکٹ بھی برداشت کیا، ہم نے امریکہ کے بچاؤ کے لئے ایسی گولیشن لاء بھی برداشت کیا، امریکہ کی 13 کروڑ آبادی میں ہندوستانیوں کی یہ مانگ تھی کہ وہاں ہر سال 75 ہندوستانیوں کو حق شہریت دیا جائے، وہ بھی آج تک نہیں دیا گیا۔ ہماری

بہنوں نے ننگا رہنا منظور کیا لیکن کپڑا جنگ میں دیا۔ ہم بھوکے مرے لیکن آٹا اور غلہ باہر بھیجا لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ نیوزی لینڈ جیسی طاقت جس کی آبادی صرف 13 لاکھ ہے کو حق نمائندگی مل سکتا ہے، لیکن ہندوستان کی سٹینڈنگ آرمی جو جنگ میں حصہ لے رہی ہے، 25 لاکھ ہے، لیکن ہندوستان کو حق نمائندگی نہیں مل رہا۔ فرانس نے جرمنی سے مل کر انگریزوں کو ڈنکرک دکھلایا، اُس وقت انگریز کہتے تھے کہ یہ ہماری بغل میں خنجر مارا ہے لیکن آج اسی فرانس کو حق نمائندگی ملتا ہے لیکن ہندوستان کو حق نمائندگی نہیں ملتا۔ نمائندگی کا حق صرف ایمری کو ہے یا چرچل کو، میں تو یہ کہتا ہوں کہ آج دو ڈیلی گیٹ سان فرانسسکو جا رہے ہیں، اُن کے ووٹ لارڈ ہیلی فیکس کی جیب میں ہوں گے یا ایمری کی جیب میں۔ وہ ہمارے نمائندے نہیں ہیں۔

سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے رائے بہادر صاحب نے کہا کہ آپ لوگ اِن چیزوں میں نہ آئیں کہ لبرل ہمارے دوست ہیں یا لیبر ہمارے دوست ہیں۔ اس وقت انگلستان میں آل پارٹی گورنمنٹ ہے۔ اِن تمام جماعتوں کے نمائندے ایمری صاحب ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو ہماری وزارت بنی ہے، یہ ایک لوکل چیز ہے۔ اِسکا ہندوستان سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ اس سرحدی اہابیل سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان میں گرم موسم آ رہا ہے۔ دو تین سال ہوئے کہ ایمری نے کانگریس کو اِس بات کے لئے مجرم گردانا کہ کانگریس محض ایک ہندو جماعت ہے اور مسلمانوں کا اِس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ نے دوسروں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کی خاطر الٰہ بخش کو سندھ وزارت سے نکالا اور غلام حسین ہدایت اللہ کو جگہ دی۔ بنگال میں فضل حق کو نکال کر اُس کی جگہ سر ناظم الدین کو دی۔ پنجاب میں سر سکندر حیات نے اعلان کر دیا کہ میں مسلم لیگ کا حامی ہوں۔ ہمارے صوبے میں 93 فیصدی مسلمان ہیں، ایک مسلم لیگی وزارت کا ڈھونگ رچایا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آج آپ یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک اس صوبے کا تعلق ہے، حالات مختلف ہیں۔ اور کانگریس کی جو وزارت بنی ہے، یہ محض لوکل چیز ہے۔ اِس صوبے میں کانگریس کی وزارت جو بنائی گئی۔ ایمری کا جواب تھا صوبہ سرحد غیور پٹھانوں کا صوبہ ہے، یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے کہ مسلمان پٹھان ہیں بلکہ اس صوبے کا ہر ایک باشندہ خواہ وہ ہندو ہے یا مسلمان ہے یا سکھ ہے کہ عیسائی، سب پٹھان ہیں۔ اس صوبے کے پٹھانوں نے ایمری کے چیلنج کو منظور کیا اور وزارت بنائی۔ جہاں تک اِس صوبے کا تعلق ہے، اِس صوبے کی

ہماری اکثریت کانگریس کے ساتھ ہے اور کانگریس کے جھنڈے کے نیچے ہے۔ دوسری چیز ابابیل کے متعلق ہے، ہم نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور وہ یہی ہے کہ جو وزارت بنی ہے۔ جب وزارت بنانے کا سوال آیا تو ڈاکٹر خان صاحب وزیر بننا تو درکنار، وزارت بنانے کے حق میں نہ تھے۔ یہی حالت باقی کے تین وزراء صاحبان کی تھی، لیکن ڈاکٹر خان صاحب کانگریس کے وفادار ہیں اور ڈسپلن کے ضابطے کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ جہاں تک کانگریس پارلیمنٹری کا تعلق ہے، اُس کے ہر ایک ممبر کی سپرٹ انقلابی ہے، ہماری ذہنیت ریولیوشنری ہے۔ ہم اس سرحدی ابابیل کو دیکھیں گے، اگر اِس سرحدی ابابیل نے ہندوستان میں ثمر نہ بنایا تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وزارتی کرسیوں پر بیٹھنا تو درکنار ممبری سے بھی ہم استعفیٰ دے دیں گے اور اگر ہمارے مطالبات پورے نہ ہوئے تو آئندہ ممبری کے لئے بھی کھڑے نہ ہوں گے۔ اِس ایمری کی غلط فہمی کو دُور کرتے ہوئے یقین دلاتا ہوں کہ ہم دیکھیں گے، آزمائیں گے، اگر ہماری دوستی کا ہاتھ جو بڑھایا ہے، مضبوطی سے پکڑا نہ گیا تو آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ٹھکرا دیں گے۔ میں گورنمنٹ کو کہتا ہوں کہ آپ نے خود بھی دھوکہ کھایا اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیا، سر فیروز خان اور سر راما سوامی مدلیار ہندوستان کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کو حق ہے تو وہ ہیں ہمارے لیڈر جو جیل میں بند پڑے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔

☆☆☆

# جناح کی لیڈرشپ غلط ہے تو اُسے ہٹائیں، صحیح ہے تو اُسے اپنائیں

## شیخ عبداللہ کی تقریر

شیخ محمد عبداللہ لیڈر کشمیر راماست نے رائے بہادر صاحب کے ریزولیوشن کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کے سامنے صرف کشمیر کی نمائندگی نہیں کر رہا بلکہ ہندوستان کی 580 ریاستوں کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ ہندوستان کو انگریزوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے، ایک

ریاستی ہندوستان اور دوسرا برٹش ہندوستان۔ ریاستی ہندوستان میں 10 کروڑ ہندو، مسلمان و سکھ بستے ہیں، اُن پر غلامی کا بوجھ نہیں بلکہ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پیسے جا رہے ہیں۔ میں یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا کہ جن وجوہات کی بناء پر ہندوستان کے دس کروڑ انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اُن وجوہات کو آپ کس حد تک دُور کرنے کے لئے کوشش فرما رہے ہیں، جہاں تک آل انڈیا کانگریس کا تعلق ہے، مہاتما گاندھی جی یا کانگریس، یہ کہتی ہے کہ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی قسمت آپ بنائیں۔ ہم براہِ راست ریاستوں کے معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتے اور جہاں تک آل انڈیا مسلم لیگ کا تعلق ہے وہ اور محمد علی جناح بھی اعلان کرتے آئے ہیں کہ ریاستوں کی دنیا ریاستوں کے لوگوں کا معاملہ ہے، ہم اُن کے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ریاستوں کے 10 کروڑ انسانوں کی بے اعتنائی ہندوستان کے معاملات سے نہیں ہے، وہ ہندوستان کی غلامی اپنی غلامی سمجھتے ہیں۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے کہا کہ اگر ہندوستان پر سر فیروز خان نون اور سر راما سوامی مدلیار یا اور اس قماش کے آدمی، نمائندے ٹھونسے جا رہے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے نمائندے نہیں ہو سکتے، وہ ہمارے ووٹ پر نہیں گئے، کانفرنس کے متعلق آپ نے کہا کہ ہندوستان کے تمام لوگوں کی نگاہیں اس کانفرنس اور اس کے عملی پروگرام پر لگی ہوئی ہیں، میں بھی اس خیال سے اس کانفرنس میں آیا ہوں، ہندوستان کی آزادی امریکہ یا انگریز کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ آپ کی نگاہیں جو ایمری اور ویول کی طرف اُٹھتی ہیں، غلط ہے، آپ کی نگاہیں اپنوں کی طرف اُٹھتی ہیں، یہ غلط ہے۔ وائیٹ ہال سے جو نعمت آئے گی، اس میں غلامی ہی غلامی ہوگی، آزادی نہیں ہوگی، ہندوستان 1920ء سے مسلسل قربانیاں دے رہا ہے۔ لیکن ہم بجائے ترقی کے تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے، ہندو اپنے آپ کو ہندو، مسلمان اپنے آپ کو مسلمان اور سکھ اپنے آپ کو سکھ سمجھتے ہیں، ہر فرقہ اپنے لئے علیحدہ قربانی دینا چاہتا ہے اور کانگریس تینوں گروہوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج فرنٹیر اس ڈیڈ لاک کی طرف متوجہ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کبھی ہندو مسلم ڈیڈ لاک کا فیصلہ ہو سکتا ہے تو فرنٹیر کو اس میں ایک اہم پارٹ ادا کرنا پڑے گا اگر فرنٹیر کے مسلمان یہ سمجھیں کہ ہم صرف فرنٹیر تک محدود رہیں گے تو وہ 40 کروڑ انسانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ فرنٹیر کا مسلمان اور فرنٹیر کا ہندو بڑے عرصہ کے بعد اکٹھے ملا!

ہے، وہ اِس بات میں رہنمائی کریں تا کہ سب مصیبت دُور ہوں۔ ہندوستان کی آزادی کے راستے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کی بدگمانیاں ہیں۔ اِس لئے جب تک ہم بدگمانیوں کو دُور نہیں کریں گے، آزاد نہیں ہو سکتے۔

سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ محمد علی جناح کی لیڈر شپ غلط ہے، میں کشمیر میں اُن سے ملا ہوں، میں اُن کے خیالات سے واقف ہوں، میں جانتا ہوں کہ لیڈر شپ اور قائداعظم بننے کے لئے جو خصوصیتیں ہونی چاہئیں، وہ اُن میں نہیں ہیں، لیکن پھر بھی اکثر مسلمانوں کا اعتقاد بڑھ رہا ہے۔ مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کو پولیٹیکل مسلمان سمجھتے ہیں۔ میری نگاہوں میں ڈاکٹر سید محمود اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قدر و قیمت ہے بلکہ 10 کروڑ مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کے علم و ادب کے اور ڈاکٹر سید محمود کے علم و فضل کے سامنے سر جھکاتے ہیں، خان عبدالغفار خان کو حقیقی معنوں میں مجاہد سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر سید محمود ہم کو صحیح سناتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان انہیں مذہبی مسلمان نہیں سمجھتے، پولیٹیکل مسلمان یہ سمجھتے ہیں مسلمان اندھا نہیں ہے لیکن وہ اِس کے باوجود جناح کے پیچھے لگا ہوا ہے جو کہ اُن کا نہ علم و فضل میں مقابلہ کر سکتا ہے نہ قربانی کا مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن پھر بھی جب محمد علی جناح آواز اُٹھاتا ہے، کروڑوں مسلمانوں کی نگاہیں اُن کی طرف اُٹھتی ہیں، جب تک یہ باتیں آپ نہیں سوچیں گے، کامیابی مشکل ہے۔ اگر جناح کی لیڈر شپ غلط ہے تو اِس کو ہٹائیں، اگر صحیح ہے تو اِس کو اچھا کہیں، میں تو ڈنکے کی چوٹ پر کہنا چاہتا ہوں اور ہمیں کہنا چاہیے، غلط ہے، یا صحیح ہے لیکن ہمارے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی نے آپ کے سامنے دو اصول رکھے ہیں، اہنسا اور سچائی۔ وہ آپ سے اور ہر ایک کانگریس کے والنٹیر سے مطالبہ کرتا ہے کہ جو کچھ کہو، سچائی سے کہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان فطرتاً کمزور واقع ہوا ہے، اِس لئے میں اگر سچائی کا اظہار کروں گا تو ممکن ہے بدگمانیاں پیدا ہوں۔ اگر میں سچ باتیں نہ کہوں اور آپ کی کمزوریوں کو آپ کے سامنے نہ رکھوں تو گاندھی جی سے غداری کروں گا۔ ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور مذہب کے نام پر سب مسلمانوں کو کھینچتا ہے۔ جو کانگریسی مسلمان ہے، اگر اُس میں سچائی ہے تو اُنہیں مسلمانوں کی زبان بننا چاہیے۔ کانگریس ایک نیشنل آرگنائزیشن ہے، کوئی فرشتوں کی آرگنائزیشن نہیں کہ غلطیاں نہ ہوتی ہوں، اِس لئے دیکھنا چاہیے کہ کانگریس نے کونسی غلطیاں کی ہیں۔ یہ چیز تسلیم کرتے ہوئے کہ محمد علی جناح کا نعرہ غلط ہے کہ

ہندوستان میں ایک قوم نہیں، دو قومیں ہیں، لیکن پھر بھی وہ مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔
میں اس طرف آپ کی توجہ کرانا چاہتا ہوں، آپ گاندھی جی کے بھگت بنتے ہیں، آپ یہ کہتے ہیں کہ گاندھی جی کی آواز ہماری آواز ہے، آپ اُن کے حکم پر جان دینے کے لئے تیار ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو کچھ آپ کہتے ہیں، غلط ہے۔ گاندھی جی نے ایک بار نہیں بلکہ لاکھ بار کہا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی غلطی چھوت چھات ہے۔ مدراس میں جا کر دیکھیں۔ کنویں پر ایک کتے کو پانی پلا سکتے ہیں، لیکن ایک پیاسا ہریجن جب کنویں پر جاتا ہے تو لاٹھیوں سے اُس کا سواگت کیا جاتا ہے، ایک قوم کی تھیوری پیش کرنے والے اِس ہریجن سے پوچھیں کہ وہ ہندوستان کو ایک قوم سمجھتا ہے یا دوسری قومیں بھی۔ مندر میں جائیے تو وہاں سے دھکے دے کر نکالتے ہیں۔ اگر آپ سچ کہتے ہیں کہ گاندھی جی کی آواز آپ کی آواز ہے تو ان خامیوں کو دُور کرو۔
کیا آپ نے اِس پر عمل کیا، ہاں یہی کہ گاندھی جی کا سواگت جوتوں اور بلیک فلیگ سے کیا۔
آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کی غلامی کا سبب ایری یا انگریز قوم نہیں، بلکہ ہمارے اپنے محبوب ہیں۔ باوجود کوششوں کے ہم مسلمانوں کو جناح کے راستے سے ہٹا نہیں سکتے۔ ہمیں دیانت داری سے دیکھنا چاہیے کہ جناح جہاں جہاں ہماری قوم کو غلط راستے پر لے جا رہے ہیں، وہاں ہم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ یہ غلط ہے اور جہاں جہاں جناح ٹھیک کہتا ہے، ہمیں گاندھی جی سے کہنا چاہیے کہ جناح ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم نے اس کے مقابلے میں کوئی پازیٹو پروگرام مسلمانوں کے سامنے نہیں رکھا۔ میں بحیثیت ایک غیر جانب دار انسان کے بول رہا ہوں، میں نے ہر جماعت کے لیڈر سے ملنے اور حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر سید محمود، مولانا ابوالکلام آزاد اور ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مسلمان غلط رہنما کے پیچھے نہ لگیں۔ جناح حقیقتاً غلط لیڈر ہے۔ وہ باتیں بنانا اور روڑے اٹکانا جانتا ہے، لیکن عملی میدان میں آنا نہیں چاہتا، اس لئے ایسے شخص کے ہاتھ میں 10 کروڑ مسلمانوں کی باگ دوڑ دے دینا اور اس پر خاموش رہنا نہ صرف مسلمانوں پر ظلم ہے بلکہ 40 کروڑ انسانوں کے ساتھ بھی۔ آپ عالم و فاضل ہیں، قربانی دینے والے ہیں، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی زبان کیوں بند ہے، آپ مسلمانوں کو کیوں نہیں کہتے کہ جناح جو کچھ کہتا ہے، کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اگر ہندو ڈومی نیٹ کرے گا تو ہماری خیر نہیں، ہندو سمجھتا ہے کہ مسلمانوں سے ہماری خیر نہیں۔ مسلمان سمجھتا ہے کہ

ہندوستان 35 فیصدی ہوں 75 فیصدی کے مقابلہ میں کیا کرسکتا ہے، اس کی تائید ایک اور جماعت کررہی ہے۔ اس کے لیڈر مونجے اور ساورکر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اگر رہنا ہے تو ہمارے ماتحت ہوکر رہے، اگر نہیں رہنا ہے تو عربستان میں جاکر رہے۔ ایسے الفاظوں سے وہ اور تیزی پیدا کررہے ہیں۔ جناح صاحب کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں ہی زندگی بسر کرسکتے ہیں کہ ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد ہوتا کہ علیحدہ رہ کر ترقی کرسکیں، میں نے ذاتی طور پر ملاقات کی اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پاکستان عملاً غلط ہے۔ جس پاکستان کا نقشہ جناح صاحب پیش کررہے ہیں، وہ ہندوستان کو آزاد کرنے میں ممد نہیں ہوگا، بلکہ غلام رکھنے میں ممد ہوگا۔ دو بھائی آپس میں لڑتے رہیں گے، اور تیسرا باہر کا یہاں رہ کر ہم پر حکومت کرے گا مگر موجودہ پاکستان غلط ہے تو مجھے بتاؤ پھر اور کس طرح ہمارے خطرات دُور ہوسکتے ہیں۔ اب 1942ء کے حالات نہیں رہے۔ یاد رہے کہ ہمیں اِس طرف متوجہ ہونا چاہیے کیوں کہ ایسے فارمولے ہیں کہ جن کو مسلمان سمجھے اور کہے کہ ہندوستان کی آزادی میری آزادی ہے، ہندو اور سکھ بھی یہ سمجھے کہ ہندوستان کی آزادی میری آزادی ہے۔ وہ پروگرام ہمارے سامنے رکھنا چاہیے تاکہ ہم جناح کا مقابلہ کرسکیں۔ جب تک پازیٹو پروگرام ہمارے سامنے نہ ہو، جناح کا بنایا ہوا خدشات کا محل گرا نہیں سکتے۔ اِن الفاظ کے ساتھ میں اس ریزولیوشن کی تائید کرتا ہوں کہ مدلیار اور نون ہمارے نمائندے نہیں ہیں۔

اگر سچائی کوئی قیمت رکھتی ہے تو ایمری اور چرچل سے پوچھو کہ کیا یہ ہندوستان کے نمائندے ہیں؟ تو وہ کہیں گے کہ نہیں، اگر آزادی چاہتے ہو تو اتحاد کرو۔ وہ اتحاد آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے، بندوق ہے، بم ہے۔ اِس سے آپ برٹش امپیریلزم کو ختم کریں۔ اگر ایسا نہ کیا تو مشکل ہے کہ آپ ہندوستان کو آزاد کراسکیں۔

## ڈاکٹر صاحب کی اختتامی تقریر

اِس کے بعد صدر ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اختتامی تقریر کی جس میں آپ نے فرمایا کہ شیخ محمد عبداللہ کی تقریر کو میں اہم سمجھتا ہوں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ طرح طرح کے گاندھی جی پر اعتراضات ہو رہے ہیں کہ سرحد میں وزارت بنانے کی کیوں اجازت دی ہے۔ سب سے بڑا الزام جو مسلمانوں پر گذشتہ تین برسوں میں لگایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی نہیں چاہتے۔ جلوے

مانڈے اور زندگی کا اتنا شوق لگا ہے کہ وہ آزادی کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو دکھلانا چاہا کہ وہ نہ صرف ہندوؤں کے دوش بدوش چلنا چاہتے ہیں بلکہ وہ آزادی کے لئے بے چین ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کو پریس کے ذریعے اُن کی آزادی کے لئے بے تابی بتلانا چاہتا ہوں، دو نوابوں کی تقریریں ہوئیں، اُن سے پتہ چلا ہوگا کہ یہاں کے سرمایہ دار بھی آزادی کے کتنے خواہش مند ہیں۔ یہ الزام مسلمانوں پر ایک مذہبی اور قومی الزام تھا۔ ہر خیال کے مسلمان جن کو ہندوؤں سے خوف بھی ہے، آزادی کے لیے بے چین ہیں۔ شیخ عبداللہ نے کھری کھری باتیں کہیں۔ خاص کر کانگریسی مسلمانوں سے کہ ہم مسٹر جناح کی لیڈری کے خلاف کیوں زور سے آواز بلند نہیں کرتے؟ اتنا کہوں گا کہ ہم لوگ اِس کا جواب تو دیتے رہے لیکن کانگریس نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں کو یہ گمان ہو کہ کانگریس مسلمانوں کو تقسیم کرنا چاہتی ہے۔ گاندھی جی نے بار بار کہا غلط ہو یا صحیح، لیکن یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے ہندوؤں پر یہ بداعتادی ہوگئی ہے اور اُن کو خوف ہے۔ اِس شبہ کو دُور کرنے کے لئے انہوں نے ذمہ داری لی۔ ہندوستان جیسے ملک میں ایک مضبوط مرکز کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی جیسا لیڈر کوئی ملک پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے سر اُن کے پاؤں پر گراتے ہیں لیکن اُن پر عمل نہیں کرتے۔ گاندھی جی کا درشن کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اُن کے کہنے پر عمل کرنا اہم ہے۔

1942ء میں کانگریس نے اتحاد کرنے کی کیا کیا کوششیں کیں۔ پاکستان کے اصول کو ورکنگ کمیٹی نے مان لیا تھا، کانگریس کے صدر کو نہایت توہین آمیز جواب دیا گیا، لیکن کسی قسم کا اقدام کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ مسلمانوں کے شبہ کو مٹانے کے لئے صرف اُصول کو نہیں مانا بلکہ انہوں نے ایک اسکیم بھی مسٹر جناح کے پاس پیش کی۔ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جناح سے گاندھی جی کی ملاقات کے بعد مسلمانوں کے دماغوں کی کنجیاں کھل گئی ہیں۔ مسلمان سمجھوتہ کے لئے بے تاب اور بے چین ہیں۔ گاندھی جی نے گذشتہ چار پانچ ماہ میں بھی صلح کی بے حد کوششیں کیں کہ گتھی سلجھ جائے۔ لیکن مسٹر جناح معلوم نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ ہم لوگ کب تک برداشت کریں گے۔ جتنے مسلم ادارے نیشنلسٹ ہیں، انہوں نے صبر وتحمل کے ساتھ اِس لئے برداشت کیا کہ آزادی کے بعد بھی ملک کو چلانا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں سے وہ خوف مٹے جس کو مٹانے کی ضرورت تھی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا، اگر یہی حالت رہی تو نیشنلسٹ مسلمان آگے بڑھیں گے۔ مسلم لیگ میں بڑے بڑے لوگ بے چین ہیں لیکن مسٹر جناح

کے دل پر کوئی اثر نہیں، معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ وقت بتلائے گا کہ جناح کی پالیسی ٹھیک تھی یا کانگریسی مسلمانوں کی۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بھائی چارے سے رہنا ہی بہتر ہے، ہندو اتنے احمق نہیں ہوں گے کہ وہ مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کریں گے، اگر ہندوستان میں ایسی بے وقوفیاں بھی آ جائیں تو مسلمان بڑی تعداد میں ہیں، غیرت والے ہیں، مقابلہ کریں گے، عزت کے ساتھ مرنا باعث فخر ہے۔ بجائے اس کے کہ بیماری سے چارپائیوں پر رگڑ رگڑ کر جان دے دیں۔ 10 کروڑ اتنا ڈرتے ہیں کہ اُن کو حلوہ بنا کر کھا جائیں گے، لیکن پتھر ہضم نہیں ہو سکتے۔ ہم کو اُن کی نیک نیتی پر اعتماد ہے اور ہمیں اپنے پر بھی اعتماد ہے۔ اس لئے اگر ہم اُن کو کھا بھی جائیں تو ہم ہضم نہیں کر سکیں گے۔ اگر مسلمانوں کے فائدے کی چیز پاکستان ہے تو وہ ضرور ہونا چاہیے۔ مہاتما گاندھی بھی کہتے ہیں لیکن کیا واقعی مسلمانوں کے لئے یہ چیز مفید چیز ہے؟ ہر لحاظ سے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ آہنی دیوار مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ہے تو ضرور بن جائے لیکن مجھ پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ مسلمانوں کے لئے یہ مفید چیز ہو سکے گی۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ کانگریس کے ذمہ دار مسلمانوں کا ایک لفظ بھی مسلم لیگ کی شان میں نکلے تو ہماری زبان کاٹ لیں۔ ہندوؤں کے پاس اتنا روپیہ بھی نہیں ہے جس سے وہ خان عبدالغفار خان، مولانا ابوالکلام آزاد یا مجھے خرید سکیں۔ اگر کوئی دوسرا ادارہ آزادی کے لئے ہے تو ہم اس میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ ہماری بدولت سب ممالک کے مسلمان پریشان ہیں۔ ہم ممبریاں یا حقوق نہیں چاہتے، ہم مذہبی طور پر مسلمان ہیں۔ اگر آپ اکثریت کی "گڈ ول" نہیں رکھتے تو کیا آپ سب کچھ سنبھال سکیں گے؟

تقریر کو ختم کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ایمری کے متعلق کہتا ہوں کہ یہ مسلم صوبہ کسی ہندو صوبے سے پیچھے نہیں، بلکہ یہ آگے آگے جاتا ہے کہ ملک کو آزادی دلائے۔ شیخ صاحب کی تقریر پر ہم مل کر غور کریں گے۔ یہ ہندوستان کا چمکتا ہوا تارہ ہی نہیں ہوگا بلکہ مہتاب ہوگا۔ آپ نے پریس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد خاکساروں نے باوردی صدر صاحب ڈاکٹر سید محمود کو سلامی دی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی طرف سے صدر صاحب و دیگر اصحاب جو باہر سے تشریف لائے تھے، شکریہ ادا کیا گیا۔ اُن کے علاوہ جرنیل رحمت داس کی پارٹی کا شکریہ ادا کیا گیا اور اُن کو طلائی تمغہ دیا گیا۔ میونسپل کمیٹی پشاور کے سیکرٹری خان صاحب محمد یونس خان، بجلی کے کارکنان، دروازے بنانے والوں، خدائی خدمت گاروں اور اُن کے سالاروں، ڈرامہ کے کارکنان، چندہ دہندگان،

خاکساروں ولنگر کے منتظم کا شکریہ ادا کیا گیا۔ ٹھیک 2 بجے آخری کانفرنس کی کارروائی ختم ہوئی۔

☆☆☆

# یادگارِ شہداء پر پھولوں کی بارش

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

تین بجے کے قریب افغان نگر سے ایک عظیم الشان جلوس مرتب ہوا جس میں دو ہزار سے زیادہ باوردی خدائی خدمت گاروں نے شرکت کی۔ خدائی خدمت گاروں کی سُرخ فوج ''ڈھولک اور سُرنا'' کے ساتھ اس طرح جوش وخروش سے مارچ کر رہی تھی جس سے معلوم ہوا کہ سوویت روس کے سرفروش سپاہی برلن کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ جلوس کے ساتھ ہزاروں انسان ننگے سر شامل ہوئے۔ حریت پسند نوجوانوں کا یہ جم غفیر تیز رفتاری سے اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں جذبہ حب الوطنی کے نشے میں سرشار نوجوان شمشیر فرنگ سے کٹ کٹ کر شہید ہوئے، جہاں سربکف نوجوانوں نے اپنے شباب کی رعنائیاں قربان گاہ حریت پر نچھاور کردیں۔ معصوم بچوں نے گورا فوج کے پاؤں تلے دب دب کر رتبہ شہادت حاصل کیا اور بوڑھوں نے مسکراتے ہوئے انگریزی استبدادیت کا مقابلہ کیا، مردانہ وار لاٹھیاں کھائیں، آرمرڈ کاروں کے نیچے روندے گئے، زہریلی سنگینوں سے شہید ہوئے۔ جب یہ جلوس یادگار شہداء پر پہنچا تو کانگریس، سوشلسٹ، اور کمیونسٹ رہنماؤں نے عقیدت کے پھول چڑھائے، ڈاکٹر سید محمود، فخر افغان ڈاکٹر خان صاحب، اور شیخ عبداللہ نے شہیدوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ بعدازاں پبلک کی طرف سے یادگار شہداء پر پھولوں کی بارش ہوئی۔

اندازہ ہے کہ اتنا عظیم جلوس صوبہ سرحد میں آج تک نہیں نکلا۔ مختلف رپورٹروں کا خیال ہے۔ اس جلوس میں 24 ہزار کے قریب آدمی تھے۔

جلوس سے فارغ ہوکر رہنماؤں کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

دستاویز(2)

# لہو سے شرابور زمین

شیام لال لائلپوری

## قصہ خوانی بازار پشاور

''سرحد کے پٹھانوں کو شکایت ہے کہ ہم نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔ محبانِ وطن کے ساتھ شانہ بشانہ سرزمینِ ہند کو اپنے خون سے سینچا اور قید و بند کے مصائب جھیلے مگر ہندوستانی رہنما آزادی وطن کے وقت ملک کا بٹوارہ کر کے ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کر گئے۔''

شمال مغربی سرحدی صوبہ واحد صوبہ تھا جہاں مسلمانوں کی خالص اکثریت تھی۔ اس صوبہ کو تشکیل دیتے ہوئے برطانوی سامراج کا خیال تھا کہ یہاں کے پٹھان مسلمان پنجاب کے سرحدی اضلاع کیمل پور، راولپنڈی اور میانوالی کے مسلمانوں کی طرح ہمیشہ انگریزی مقاصد کے کام آئیں گے یعنی انگریزوں کے اشاروں پر ناچا کریں گے۔ یہ صوبہ انگریزوں کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط کرنے میں مددگار ہوگا۔ مگر انگریزوں کا خیال درست نہ نکلا بلکہ اس کے برعکس خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی کی قیادت میں ہندوستان کی آزادی کے راگ الاپنے لگا۔ سرحدی گاندھی نے ضلع، تحصیل اور ہر گاؤں کا دورہ کر کے نہ صرف مضبوط تنظیم کھڑی کی بلکہ درسِ آزادی دے کر بغاوت کے جذبات بیدار کر دیئے۔ انگریزوں کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لئے صوبہ سرحد کے تمام فرد و بشر تڑپنے لگے۔

# ہندوستان میں 1930ء کی جنگ آزادی

راوی کے کنارے، مکمل آزادی کی تجویز پاس کرنے کے بعد گاندھی جی نے 1930ء میں سارے ملک میں ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ ایسے وقت میں صوبہ سرحد کے عوام پیچھے نہ رہ سکتے تھے۔ سادہ لوح پٹھان جو فطرتاً بندوق اور پستول کے پجاری تھے۔ سب نے عدم تشدد کا عہد لے لیا اور نہتے ہو کر ہندوستان گیر ستیہ گرہ میں شامل ہو گئے۔ سارے ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے تلے لوگ گرفتار ہو رہے تھے۔ لاٹھیوں اور گولیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ صوبہ سرحد کے عوام بھی سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کی زیر قیادت اِس عدم تشدد کی جنگ میں بحیثیت خدائی خدمت گار کے پیش پیش تھے۔ ویسے صوبہ سرحد کے آزاد علاقے میں رہنے والے تو ہمیشہ انگریزی مظالم کا شکار رہتے تھے، جب جی چاہا انگریز اُن پر بموں کی بارش کر دیتے تھے، کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کے انگریز فوج اُن کے آزاد علاقہ میں داخل ہو جاتی تھی، گولی و بندوق کے سہارے قبضہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر آزاد قبائلی اپنی جان پر کھیلنا جانتے تھے، اِسی لئے انگریز ہمیشہ ناکام رہے۔

تحریک کو دبانے کے لئے پشاور کے کچھ قوم پرست نوجوانوں کو گرفتار کر کے گھسیٹنا شروع کر دیا اور انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی جس سے شہر کے عوام جوش میں آ گئے اور اُن گرفتار شدہ نوجوانوں کے پیچھے بھیڑ اکٹھی ہونی شروع ہو گئی تھی، تھانہ کابلی دروازہ تک پہنچتے پہنچتے لوگ بڑی تعداد میں اکٹھے ہو گئے، اور فضا انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد، انگریز سامراج مردہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھی، پولیس نے مجمع کو منتشر کرنے کی کوشش کی تو معاملہ کو بے قابو پایا تو پولیس اور اُس کے افسران گھبرا گئے، اب اُنہیں حالات کی نزاکت کا احساس ہوا تو پھر فوج کو بلایا گیا۔

فوج کا دستہ گڑھوالی تھا اور فوجی دستور جانتا تھا۔ قصہ خوانی بازار میں آ کھڑا ہوا۔ فوج کے آنے سے حالات اور فضا میں تناؤ آ گیا۔ عوام غم اور غصہ سے پاگل ہو رہے تھے، نہتے تھے اور اُنہیں بے گناہی کا احساس بھی تھا۔ گڑھوالی فوج کو اُن کے انگریز افسر نے آگے بڑھ کر نہتے عوام پر گولیاں چلانے کا حکم دیا لیکن ساری پلٹن ٹس سے مس نہ ہوئی اور اُن میں سے محب وطن شری چندر سنگھ حوالدار آگے بڑھے اور اپنے افسر سے مخاطب ہوئے کہ ہم فوجی ہیں اور ہتھیار بند ہیں، ہمیں

کسی فوج سے جو ہتھیاروں سے لیس ہو سے لڑنے کا حکم دیں۔ ہم نہتے اور پُر امن بے گناہ محبانِ وطن پر گولیاں نہیں چلائیں گے۔ اُسی وقت گورا پلٹن بلائی گئی جس نے پہلی گڑھوالی پلٹن سے ہتھیار رکھوا لئے اور انہیں گرفتار کر کے واپس چھاؤنی کی بیرکوں میں بھیج دیا۔ بعد میں اُن کا کورٹ مارشل کیا گیا جس میں انہیں عمر قید کی سزا ہوئیں اور مختلف جیلوں میں قیدیں کاٹتے رہے۔ اس کے بعد گوروں کی بندوقوں کے منہ عوام کی طرف اُٹھ گئے اور وہ آگ اُگلنے لگیں، گولیاں سینوں میں پیوست ہوئیں، خون کے فوارے چلتے، لاشیں تڑپتیں، اور ٹھنڈی ہو جاتیں، غیور، حریت پسند پٹھان اُچھل کر اپنی چھاتیاں کھول کر بندوقوں کے سامنے آتے اور مادرِ وطن کی آزادی کی خاطر جامِ شہادت نوش کرتے۔

قصہ خوانی بازار خون سے شرابور ہو گیا، لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، سارے ملک میں یہ خبر پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا دیش ماتم کدہ بن گیا ہو۔

آج قصہ خوانی بازار پشاور بازار میں نہیں ہے لیکن آزاد ہندوستان انہیں کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ آج آدھی صدی کے بعد سارا ہندوستان اُنہیں سر جھکا کر اپنی شردھانجلی اور عقیدت پیش کرتا ہے۔
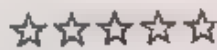
# قصہ خوانی فائرنگ کے شہداء

اویس قرنی رودلوی

1- عبدالاحد ولد محمد ساکن، پشاور ستیہ گروہ میں شامل ہوئے۔1930ء میں پشاور کی پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔
2- عبدالغفار ولد قاسم خان، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں شریک تھے۔1930ء میں پولیس کی گولی سے پشاور میں مارے گئے۔
3- عبدالجلیل ولد یاور خان، سول نافرمانی میں شریک تھے۔1930ء میں پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کردی۔پولیس کی گولی سے مارے گئے۔
4- عبدالرسول ولد قربان حسین، 1910ء میں شوالا پور مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔کارخانہ میں مزدور تھے،قومی تحریک میں حصہ لیا۔1930ء میں پولیس تھانہ شوالا پور پر حملے میں 8 مئی 1930ء میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔بلوہ اور قتل کا مقدمہ چلا۔سزائے موت ہوئی۔یروہ جیل پونہ میں 12 جنوری 1931ء کو پھانسی ہوئی۔
5- عبداللہ ولد سعد اللہ، پشاور میں پیدا ہوئے۔قومی تحریک میں حصہ لیا۔پشاور میں 1930ء میں پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔
6- آغا خان ولد ظریف خان، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔1930ء میں پشاور میں پولیس فائرنگ میں مارے گئے۔
7- آغا محمد ولد محمد بخش، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔پشاور میں 1930ء

میں پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

8- آغا محمد عرف تلنگا ولد ممناری، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہوئے۔ 1930ء میں پولیس فائرنگ میں مارے گئے۔

9- اکرام خان ولد غفور خان، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی تحریک میں شریک ہو گئے۔ 1930ء میں پولیس فائرنگ میں مارے گئے۔

10- چوہدری عبداللہ ولد محمد دین، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شامل تھے۔ پولیس فائرنگ پشاور، 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

11- دلیل ولد جہانگیر، 1902ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پولیس فائرنگ پشاور میں 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

12- داؤد گل، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہو گئے۔ پشاور کے مظاہرے میں شامل تھے۔ پولیس فائرنگ سے 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

13- دلاور، پشاور میں پیدا ہوئے۔ 1930ء میں سول نافرمانی میں شریک ہو گئے۔ پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

14- فقیر محمد، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

15- فضل دین ولد محمد بخش، ہزارہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہو گئے۔ پشاور 1930ء میں فائرنگ میں مارے گئے۔

16- فضل محمد ولد نور محمد، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہو گئے۔ پشاور 1930ء میں پولیس کی فائرنگ میں مارے گئے۔

17- فضل الرحمان ولد سلطان، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہو گئے۔ پولیس کی فائرنگ سے 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

18- غفار خان، جھنوال ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

19- غلام حسین ولد میاں خان، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پولیس

فائرنگ 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

20- غلام محمد، پشاور میں 1874ء میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہوئے۔ پولیس کی فائرنگ سے بمقام پشاور 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

21- گل محمد ولد میاں جانی، قومی تحریک میں شامل ہوگئے۔ سول نافرمانی 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

22- گل رحمان ولد شیر دل، سول نافرمانی میں شریک ہوگئے۔ پشاور پولیس کی فائرنگ سے 1930ء میں مارے گئے۔

23- حاجی، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شامل ہوئے۔ پولیس فائرنگ سے 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

24- حسینی ولد قاسم، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہوئے۔ 1930ء میں پشاور میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

25- حسین احمد قربان، ساکن شوالا پور مہاراشٹر سول نافرمانی میں 1930ء میں شامل ہوگئے۔ ستیہ گروہ منظم کیا تھا کہ پولیس سے جھڑپ ہوگئی تھی۔ مجمع بے قابو ہوگیا۔ لوٹ مار شروع ہوگئی۔ گرفتار ہوئے۔ سزائے موت دی گئی۔

26- لاسے ولد شیر دل، پشاور میں پیدا ہوئے۔ خلافت والنٹیر تھے۔ پشاور کی 1930ء کی فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

27- ملنگ شاہ ولد محمد شاہ، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہوگئے۔ 1930ء پشاور میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

28- مُسندا خاں، پشاور میں پیدا ہوئے۔ قومی تحریک میں شامل ہوگئے۔ 1930ء کو پشاور میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

29- جھندا خاں، پشاور میں پیدا ہوئے۔ 1930ء کی سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پشاور میں 1930ء میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

30- میاں داؤد، پشاور میں پیدا ہوئے۔ قومی تحریک میں شامل تھے۔ 1930ء کو پشاور میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

31- میاں محمد ولد نور محمد، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پشاور میں 1930ء میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

32- محمد افضال، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہو گئے۔ فائرنگ 1930ء میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

33- محمد اشرف ولد نور محمد، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک ہوئے۔ 1930ء کی پشاور فائرنگ میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

34- خان، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شامل ہو گئے۔ 1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

35- محمد اسمٰعیل ولد محمد دین، 1909ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ ہوا۔ لاٹھی چارج اور فائرنگ ہوئی۔ 1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

36- محمد دین، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شامل ہوئے۔ 1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

37- محمد سعید ولد فضل، ساکن موضع ڈیگری ضلع پشاور خلافت کارکن سول نافرمانی میں حصہ لیا۔ 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

38- محمد شاہ ولد زعون شاہ، 1900ء میں پیدا ہوئے۔ پشاور میں 1930ء کی پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

39- موسیٰ ولد رحیم گل، سول نافرمانی میں شریک ہوئے۔ 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

40- مستقیم ولد فضل، ساکن پشاور سول نافرمانی میں شریک ہوئے۔ 1930ء کی پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

41- مستقیم ولد محمد، موضع ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

42- پہلوان گل، پشاور میں پیدا ہوئے۔ سول نافرمانی میں شریک تھے۔ 1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

43- قمر گل ولد خان گل، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں شریک تھے۔1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

44- رمضان، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں شریک تھے۔1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

45- سعید بابو گنو، موضع مہنلگو ضلع پونہ مہاراشٹر میں 1908ء میں پیدا ہوئے۔مل مزدور تھے۔سول نافرمانی میں نمایاں حصہ لیا۔ستیہ گروہ میں بھی حصہ لیا۔شراب کی دکان پر دھرنا دیا، بدیسی کپڑے کی دوکان پر دھرنا دیتے تھے۔ایک ٹرک بدیسی کپڑوں سے لدی ہوئی کپڑا گودام بمبئی سے آرہی تھی،12دسمبر 1930ء کو یہ ٹرک کے سامنے لیٹ گئے۔ٹرک اِن پر چڑھا دیا گیا، اِسی جگہ کچل کر مر گئے۔اُن کے گاؤں والوں نے اُن کی یاد میں ایک اسکول کھول دیا اور اُنکا مجسمہ بھی نصب کیا۔

46- افضال شاہ، موضع نباتی ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں شرکت کی۔1930ء کی پشاور فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

47- میر غلام شاہ ولد نواب شاہ، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی 1930ء میں شرکت کی۔ 1930ء کی پشاور فائرنگ میں مارے گئے۔

48- شاہد باز، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں شریک تھے۔1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

49- شیر دل ولد کاظم، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔پشاور میں 1930ء میں آرمرڈ کار نے کچل کر مار ڈالا۔

50- سید محمد، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔1930ء کی پولیس فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

51- تیغ علی، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔فائرنگ 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

52- عمر خاں ولد گل محمد خاں، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

53- عمر خیل، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔پشاور فائرنگ 1930ء میں مارے گئے۔

54- ولی محمد، موضع ہوتی مردان ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔1930ء کی فائرنگ میں مارے گئے۔

55- ولی گے، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔1930ء کی فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

56- زیداللہ، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔پشاور1930ء کی فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

57- زیارت گل ولد سعید گل، پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں حصہ لیا۔پشاور میں 1930ء کی فائرنگ میں گولی سے مارے گئے۔

58- مستانہ، ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔سول نافرمانی میں شریک تھے۔پشاور کی فائرنگ 1930ء میں گولی سے مارے گئے۔

(اویس قرنی رودلوی کی کتاب ''مسلم جانثارانِ وطن جنہیں ہم بھول گئے'' سے اقتباس)

دستاویز (4)

# شہید شری ہری کشن

رنبیر

شری رنبیر جی، خود لاہور یونیورسٹی گورنر شوٹنگ کیس میں مجرم تھے اور شری دُرگا داس و شری چمن لال کے ساتھ اُن کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ بعد میں ہائی کورٹ نے اِن تینوں کو بے قصور مان کر بری کر دیا تھا۔ صرف شری ہری کشن کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ (اِن دنوں آپ "ملاپ" روزنامہ کے ایڈیٹر و مالک ہیں)۔

میں اپنے انقلابی جیون کی کہانی لکھوں تو وہ بہت لمبی ہو جائے گی اِس لئے اِس کا صرف وہ حصہ عرض کرتا ہوں جس کا تعلق شری ہری کرشن سے تھا۔ یہ 1930ء کی بات ہے گاندھی جی نے انگریز حکومت کے خلاف ستیہ گرہ شروع کیا تو شروع میں وہ بہت زور سے چلا۔ گاندھی جی پکڑے گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، جواہر لال نہرو جی اور ملک بھر میں ہزاروں دوسرے لوگ، سردات بھگت سنگھ، شری راج گورو، شری سکھ دیو اور اُن کے ساتھی جیل میں تھے۔ شری چندر شیکھر آزاد اور "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی" کے سبھی ممبر الگ الگ جگہوں پر چھپ کر گھومنے لگے۔ میرے جیسے لوگ کھلم کھلا پھر رہے تھے کیونکہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کا بھی "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی" سے کوئی تعلق ہے۔ میں تو شری چندر شیکھر آزاد کے حکم سے "سی آئی ڈی" میں بطور ایک مخبر کے کام بھی کرتا تھا تا کہ پتہ لے سکوں کہ لاہور کی پولیس، کہاں کیا کرتی ہے۔ کہاں کیسے بلائی جا رہی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں پولیس والوں سے پچاس روپیہ مہینہ لیتا تھا اور ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے فنڈ میں جمع کرا دیتا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پولیس کے کچھ آدمیوں کو میں اِس سے بہت زیادہ دیتا تھا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ ملاپ کے

لئے خبریں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پولیس کے کئی بڑے افسر مجھے "اپنا آدمی" سمجھنے لگے تھے۔ ایک دن میں اِس چالاکی کی وجہ سے مصیبت میں پھنسنے لگا تھا کہ بچ گیا۔ میں لاہور کے انارکلی بازار سے جا رہا تھا، سردیوں کے دن تھے۔ ایک بڑا گرم کوٹ میں نے پہن رکھا تھا۔ اُس کی جیب میں ایک بم تھا، کتنے ہی کارتوس، دوسری جیب میں دو ریوالور تھے۔ لاہور پولیس کے ایک سپرنٹنڈنٹ صاحب (جنہوں نے مجھے پولیس کا مخبر بھرتی کیا تھا) موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ وہ مجھ سے ملتے تو بغل گیر ہو کر بڑے پیار سے! ایک روز انہوں نے مجھ کو پیدل جاتے دیکھا، میں نے انہیں دیکھا تو گھبرا گیا۔ یہ سوچا کہ ابھی یہ موٹر سائیکل سے اُتریں گے۔ میرے پاس آئیں گے، بغل گیر ہوں گے اور پھر ریوالوروں کا بھید کھل جائے گا۔ انہوں نے موٹر سائیکل سے ہی مجھے آواز دی، میں نے زور سے کہا۔ "اِس وقت میں پڑھنے جا رہا ہوں۔ شام کو آپ کے دفتر میں ملوں گا" اور جلدی سے ایک چھوٹی گلی میں چلا گیا۔ وہ شاید سمجھے کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ موٹر سائیکل کو چلایا اور آگے چلے گئے۔ میں نے اُن کو جاتے دیکھا تو گھبراہٹ دور ہوئی کہ مصیبت سے بچ گیا۔

گاندھی جی کا ستیہ گرہ شروع میں بہت زور سے چلا مگر بعد میں ڈھیل آنے لگی۔ قید ہونے والے والنٹیر ملنے مشکل ہو گئے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کچھ کانگریسی معافیاں مانگ رہے ہیں۔ گاندھی جی کو بھی اِس بات کا پتہ چلا۔ انہوں نے سمجھا کہ ستیہ گرہ کو بند کرنے کا وقت آ گیا ہے لیکن بند کس طرح کریں۔ وہ تو خود جیل میں تھے۔ انہوں نے دو ماڈریٹ شری سپرو اور شری جیکر کو اپنے پاس بلایا۔ اُن سے کہا "حکومت اگر مجھے رہا کر دے تو میں جیل سے باہر جاتے ہی ستیہ گرہ کو بند کر دوں گا۔ میں ستیہ گرہ کو بہت دیر تک نہیں چلانا چاہتا۔ آپ اِس کے لئے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون سے ملئے۔" شری سپرو اور شری جیکر وائسرائے لارڈ ارون سے ملے۔ اُن سے کہا "یہ ستیہ گرہ بند ہو سکتا ہے۔ آپ گاندھی جی کو رہا کر دیجیے۔ وہ باہر آتے ہی ستیہ گرہ کو بند کرنے کا اعلان کر دیں گے"۔ لیکن جو بات سب کو معلوم تھی، گاندھی جی کو بھی معلوم تھی، اُسے لارڈ ارون بھی جانتے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "ستیہ گرہ بند ہو جائے، یہ میں بھی چاہتا ہوں لیکن گاندھی جی جیل کے اندر بھی تو ستیہ گرہ کو بند کرنے کا اعلان کر سکتے ہیں۔ ہم اُن کے اعلان کو بہت اچھی طرح نشر کریں گے۔ اِس کے بعد اُن کو رہا کر دیں گے۔ دوسرے قیدیوں کے متعلق بھی غور کریں گے۔" شری سپرو اور شری جیکر نے گاندھی جی کے پاس جا کر انہیں یہ بات سنائی تو گاندھی جی ناراض ہو گئے۔ لارڈ ارون چاہتے تھے کہ گاندھی جی اور انڈین نیشنل کانگریس اپنی شکست کو تسلیم کر لیں۔ گاندھی جی اِس کے لئے تیار نہ تھے۔

اُن دنوں موتی لال جی نہرو بیماری کی وجہ سے جیل سے پیرول پر رہا ہوئے۔ بہت بیمار تھے وہ، لیکن دیش کی اور ستیہ گرہ کی حالت کو وہ جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ گاندھی جی نے شری سپرو اور شری جیکر کو وائسرے کے پاس بھیجا اور وائسرائے نے کیا جواب دیا۔ پنڈت موتی لال جی نہرو، گاندھی جی کے ساتھی تھے ضرور لیکن اُن کی طرح ''اہنسا'' کو اپنا ایمان نہیں مانتے تھے۔ وہ کرانتی کاریوں کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ شری چندر شیکھر آزاد اور اُن کے دوسرے کرانتی کاری ساتھیوں سے مل بھی چکے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ''ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی'' نے فیصلہ کیا کہ گاندھی جی اور انڈین نیشنل کانگریس جو کچھ چاہتے ہیں وہی ہم بھی تو چاہتے ہیں، یہ کہ ملک کی غلامی ختم ہو، ہندوستان آزاد ہو جائے۔ پھر ہم دونوں مل کر کام کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم اہنسا وادی نہیں۔ ہم پستولوں، ریوالوروں اور بموں کو لے کر لڑیں گے۔ کانگریس والے اہنسا کے ہتھیار کو لے کر لڑیں۔ چند مہینوں میں ہم ملک کے اندر آگ لگا دیں گے کہ انگریز اُسے ختم نہیں کر پائے گا۔ تب ایک لمبا چوڑا پلان بنایا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ گاندھی جی سے مل کر یہ پلان اُن کے سامنے رکھا جائے۔ لیکن گاندھی جی کو کیسے ملا جائے؟ ''ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی'' کے بڑے بڑے لیڈر تو سب ''مفرور'' تھے۔ ہر ایک کے لئے کئی کئی ہزار روپے کے انعام انگریز سرکار نے مقرر کر رکھے تھے کہ انہیں زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں گرفتار کرنے والے کو دیئے جائیں گے اور گاندھی جی کے پاس تو ہر قسم کے آدمی رہتے تھے۔ پولیس کے جاسوس بھی۔ تب اُن سے ملا کیسے جائے۔ پنڈت موتی لال جی نہرو کے پاس سندیش بھیجا گیا۔ یہ سندیش لے کر پرتاب کانپور کے ایڈیٹر و مالک شری گنیش شنکر ودیارتھی گئے۔ پنڈت موتی لال جی نے کہا۔ ''اِس ملاقات کا انتظام میں کروں گا۔ میرے گھر آنند بھون میں یہ ملاقات ہوگی۔ میں دیکھ لوں گا کہ گاندھی جی الہ آباد کب آئیں گے۔ وہ میرے گھر میں ہی ٹھہریں گے۔ میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔'' چنانچہ گاندھی جی الہ آباد آئے۔ موتی لال جی نے شری گنیش شنکر ودیارتھی کو اطلاع دے دی۔ شری چندر شیکھر شری بھگوتی چرن، شری دھنونتری اور دوسرے چار کرانتی کاری موتی لال جی نہرو کے آنند بھون پہنچے۔ گاندھی جی کچھ بھی مانے نہیں۔ ایک ہی بات پر زور دیتے رہے کہ کوئی غیر آدمی اندر نہ آئے۔ بات چیت ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ جن کو قید ہونی ہے، ہونے دو۔ جو سزا ملتی ہے ملنے دو اور میرے ساتھ مل کر اہنسا کے راستے پر چلو۔ شری چندر شیکھر بہت ناراض ہوئے۔ سبھی کرانتی

کاری جس طرح چھپ کر آئے تھے، اُسی طرح چھپ کر واپس چلے گئے۔ اُسی وقت موتی لال جی نے شری چندر شیکھر آزاد کو کہا ''گھبراؤ نہیں بیٹے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

جب وہ 1935ء میں پیرول پر رہا ہو کر آئے تو انہوں نے گنیش شنکر ودیارتھی کو اپنے پاس بلایا۔ انہیں ستیہ گرہ کے متعلق '' گاندھی جی اور وائسرائے اردن کے متعلق پوری بات بتائی اور کہا'' چندر شیکھر آزاد نوجوانوں کو یہ کہو کہ یہ نوجوانوں کے میدان میں آنے کا وقت ہے۔ کانگریس کا اندولن ہار گیا تو ملک کی جدوجہد آزادی کئی برس پیچھے چلی جائے گی۔ یہ کانگریس کی عزت اور بے عزتی کا سوال نہیں، ملک کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ نوجوانوں کو کہو کہ یہ وقت اُن کے لئے چیلنج ہے۔

شری گنیش شنکر ودیارتھی نے یہ پیغام شری چندر شیکھر آزاد کے پاس پہنچا دیا۔ ''ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی'' کی میٹنگ ہوئی۔ شری چندر شیکھر آزاد ہمارے کمانڈر ان چیف تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ''اب ملک کے مختلف حصوں میں انگریز حکومت کے بڑے بڑے افسروں پر حملے کرنا ہوں گے۔ ہمارے کئی لوگ گرفتار ہوں گے۔ کئی پھانسی چڑھیں گے لیکن ملک کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم کانگریس اور گاندھی جی کو ہارنے نہیں دیں گے۔ انگریز کو مجبور کریں گے کہ وہ گاندھی جی کے سامنے جھکے۔''

یہ حکم لاہور میں ہمارے پاس پہنچا تو ہم نے فیصلہ کیا کہ پنجاب کے گورنر سر جوفرے ڈے مانٹ مورنس' پر حملہ کیا جائے۔ اُن پر گولی چلا کر انہیں ہلاک کیا جائے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ گولی چلانے کے لئے بھیجا کس کو جائے۔ اِس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے تھے۔ ہم خود گولی چلانا نہیں جانتے تھے۔ گولی چلانے کے ماہر پنجابی کرانتی کاری اُس وقت پنجاب سے باہر تھے۔ پتہ نہیں کہاں؟

درگا جی نے مجھے کہا ''تم کسی آدمی کا انتظام کرو لیکن آدمی ایسا ہونا چاہیے جو ودیارتھی معلوم ہو۔''

میں نے سوچنا شروع کیا۔ پشاور میں میرے ایک ساتھی رہتے تھے عباد خان۔ ''ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی'' کے ممبر تھے وہ پشاور اور قبائلی علاقے و افغانستان سے پستولیں، ریوالور اور بم خرید کر لانے کا کام کرتے تھے۔ میں کابل کے روسی سفارت خانے کے لئے مہینے میں دو خط لکھا کرتا تھا جن میں ہندوستان کی سیاسی حالت اور جدوجہد آزادی کا پورا حال ہوتا تھا۔ اِن خطوط کو کابل لے جانے اور وہاں سے ہر خط کے بدلے دس پونڈ لانے کا کام بھی وہی کرتے تھے۔ لیکن پٹھان ہونے کے باوجود بہت کالے رنگ کے بہت بھدے چہرے کے آدمی تھے۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ عباد خان کہاں ہوں گے؟ پشاور میں؟ کابل میں!! کسی آفریدی گاؤں میں، تبھی

مردان کے شری چمن لال میرے پاس آئے۔ میں نے اُن سے بات کی۔ وہ بولے" میں گولی چلانا جانتا تو ہوں لیکن میرا نشانہ بہت صاف نہیں۔ میں تمہیں ایک اور آدمی لا کر دیتا ہوں، اور وہ ہری کشن کو لے کر میرے پاس آئے۔ ہری کشن اُن کے رشتہ دار تھے۔ میں نے ہری کشن کو دیکھا تو آنے کے ساتھ کہا" چمن لال۔ یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ ہری کشن کی عمر اُس وقت 18 یا 19 برس تھی۔" میں نے کہا" میں کوشش کروں گا کہ یہ گولی چلانے کے بعد گرفتار نہ ہو۔ لیکن یہ کوشش ضرور کامیاب ہو جائے گی، ایسا یقین میں دے نہیں سکتا۔ گرفتار کرنے کے بعد پولیس اِسے بہت مارے گی، اِسے کئی طرح کی اذیتیں دی جائیں گی۔ اُس وقت میں نے دونوں کو بتایا کہ پنجاب کے گورنر پر گولی چلانی ہوگی۔ تب تو مصیبت جاگ اُٹھی۔ چمن لال نے کہا" ہری کشن کو رہنے دو، میں ہی جاؤں گا، میں ہی یہ کام کروں گا۔" ہری کشن جی بولے" واہ! تم تو مجھے یہ کہہ کر مردان سے لائے تھے کہ ایک بہت بڑا کام کرنا ہے۔ اب جب کام معلوم ہوا تو کہتے ہو کہ تم جاؤ گے۔ میں یہ بات مانوں گا نہیں۔" اِس پر میرا دل بھر آیا۔ یہ دیکھ کر کہ یہ دو نوجوان اِس لئے آپس میں جھگڑ رہے ہیں کہ" پہلے میں مروں گا۔" آج بھی جب اِس منظر کو یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ اُس وقت کے نوجوان ملک کی آزادی کے لئے جانیں دینے کو آپس میں جھگڑتے تھے۔ اب اِن میں کچھ ملک میں نقصان پہنچانے میں مصروف ہیں۔

میں نے چمن لال کو کہا" تم جاؤ، میں ہری کشن کو دیکھوں گا کہ اگر اُسے اِس کام کے قابل سمجھوں گا تو بھیجوں گا، نہیں تو نہیں بھیجوں گا۔"

تب میں ہری کشن کو ساتھ لے کر لاہور سے دور کاہنا کاچھا کے اُس جنگل میں گیا جہاں "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی" کے بہادر سپاہی کئی بار گولی چلانے اور نشانہ لگانے کی تربیت پانے کے لئے جاتے تھے۔ کئی نئے نوجوانوں کو خود چندر شیکھر آزاد اِسی جنگل میں نشانہ لگانے کی تربیت دیتے تھے۔ میں بھی ایک بار شری چندر شیکھر جی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ (ہم انہیں دادا کہتے تھے) کافی دیر تک وہ کوشش کرتے رہے۔ آخر میں غصہ کے ساتھ بولے" تمہیں گولی چلانا کبھی آئے گا نہیں، تم فوجی کام کے قابل نہیں ہو، غیر فوجی کام ہی کرو۔"

لیکن شری ہری کشن نے وہاں جس طرح گولیاں چلائیں، ہر گولی نشانے پر لگی، اِسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا، فیصلہ کر لیا کہ ہری کشن جی کو ہی اِس عظیم کام کے لئے بھیجنا ہوگا۔ میرا پلان یہ تھا کہ اِدھر پنجاب یونیورسٹی ہال میں ہری کشن گولی چلائیں، فوراً اُدھر ہال کے باہر بموں کے دھماکے

جاگ اُٹھیں۔ اِن دھماکوں کی وجہ سے جو بھگدڑ مچے، اُس میں ہری کشن گولیاں چلاتے ہوئے ہال سے باہر آئیں، ایک موٹر میں بیٹھیں، موٹر انہیں لے کر لاہور سے باہر کہیں چلی جائے، وہاں سے شری ہری کرشن برقعہ پہن کر نوشہرہ چلے جائیں، لیکن شری کشن جی کو میں نے یہ پلان بتایا تو وہ بولے "یہ غلط ہے، بموں کے پھٹنے سے کئی بے قصور لوگ مارے جائیں گے، کئی لوگ پکڑے بھی جائیں گے، آپ اِس پلان کو چھوڑیئے، مجھے اکیلا ہی جانے دیجیے، آپ کو ڈر ہے کہ میں پکڑا گیا تو پولیس کے اذیت دینے پر اُسے سب کچھ بتادوں گا، اِس ڈر کو نکال دیجئے، میں گھر سے مرنے کے لئے آیا ہوں، اگر وقت ملا تو آخری گولی اپنے سینے پر ہی مارلوں گا۔"

میرا دل بھر بھر آیا، اتنا کم سن نوجوان اور اتنی ہمت۔ دوپہر کے وقت شری دُرگا داس کھنہ کے ساتھ ملنے کا وقت مقرر تھا۔ ہری کشن کو ٹھہرانے کا انتظام کرنا تھا۔ دوپہر کے وقت وہ آئے، ہری کشن کو لے کر چلے گئے۔ دوسرے دن میں ہری کشن کے پاس گیا۔ سناتن دھرم کالج کے پیچھے ایک نئی بستی آباد ہو رہی تھی۔ ٹوٹے پھوٹے غریبانہ مکان بن رہے تھے۔ ایک مکان میں وسندھا رام نام کا ایک نوجوان رہتا تھا ...وہ دُرگا داس جی کا آدمی تھا۔ میں نے اُسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ہری کشن نے مجھے پہچانا، میں نے اپنے کیمرے سے اُس کی ایک تصویر کھینچ لی۔

اُسی شام میں ہری کشن کو لے کر بھنگیوں کی توپ کے پاس گیا۔ ایک بار پھر انہیں سمجھایا کہ پیارے، ہم بم پھینکنے والوں کا گھیراؤ شروع کریں گے۔ یونیورسٹی ہال کے سامنے عجائب گھر ہے، وہاں تک آدمی کھڑے ہوں گے۔ وہاں سے یونیورسٹی ہال کے آخر تک۔ لیکن ہری کشن جی نہیں مانے۔ وہ پھر بولے "اپنا پلان رہنے دیجیے۔ اِس سے بہت لوگوں کے مرنے کا خطرہ ہے۔ مرنا ہو گا تو میں اکیلے ہی مروں گا۔ مجھے چھڑانے کا خیال چھوڑ دیجیے۔"

میں نے انہیں پنجاب یونیورسٹی کے ہال کا وہ دروازہ دکھایا جہاں سے انہیں اندر جانا تھا۔

میں گھر چلا آیا۔ ہری کشن جی وسندھا رام کے پاس چلے گئے۔ وہ یونیورسٹی ہال میں کیسے جائیں گے۔ اُن کے لئے نئے کپڑے کہاں سے سلوائے جائیں۔ یہ سب انتظام درگا داس جی نے کیا، اور 23 دسمبر کے روز دوپہر کے وقت خبر ملی کہ پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن کے بعد کسی نے گورنر صاحب پر گولی چلادی، گورنر صاحب بچ گئے، ایک انگریز عورت زخمی ہوئی اور ہندوستانی تھانے دار بھی، ایک تھانے دار چنن سنگھ، ہسپتال میں پہنچتے ہی مر گیا۔ میں نے یہ خبر سنی، کسی سے کچھ کہا نہیں، شام کے وقت وسندھا رام میرے پاس آیا، ہری کشن جی کے اِن کپڑوں کی پوٹلی مجھے دے گیا جنہیں پہن کر وہ

مردان سے لاہور آئے تھے۔ اِس کے ساتھ ہی خبر ملی کہ ایک نوجوان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شام میں کپڑوں کی وہ پوٹلی کچھ پتھروں کے ساتھ میں نے دریائے راوی میں پھینک دی۔

اُس وقت میں باہر سے خاموش تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ جس پلان کو میں اپنانا چاہتا تھا، اُسے ترک کر کے غلطی کی۔ ہم گورنر "جوفرے ڈی مانٹ مورنس" کو ختم کر سکتے تھے۔ کئی دوسرے لوگوں کو قتل کر سکتے تھے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔

26 دسمبر 1930ء کے روز شام کے وقت پولیس کے ڈی آئی جی سیّد احمد شاہ میرے گھر پر آئے، یہ کہہ کر مجھے ساتھ لے گئے کہ کچھ باتیں کر کے آپ کو واپس بھیج دوں گا، دراصل وہ مجھے ہتھکڑی لگائے بغیر گرفتار کر کے لئے جا رہے تھے، موٹر لاہور کے شاہی قلعے میں پہنچی، اِس حصہ میں پولیٹیکل سی۔ آئی۔ ڈی کا دفتر تھا، جہاں سردار بھگت سنگھ جی کو جیل بھیجنے سے پہلے رکھا گیا تھا۔ جہاں شری سکھ دیو اور دوسرے کرانتی کاروں کو رکھا گیا تھا۔ جہاں انہیں برف کے تودوں پر لٹایا گیا تھا۔ اِس طرح اذیتیں دی گئی تھیں کہ اُن کے جسم پر کوئی نشان نہ آئے۔

اُس وقت میں نے سمجھا کہ میں قید کر لیا گیا ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے پتا جی میرے لئے کھانا لے کر آئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کھانا کھایا، پتا جی چلنے لگے تو میری گھڑی اُتروالی گئی، میرا فاؤنٹین پن مجھ سے لے لیا گیا، جیب میں کچھ روپے تھے، وہ بھی لے لئے گئے، اور مجھے ایک کوٹھری میں بھیج دیا گیا جس میں ایک چارپائی پر میرا گھر سے آیا ہوا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں اُس کوٹھری کی طرف جانے لگا تو سید احمد شاہ نے کہا۔

"اب تم سوؤ رنیر ..... میں کل تم سے باتیں کروں گا۔"

لیکن یہ "کل" پانچ دن کے بعد آیا۔

اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ شری ہری کرشن جی بھی اِسی شاہی قلعہ کی حوالات میں ہیں۔ انہیں اذیت دی جا رہی ہے۔ 28 دسمبر کے روز مجھے اِس بات کا پتہ لگا۔ میں بہت غصہ میں تھا۔ صرف اِس لئے نہیں کہ شری ہری کرشن کو اذیت دی جا رہی ہے بلکہ اِس لئے بھی کہ یکم جنوری کے لئے جو پلان میں نے بنا رکھا تھا، وہ ٹھپ ہو چکا تھا۔ میرا پلان یہ تھا کہ لاہور چھاؤنی میں یکم جنوری کے روز برٹش فوج کی پریڈ ہو تو اُس سے ایک دن پہلے پریڈ گراؤنڈ میں ٹائم بم دبا دیئے جائیں، اِن بموں کا انتظام میرے پاس تھا، ٹھیک اُس وقت جب انگریزی فوج وہاں پریڈ کرتی تو یہ بم پھٹ جاتے اور ایک طوفان جاگ اُٹھتا، لیکن اب میں جیل میں تھا، یہ سب کچھ ہوتا کیسے؟ 30 دسمبر

کے روز سید احمد شاہ صاحب میری کوٹھری کے باہر آئے۔ سلاخوں والے دروازے سے کچھ دور کھڑے ہو کر بولے ”کہیے...... کیا حال ہے؟“

میں نے غصے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ٹھیک ہوں، دکھی ہوں بھی تو اس لئے کہ آپ نے مجھ سے کاغذ قلم چھین لیے، میں نے کوئلے سے اِس کوٹھڑی کی دیوار پر افسانہ لکھ دیا ہے۔

ساری دیوار کالی پڑی ہوئی تھی۔ بعد میں انسپکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی پولیٹیکل مسٹر جنکسنز نے اِس افسانے کو دیکھا۔ اِس کا انگریزی ترجمہ کرایا اور میرا پین مجھے واپس دے دیا کہ ”تم تو بہت اچھا افسانہ لکھتے ہو۔ یہ ہی لکھنا ہے تو قلم اور کاغذ بھی مل جائیں گے۔“

لیکن سید احمد شاہ نے اس دیوار کو دیکھے بغیر کہا ”آخر پکڑے گئے نا؟“

میں نے کہا آپ کی حکومت ہے۔ آپ جسے بھی چاہیں حوالات میں پکڑ کر رکھ سکتے ہیں۔ اِس میں حیرت کی بات کیا ہے؟

سید احمد شاہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں میں ”پولیس کا مخبر“ بن کر خبریں دیا کرتا تھا۔

وہ بولے ”بہت دھوکہ دیا تم نے، لیکن ہم کسی کو ایسے ہی نہیں پکڑتے، سب ثبوت ہمارے پاس ہیں، اُن کی باتیں پھر ہوں گی۔ آج تمہیں بتاتا ہوں کہ دیروار کے دن تم پکڑے گئے، اِس سے پہلے سنیچر کی رات کو گیارہ بجے تم ٹاؤن ہال لاہور کے باہر فوارے کے پاس کھڑے تھے۔

میں نے کہا کھڑا ہوں گا۔ میں سیر کرنے گیا ہوں گا۔

وہ بولے ”سردیوں کی رات میں گیارہ بجے کوئی سیر کرنے نہیں جاتا لیکن وہاں ایک آدمی تمہیں ملا، اُس نے ایک تھیلا تمہیں دیا، اُس میں دو بم اور دو ریوالور تھے۔“

میں نے یہ بات سنی تو چونک اُٹھا۔ یہ بات بالکل سچ تھی۔ جس آدمی نے وہ تھیلا مجھے دیا، وہ ایک پٹھان تھا۔ عباد خان کا بھیجا ہوا۔ اِس کا پتا کسی کو لگ سکتا ہے، ایسا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر کس طرح پولیس والوں کو اِس بات کا پتا لگا؟ آج تک یہ راز سمجھ میں نہیں آسکا۔ ریوالوروں اور بموں کو تھیلے سے نکال کر میں نے دیکھا ضرور تھا، شاید کوئی پولیس والا اُس وقت میری نگرانی کر رہا تھا یا اتفاقاً وہاں موجود تھا، شاید اُس نے دیکھا ڈر کے مارے میرے نزدیک نہیں آیا۔ لیکن میں غصے سے پاگل ہو اُٹھا، نفرت کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا، یہ کیا بڑی بات ہے سید احمد شاہ صاحب۔ میں دیروار کی رات کو پکڑا گیا۔ اِس سے پہلے ہفتہ کے بدھوار کی رات کو آپ اسی شاہی قلعہ کے اندر اپنے دفتر میں آئے۔ آپ نے بڑا کوٹ اُتار کر اپنے پیچھے ایک کیل پر لٹکا دیا، اِس کوٹ کی جیب

میں ایک پستول پڑا ہوا تھا، ایک گولی چلی ہوئی تھی، پانچ گولیاں اُس وقت بھی اُس میں موجود تھیں، میری شرافت یہ ہے کہ میں نے آپ کا پستول نکلوایا نہیں۔"

وہ ایک دم لرز اُٹھے، بولے یہ، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

میں نے جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکال کر دیا" اور یہ کاغذ آپ کے کوٹ کی اوپر والی جیب میں تھا، یہ لے لیجیے، اب اس کی کچھ ضرورت نہیں۔"

سید احمد شاہ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ منت بھری آواز میں بولے بتاؤ...... یہ کام کس نے کیا؟

میں نے سمجھا کہ میں نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے، ہنستے ہوئے کہا" ختم ہو گیا پاگل پن، مجھے غصہ آ گیا تھا، آپ کو ایسی بات کہہ دی جو کہنی نہیں چاہیے تھی لیکن آپ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں، اِس سے آگے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

بعد میں آئی۔ جی پولیٹیکل سی۔ آئی۔ ڈی بھی میری منتیں کرتے رہے۔ انہوں نے کہا" مجھے پولیس والوں پر اتنا [illegible] ہمارا آدمی [illegible] مارا!"

میں نے ہنستے ہوئے کہا" اِس چنتا کو چھوڑیے۔ پولیس والے ہندوستانی ہیں، پیسے کے لئے آپ کا کام کرتے ہیں۔ مجھے ایک کروڑ روپیہ دیجیے، میں ایک ہفتہ میں آپ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دوں گا۔"

لیکن یہ تو میری بات تھی، میں اپنی بات نہیں لکھنا چاہتا، یہ بھی لکھنا نہیں چاہتا کہ ہائی کورٹ سے باعزت رہائی ملنے اور پھانسی کی کوٹھری سے باہر آنے کے بعد مجھے پہلے پنجاب سیفٹی ایکٹ کے تحت اور پھر دو برس کے لئے ہندوستان کی انگریز سرکار کے حکم سے نظر بند کر دیا گیا تو اس کی وجہ میری یہ ہی بے وقوفی تھی۔

ہری کشن جی کو پھر کبھی نہ مل سکا، انہیں میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا، ہمیں شاہی قلعہ سے لاہور کے بورسٹل جیل میں، جیل کے اندر ہی مجسٹریٹ کے سامنے ہمارا مقدمہ چلنے لگا، مقدمہ میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے کئی سجن ملنے کے لئے آتے تھے۔ اُن میں ایک بزرگ سجن بھی آئے، انہوں نے خود ہی مجھے کہا...... میں ہری کشن کا پتا گورداس مل ہوں۔

میں تھوڑی دیر کے لئے گھبرایا کہ یہ اب غصہ کریں گے کہ میں نے اُن کے لاڈلے بیٹے کو موت کے منہ میں کیوں دھکیل دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بولے" میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں، تم نے ہری کشن کو گورنر پر گولی چلانے کے لئے بھیجا، وہ گورنر کو زخمی کر سکا نہ اُسے مار سکا،

لیکن میرے دوسرے بیٹے بھی ہیں۔ تم رہا ہو کر باہر آؤ۔ میں ایک ایک کر کے اپنے سب بیٹوں کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔ تم جو کام کہو گے وہی وہ کریں گے، تم چاہو تو میں خود بھی تمہارے حکم کو پورا کروں گا۔ میں نے اُن کے پاؤں چھوئے۔ اُن کے ہاتھ پیار سے دبائے اور اُس رات کتنی ہی دیر تک روتا رہا کہ جس دیش میں ایسے لوگ موجود ہیں وہ غلام کیوں ہے؟

من کے اندر سے آواز آئی۔ یہ دیش بہت دیر تک غلام رہے گا نہیں، یہاں ہری کشن جیسے بچے سے لے کر گورداس مل جیسے بزرگ کے دل میں ایک ہی آگ جل رہی ہے۔ یہ آگ برطانوی سامراج کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

9 ستمبر 1931ء کے روز سیشن جج گارڈن ور کرنے مجھے درگا داس جی کو اور چمن لال جی کو موت کی سزا کا حکم سنایا۔ ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہمیں لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا، ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی، کیوں ہوئی، یہ اس جگہ لکھوں گا نہیں، لالہ مہر چند مہاجن جو آزاد ہندوستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے، میرے وکیل تھے۔ مارچ یا شاید اپریل 1932ء میں ہائی کورٹ نے ہم تینوں کو بری کر دیا۔ ایک مہینے کے بعد پنجاب سرکار نے مجھے گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ لیکن یہ تو میری کہانی ہے۔ اِسے میں لکھنا نہیں چاہتا۔ میں ہری کشن جی کی بات لکھنا چاہتا تھا، اُسے لکھ دیا۔ انہیں میانوالی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اس کے چند روز بعد شری گورداس مل بھی چل بسے۔ 23 مارچ 1931ء کے روز بھگت سنگھ جی، شری راگورو اور شری سکھ دیو جی کو پھانسی دے دی گئی۔ اِس سے دو مہینے پہلے شری چندر شیکھر آزاد پولیس سے لڑتے لڑتے الٰہ آباد میں شہید ہو گئے۔ پچاس برس ہوئے اِس بات کو، آج ہم شہیدوں کی اور شتابدی مناتے ہیں۔ لیکن ہم اِس سپرٹ کو بھی یاد کر سکتے ہیں جو شہیدوں میں موجود تھی اور جس کی امانت ملک کی یہ آزادی ہے؟

لیکن دسمبر 1930ء میں صرف پنجاب کے گورنر پر گولی نہیں چلی، ایک بنگالی لڑکی نے بنگال کے گورنر پر گولی چلائی، ایک نوجوان نے بمبئی کے گورنر پر، ایک اور نوجوان نے یو۔پی کے انگریز انسپکٹر جنرل پر کیے بعد دیگرے یہ حملے ہوئے تو لارڈ ارون نے سمجھا کہ یہ تحریک اب کرانتی کاریوں کے ہاتھ میں آ رہی ہے، انہوں نے اُسی وقت گاندھی جی کی رہائی کا حکم دیا، گاندھی جی باہر آتے ہی لارڈ ارون سے ملے، ''گاندھی جی ارون سمجھوتہ'' ہوا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ واپس لے لیا۔ ہر طرف گاندھی جی کی جے کے نعرے گونج اُٹھے۔

☆☆☆☆☆

دستاویز(5)

# منجدھار میں چھوڑ دیا

اویس قرنی رودلوی

کانگریس کا معمولی ورکر جس کو سچ اور عدم تشدد کی تعلیم دی گئی ہے جس کو کانگریس کے جھنڈے کے نیچے تقریباً چالیس سال کام کرنے کا شرف حاصل ہے، جس کی نگاہ میں وہ زریں اصول بھی ہیں جن کو سامنے رکھ کر جنگ آزادی لڑی گئی، جس کے ذہن میں گاندھی جی کا یہ قول بھی ہے "جب مقصد بلند ہو تو اُس کو حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بلند ہونا چاہیے۔"

وہ حالات لکھنے بیٹھتا ہے تو اُس کی دماغی کشمکش حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اُس کی گذشتہ تعلیم متقاضی ہے کہ اصل حالات لکھ دیئے، لیکن مصلحت ہے کہ قلم بڑھنے نہیں دیتی کیونکہ اگر صحیح صحیح حالات لکھ دیئے جائیں تو الزام اُن پر رہتا ہے جو کانگریس اور ملک کے رہبر ہیں جن کو وہ ورکر بھی اپنا رہبر مانتا ہے۔ اتنا ضرور کیا کہ جب صحیح واقعات ہی لکھنے کا تہیہ کرلیا تو بجائے سیاہی کے شرم وندامت کی روشنائی سے لکھنا شروع کیا۔ ناظرین سے عرض ہے کہ میری بات اِس وجہ سے نہ رد کردی جائے کہ ادنیٰ ورکر اتنے بڑے بڑے لیڈروں پر تنقید کررہا ہے لہٰذا نا قابل اعتنا ہے بلکہ شرط انصاف ہے۔

کانگریس کی پوری تاریخ میں اگر کوئی دھبہ نظر آتا ہے تو صرف یہی ہے کہ اُس نے اپنی ایک خاص شاخ صوبہ سرحد کو وقت پر بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ صوبہ سرحد کے حالات اس وقت آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے جب وہاں کی مختصر تاریخ اور جغرافیائی حالات بھی بیان کردیئے جائیں۔

صوبہ سرحد پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1818ء میں قبضہ کیا۔ اتفاق سے مشہور درہ خیبر بھی یہیں

ہے جس سے صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے۔ یہ ہندوستان کا شمال مغربی دروازہ بھی کہلاتا ہے، جتنے بھی حملے ہوئے، اُسی درّہ سے ہوئے۔ افغانستان اور ایران سے حملہ ہونے کی کوئی اُمید نہیں تھی لیکن روس کی طرف سے ضرور خطرہ ہوسکتا تھا۔ ہندوستانی جیسی سونے کی چڑیا ہاتھ آجانے کے بعد انگریز کا ہر گھڑی چوکنا رہنا فطری بات تھی۔ انگریز کو ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ یہ پٹھان منظم نہ ہونے پائیں ورنہ انگریزی مفاد کو سخت خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ یہی ہر گھڑی کا خطرہ اور اُس کے سدّ باب کا خیال پٹھان کی ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ 1901ء میں انگریز نے صوبہ سرحد کو پنجاب سے الگ کیا، ایک ایسے وحشیانہ قانون کا نفاذ کیا جو چنگیز خان، ہلاکو اور ہٹلر نے بھی نافذ نہیں کیا ہوگا۔ اِسی کالے قانون کا نام ''فرنٹیر کرائمز ریگولیشن'' تھا۔ برطانیہ نے اِس قانون کا نفاذ کچھ اِس طرح کیا کہ پٹھان کی اجتماعی زندگی بالکل تتر بتر ہوگئی اور اُن میں پارٹی بازی، پھوٹ، باہمی دشمنی پیدا ہوگئی۔ انگریز اِسی قانون کے ماتحت ایک جرگہ بھی قائم کردیا کرتے تھے جس میں سب سے زیادہ وفاداروں کو رکھ دیا کرتے تھے۔ اگر کسی سے خطرہ پیدا ہوا تو پولیس اُس کے اوپر فرضی مقدمات قائم کردیا کرتی تھی اور وہی وفاداروں کا جرگہ فوراً اُس کو چودہ سال کی سزا دے دیا کرتا تھا۔ جس کی کوئی بھی اپیل نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ انکشاف چونکا دینے والا ہے کہ آزادی کے بعد بھی حکومت پاکستان آج تک اُس کالے قانون کا نفاذ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کئے ہوئے ہے اور اُس پر عمل پیرا ہے۔ اِسی قانون کی ایک دفعہ چالیس جو کہ اخلاقی جرم سے متعلق تھی لیکن انگریز اپنے دورِ حکومت میں سیاسی لوگوں کے خلاف استعمال کیا کرتے تھے۔ بادشاہ خان نیز ہزاروں خدائی خدمت گاروں نے اِس دفعہ چالیس کے ماتحت سزائیں کاٹیں۔ اِس قانون کی سختی اور ضمانت طلبی کا ذکر بھی ہوگا۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ 1931ء میں جب کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں چارسدہ میں انگریزوں نے خدائی خدمت گاروں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دیئے تو ایک نوجوان پٹھان حبیب نور (پشاور) اپنے جوشِ غضب کو نہ روک سکا۔ اپنا پستول لے کر نکلا۔ جب چارسدہ کا انگریز اسسٹنٹ کمشنر کچہری جانے لگا تو اُس نے اُس پر پستول چلا دیا۔ اتفاق سے پستول نہیں چلا، اُس نے غصہ میں اسسٹنٹ کمشنر کو اُٹھالیا اور زور سے زمین پر دے مارا اور کہا ''تجھ کو میں مار نہیں سکا لیکن ذلیل کئے دیتا ہوں۔'' فوراً پولیس موقع پر پہنچ گئی اور وقوعہ کے چوبیس گھنٹے کے اندر حبیب نور کو پھانسی دے دی گئی۔ آج تک دنیا میں کسی عدالت نے اِس برق رفتاری سے نہ سزائے موت

دی ہوگی اور نہ اُس پر اتنی جلدی عمل درآمد ہوا ہوگا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حبیب نور کو اتنی تیزی اور آسانی سے حکومت کیسے پھانسی دے سکی، جس پر نہ کوئی عدالت کی مہر لگی نہ کوئی اپیل وغیرہ ہوئی۔ ہر سزائے موت کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ آخری عدالت سے اپیل خارج ہو جائے اور رحم کی درخواست بھی خارج ہو جائے تو سزائے موت دی جاتی ہے، لیکن یہاں کچھ بھی نہیں ہوا، سیاسی پھانسی میں رائے عامہ کے مشتعل ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ یہاں اِس کی بھی پروا نہیں کی گئی۔ مناسب ہوگا کہ ہندوستان کی ایک سیاسی پھانسی کا ذکر کر دیا جائے تو صوبہ سرحد کے قوانین کا فرق واضح ہو جائے۔ ہندوستان کے مشہور انقلابی سردار بھگت سنگھ ایک انگریز ڈی۔ایس۔پی سانڈرس کے قتل اور اسمبلی میں بم پھینکنے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ حکومت کی دلی خواہش تھی کہ اِن انقلابیوں کو جس قدر جلد ممکن ہو سکے ختم کر دے لیکن ایسا نہ کر سکی۔ بلکہ مجبوراً جملہ قانونی کاروائیاں کی گئیں۔ اخبارات، رائے عامہ کا خیال، تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کی پابندی ضروری تھی اور کی گئی پھانسی تب دی جا سکی۔ حبیب نور پشاور کے معاملے میں کچھ بھی نہ ہوا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پھانسی دی اور قصہ ختم۔ حبیب نور خدائی خدمت گاروں پر ظلم سے اِس قدر مشتعل ہوا اور ایک انگریز اسسٹنٹ کمشنر پر گولی چلائی مگر چل نہ سکی۔ صرف زمین پر پٹک دیا اور ذلیل کر دیا۔ بھگت سنگھ نے اسمبلی میں بم چلایا اور لالہ لاجپت رائے کے زخموں سے مشتعل ہوا، بدلے میں انگریز ڈی۔ایس۔پی کو قتل کر ڈالا۔ ایک کے لئے جملہ قانون کی پابندیاں دوسرے کے لئے یہ برق رفتاری؟ یہ امتیاز کیا نشاندہی کرتا ہے؟

صوبہ سرحد میں تعلیم نام کی کوئی چیز نہ تھی نہ کوئی اسکول تھا، نہ کالج، یونیورسٹی تو بڑی چیز ہے۔ وہاں تعلیم کے خلاف انگریز نے بڑی دلچسپ فضا بنا دی تھی۔ سرکاری آدمی بچوں کو تعلیم دینے کی بجائے پشتو زبان کا ایک شعر یاد کرایا کرتے تھے اور یہ لڑکے بازاروں و گلیوں میں یہ شعر بڑے جوش و خروش سے پڑھا کرتے تھے۔ اس کے معنی ملاحظہ ہوں۔ ''جو مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں، انہیں جنت میں جگہ نہیں ملے گی اور دوزخ میں رگڑے کھاتے پھریں گے۔'' آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ صوبہ سرحد میں اسکول کھولنا جرم تھا۔ بادشاہ خان کو اتمانزئی میں اسکول کھولنے کے جرم میں تین سال کی سزا ہوئی تھی۔ اُس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ تھا کہ پٹھانوں میں تعلیم کا نام و نشان نہ تھا۔ یوں تو

ہندوستان بھر میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن صوبہ سرحد میں تو سب سے کم تھی۔ اِسی جہالت سے فائدہ اُٹھا کر صوبہ بھر میں دہشت پھیلا دی گئی تھی باوجودیکہ پٹھان پیدائشی بہادر ہوتا ہے لیکن انگریز کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اگر کہیں کوئی پٹھان مشتعل ہو کر کسی انگریز کو قتل کر دیتا تھا تو اپنا رعب قائم کرنے کے لئے انگریز پورے گاؤں کے گاؤں اُجاڑ دیتے تھے۔ بے شمار پٹھانوں کو پھانسی دے دیتے تھے۔ اپنا رعب طاری کرنے کے لئے کیا کیا ترکیبیں کی جاتی تھیں صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:

''مالاکنڈ کے ایک پولیٹیکل ایجنٹ نے وہاں کے لوگوں پر ایسی دہشت بٹھا رکھی تھی کہ اُن کے بڑے بڑے آدمی بھی جب کسی انگریز کو دیکھ لیتے تھے تو اُن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور بہت دُور سے اُس کے آگے جھک جاتے تھے اور بڑے ادب سے اُسے سلام کرتے تھے۔ اِس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اگر کوئی آدمی انگریز کے سامنے آجاتا اور وہ انگریز کو سلام نہ کرتا تو اُسے گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اُسے کاٹھ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ کاٹھ ایک بڑی بھاری وزنی اور لمبی لکڑی ہوتی تھی۔ اُس میں سوراخ ہوا کرتے تھے۔ اِن سوراخوں کے اندر آدمی کے پاؤں دبا دیئے جاتے تھے اور اوپر سے لکڑی کے ڈھکنے کو ٹھوک کر بند کر دیا جاتا تھا۔ اِس طرح آدمی اُس میں بندھا ہوا پڑا رہتا تھا۔''[1]

انگریز نے نہ تو حفظانِ صحت کا کوئی انتظام کیا نہ کوئی صنعت قائم کی نہ تعلیم پھیلائی نہ سڑک وغیرہ بنائیں، علاوہ فوجی سڑکوں کے۔ اِس پر طرہ یہ کہ صوبہ سرحد کو ہندوستان سے بالکل الگ تھلگ کر دیا تھا نہ وہاں کوئی اخبار تھا، نہ وہاں کی خبر باہر آ سکتی تھی نہ کسی کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔ حد یہ ہے کہ گاندھی جیسے انسان کو جن پر اُن کا کوئی کڑا سے کڑا دشمن بھی تشدد کے بڑھاوے کا الزام نہیں لگا سکتا ہے، اُن کو بھی لارڈ ارون اور لارڈ ولنگڈن نے سرحد جانے کی اجازت نہیں دی تھی، محض اِس لئے کہ اگر ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر وہاں جاتے، تو انگریز نے وہاں جو کچھ کر رکھا تھا، اُس کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

[1] آپ بیتی۔ خان عبدالغفار خان صفحہ 31

آیئے اب آپ کو صوبہ سرحد کے انتظامی ڈھانچے کی طرف بھی متوجہ کریں۔ انگریز نے صوبہ سرحد کی عجیب وغریب تقسیم کی تھی۔

(1) صوبہ سرحد کا وہ علاقہ جہاں بادشاہ خان رہتے تھے، گورنر کا صوبہ کہلاتا تھا۔

(2) ایجنسیوں کا علاقہ جو پولیٹیکل ایجنٹ کے براہ راست اختیار کے ماتحت ہوتے تھے۔

(3) وہ ریاستیں جن کا نظام پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے سے چلتا تھا۔

(4) آزاد قبائل کا علاقہ۔

پٹھانوں کی یہ دنیا چار حصوں میں تقسیم کی گئی تھی جن میں سے ایک حصہ بھی دہلی سے ارتباط اور تعلق رکھنے کا مجاز نہیں تھا۔ یہ تقسیم محض اس لئے کی گئی تھی کہ پٹھان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور قبیلوں میں بٹتے رہیں تاکہ آسانی سے ایک دوسرے سے الگ رکھے جاسکیں اور اُن کو آپس میں بھائی چارہ یا قومیت کا احساس جگانے کا دھیان بھی نہ آسکے۔ صوبہ سرحد کا وہ علاقہ جو گورنر کے زیر اثر قانونی طور پر اسمبلی کے ذریعہ منظم کیا جاتا ہے، اُسے اضلاع بندوبستی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس علاقے اور آزاد قبائل کے درمیان ایک بفرزون ایجنسیوں کا ہے۔ یہ علاقہ پولیٹیکل ایجنٹ کے براہ راست زیر حکومت ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا نہ تو کوئی قانون ہوتا ہے اور نہ عدالت۔ یہاں تک کہ پولیٹیکل ایجنٹ کے کسی حکم کے خلاف کسی کو اپیل کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایجنسیوں کے لوگ بے چارے جاہل، مظلوم اور اس حد تک معتوب ہوتے ہیں کہ ایک واحد شخص کے حکم سے مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔

ایجنسی کے لوگوں کو بندوقیں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور انہیں یہ بھی اجازت ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔ ایک دوسرے کا مال غصب کریں۔ ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں تاکہ ہمیشہ پولیٹیکل ایجنٹ کے دباؤ میں رہیں۔ خوشامد کر کے اپنی جان بچانے کے لئے اُس کے آسرے پر زندگی بسر کرتے رہیں۔ اس علاقے کے قیام کی محض وجہ یہ ہے کہ اگر قبائل صوبے کے بندوبستی اضلاع پر حملہ کریں (ڈاکہ ڈالیں) تو وہ پہلے ان لوگوں یعنی ایجنسیوں میں سے گذرنے پر مجبور ہوں اور یہ لوگ (ایجنسیاں) اپنے سینے سپر بنا کر اُن کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں۔ یہ لوگ اتنے پست ہمت اور مظلوم ہیں کہ پولیٹیکل ایجنٹ کا ادنیٰ اشارہ ان کے لئے زندگی کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ لوگ آزاد قبائل کی طرح آزاد نہیں ہوتے اور دوسری طرف محکوم صوبے کے مانند

قانون اور عدالت کے سائے سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ ان کے علاقے میں انگریزی فوجیں بارڈر پولیس اور لیوی ہمیشہ ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا حالات پڑھنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ انگریز اپنی من مانی کرتا تھا اور کوئی آواز اُٹھانے والا نہ تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ پٹھان آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ کوئی بھی ایسا لیڈر نہیں تھا جو اُن کو اکٹھا کر کے کوئی پارٹی بناتا اور اُن کی رہنمائی کرتا۔ انگریز کے ان مظالم کے خلاف آواز کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا کہ کوئی لیڈر پیدا ہوتا جو تمام پٹھانوں کو یکجا کرتا اور اجتماعی جدوجہد سے قربانی و ایثار سے ان مظالم کا مقابلہ کر کے پٹھانوں کو منظم کرتا اور انہیں ذلت کی زندگی سے نجات دلاتا۔

یہ انگریز کی بدقسمتی اور پٹھانوں کی خوش قسمتی تھی کہ صوبہ سرحد کو بادشاہ خان کے ایسا مخلص باعمل لیڈر مل گیا۔ یہ چیز ہمیشہ ذہن میں رہے کہ صوبہ سرحد کی تمام سیاست صرف بادشاہ خان کے گرد گھومتی تھی۔ اگر کوئی صوبہ سرحد کی تاریخ دیکھنا چاہے تو وہ تاریخ 1919ء سے 1947ء اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک خان برادرز کا ذکر نہ کیا جائے۔

گو آج کل بادشاہ خان ایک دوسرے ملک کے شہری ہیں لیکن ہم جو واقعات لکھیں گے، وہ اُس وقت کے ہیں جب نہ ہندوستان تھا اور نہ پاکستان تھا بلکہ صرف برطانوی ہند تھا۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد جو نسل بڑھی اور پروان چڑھی، اُس کو بادشاہ خان کی سیاسی زندگی کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اُن میں بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جن کی ہماری قوم کو آج ضرورت ہے۔ اگر آج ہندوستانی صدق دل سے بادشاہ خان کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں تو ہماری بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں۔ ہم نے اس باب کے شروع میں صوبہ سرحد کے بہت سے واقعات لکھے، ممکن ہے قاری کو یہ بے محل نظر آئیں لیکن جب تک یہ حالات ذہن میں نہ ہوں تب تک بادشاہ خان نے جنگ آزادی میں جو خدمات کی ہیں، اُن کا اندازہ ہو سکتا ہے نہ اُن کی صحیح قدر و قیمت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

صوبہ سرحد میں بڑے بڑے امیر پٹھان خاندان تھے لیکن تعلیم کا بالکل رواج نہیں تھا۔ خان بہرام خان برادرز کے والد پہلے خان تھے جنہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو تعلیم دلائی۔ بڑے بھائی ہندوستان میں تعلیم مکمل کر کے لندن گئے اور وہاں انہوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ یہ بھی

انگلینڈ بغرض تعلیم جانا چاہتے تھے لیکن والدہ کے منع کرنے پر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ بادشاہ خان نے مشن اسکول میں داخلہ لیا۔ اس مشن سکول کی تعلیم نے اُن کی زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ گو کہ انہوں نے علی گڑھ میں بھی کچھ عرصہ تک تعلیم حاصل کی لیکن مشن اسکول نے اُن کے دل میں قوم وطن و انسان کی خدمت کا جذبہ پیدا کر دیا اور اتنا مضبوط کر دیا جو ساری زندگی قائم رہا۔ بادشاہ خان اپنے ہیڈ ماسٹر مسٹر ایم۔ آئی۔ وکرم سے جو پادری بھی تھے، حد سے زیادہ متاثر تھے۔ ابھی مشن اسکول میں پڑھ رہے تھے کہ فوج میں اُن کو ڈسٹرکٹ کمیشن مل گیا جو اُس وقت بڑی بات تھی۔ بادشاہ خان نہایت حسین سوا چھ فٹ کے جوان تھے اور فوجی ملازمت کے لئے موزوں تھے۔ فوجی ملازمت میں بخوشی داخل ہوئے تھے۔ لیکن ایک واقعہ نے اُن کی زندگی کا رُخ موڑ دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ بادشاہ خان جس رسالہ میں تھے، اُسی کا ایک رسالدار جو اُن کا دوست تھا، پشاور میں ایک جگہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے اُسی رسالہ کا ایک انگریز لیفٹیننٹ کا گذر ہوا، رسالدار ننگے سر تھا اور بال فیشن ایبل تھے۔ اس انگریز نے رسالہ دار کے بالوں کا جب یہ فیشن دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا، ''ویل ڈیم سردار صاحب تم بھی انگریز بننا چاہتا ہائے''۔ یہ سُن کر رسالدار کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس میں اتنی جرات نہ تھی کہ جواب دیتا۔ بادشاہ خان کو اپنی ذلت محسوس ہوئی اور فوراً انگریزی فوج کی ملازمت چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا جس میں سوا ذلت اور کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے فوجی ملازمت چھوڑ دی جس کی وجہ سے اُن کے والد بہت دنوں تک ناراض رہے۔ اِدھر فوجی ملازمت چھوڑ دی، اُدھر سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ 1910ء میں مولوی عبدالعزیز کے ساتھ مل کر ایک قومی و اسلامی مدرسہ عثمان زئی میں کھولا، اسی طرح صوبہ بھر میں مدرسے کھل گئے۔ بہت سے پٹھان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اُس زمانہ میں مولوی ظفر علی کا اخبار ''زمیندار'' مولانا آزاد کا ''الہلال'' بجنور کا ''مدینہ'' دنیائے صحافت میں بہت مشہور تھے۔ یہ تینوں اخبار منگوا کر خود بھی پڑھتے اور لوگوں کو بھی سناتے جس کی وجہ سے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جو لوگ ''الہلال'' ''البلاغ'' منگواتے تھے، اُن کے نام پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی اپنے پاس درج کر لیتی تھی۔ وہ آدمی مشتبہ سمجھے جاتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران یہ سب مدرسے بند ہو گئے۔ جب 1918ء میں یہ جنگ ختم ہوئی تو ہندوستانی بجا طور پر اُمید کرتے تھے کہ دورانِ جنگ ہندوستان نے جو قربانیاں دی تھیں، اُن کے

صلہ میں اُن کو کچھ حقوق ملیں گے۔ حقوق تو درکنار، ہندوستان کے سر پر رولٹ ایکٹ کی تلوار لٹکادی گئی جس کے جواب میں پورے ہندوستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اِس ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوگیا۔ صوبہ سرحد میں خاموشی نہ رہ سکی بلکہ بادشاہ خان کی قیادت میں پٹھان بھی اِس ایجی ٹیشن میں کود پڑے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اُس وقت تک انڈین نیشنل کانگریس سے اُن کا کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ پٹھان اپنے طور پر جدوجہد کرنے لگے۔ اِس ایکٹ کے خلاف جب دوسرا جلسہ عام ہوا تو اُس میں تقریباً ایک لاکھ لوگ شریک ہوئے۔ یہ جلسہ صوبہ سرحد کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِن جلسوں نے پٹھانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کردی۔ انگریز چونکہ افغانستان کے جھگڑے میں اُلجھ چکا تھا اُس نے گھبرا کر صوبہ سرحد میں مارشل لاء کا نفاذ کردیا۔ بادشاہ خان اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار کرلئے گئے۔ انگریز کی بربریت بھی دیکھ لیجیے۔ بادشاہ خان اُس وقت انتہائی تندرست تھے۔ اُن کے پاؤں میں کوئی بیڑی فٹ نہ ہوتی مگر سب سے بڑی بیڑی زبردستی ڈال دی گئی جس کی وجہ سے پاؤں زخمی ہوگئے لیکن انہوں نے ایک ستیہ گرہ کی شان سے اِس کو برداشت کرلیا اور زبان سے کچھ نہ کہا، ایک تنہائی کی کوٹھری میں بند کردیئے گئے۔ دوسرے دن پیشی تھی۔ پولیس آئی لیکن زخمی پنڈلی کی وجہ سے پیدل کچہری نہ جاسکے۔ انسپکٹر نے طعنہ دیتے ہوئے کہا "جلسے تو کرسکتے ہو مگر پیشی میں نہیں جاسکتے۔" پولیس مجبوراً سواری پر لے گئی۔ تین انگریز ججوں کے سامنے پیش کیے گئے۔ ایک انگریز نے عجیب سوال کیا...... "تم حکومت کے خلاف لوگوں میں گھوما پھرا کرتے ہو" بادشاہ خان نے جواب دیا...... "جن لوگوں کے پیچھے گھوما کرتا ہوں، وہ سب کے سب تمہارے وفادار ہیں۔" اِس کے بعد جیل بھیج دیئے گئے۔ اُن لوگوں کی گرفتاری کے بعد عثمان زئی کو فوج نے گھیر لیا۔ سب کو مدرسہ کے میدان میں جمع کیا اور توپوں کا رُخ اُن کی طرف کردیا، ہر پٹھان کی نگاہوں میں موت گھومنے لگی، انگریز فوجوں نے توپوں کے کھٹکے ٹھیک کرنا شروع کردیئے۔ پورے مجمع کو یقین ہوگیا کہ اب توپ سے اُڑائے جائیں گے۔ انہوں نے دعائیں پڑھنا شروع کردیں لیکن یہ سب ناٹک ڈرانے دھمکانے کے لیے تھا، توپیں تو نہیں چلیں لیکن فوجیوں نے پورے گاؤں کو لوٹ لیا، تیس ہزار روپے اجتماعی جرمانہ کیا گیا۔ لیکن پولیس اور خان بہادر عمر خان نے ایک لاکھ سے زیادہ وصول کیا۔ بادشاہ خان کے یہاں سے جو کچھ پایا، لوٹ لیا، اُن کے یہاں سے ایک انگریز ایک شکاری بندوق اُڑا لے گیا۔ ایک سو پچاس آدمی گرفتار کر

لئے گئے جن میں سے سو آدمیوں کو جرمانہ ادا ہو جانے تک جیل میں بند کر دیا گیا۔ چھ مہینے کے اندر سب رہا کر دیئے گئے۔ یہ پہلی آزمائش تھی۔ اس میں کامیابی سے پٹھانوں میں سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

جب پٹھانوں میں سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہو گئی تو بادشاہ خان اور اُن کے ساتھیوں نے پٹھانوں کی جہالت کی طرف توجہ دی۔ 1921ء میں عثمانی زئی میں قاضی عطا اللہ میاں، احمد شاہ، حاجی عبدالغفار خان، خان محمد عباس خان، عبدالاکبر خان، تاج محمد خان، عبداللہ شاہ اور خادم محمد اکبر خان کے تعاون سے بادشاہ خان نے ایک آزاد ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ یہ اسکول نہ تھا بلکہ انگریز کے لئے چیلنج تھا۔ انہوں نے اس کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ انگریز یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر پٹھان میں تعلیم پھیل گئی تو برطانوی مفاد پر سیدھے چوٹ پڑے گی۔ دوسری طرف بادشاہ خان اور اُس کے ساتھی خوب جانتے تھے کہ پٹھانوں کی ساری تباہی و بربادی اور غلامی اُن کی جہالت کی وجہ سے تھی۔ حکومت اور بادشاہ خان کی پارٹی سے کشمکش جاری تھی۔ حکومت نے ہر اوچھا ہتھیار استعمال کیا تاکہ یہ اسکول بند ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جتنی ہی مخالفت بڑھتی گئی، اسکول دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اس اسکول کے کھلے ابھی صرف چھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ چیف کمشنر نے بادشاہ خان کے والد کو طلب کیا اور کہا ''دیکھو سب لوگ آرام سے بیٹھے ہیں اور تمہارا یہ لڑکا گاؤں گاؤں میں پھر رہا ہے دورے کر رہا ہے اور مدرسہ کھول رہا ہے۔ جب دوسرے لوگ نہیں بولتے تو تم بھی مہربانی کر لو اور اپنے لڑکے سے کہہ دو کہ وہ بھی اپنے گھر میں آرام سے بیٹھ جائے۔''

جب بادشاہ خان کے والد گھر آئے تو الگ جا کر بادشاہ خان سے وہ باتیں کہہ دیں جو پولیس کمشنر نے کہیں تھیں اور سمجھایا ''بچے آرام سے بیٹھو، جب دوسرے لوگ کچھ نہیں کرتے تو تم بھی مت کیا کرو، انگریز بھی کیا مکار قوم ہے، اپنے مفاد کے لئے باپ بیٹے میں اختلاف کرا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' خان بہرام خان بڑے نیک، سادہ لوح اور مذہبی آدمی تھے۔ بادشاہ نے اُن سے عرض کیا ''اگر تمام لوگ نماز نہ ادا کریں تو ابا جان آپ مجھے یہ حکم نہ دیں گے کہ میں بھی نماز ترک کر دوں۔'' خان بہرام خان نے جواب دیا ''واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، نماز تو ایک ضروری فرض ہے۔'' تب بادشاہ نے عرض کیا ''بس جس طرح نماز ایک ضروری فرض

ہے، اُسی طرح علم اور قوم کی خدمت بھی فرض ہے۔'' اس کے سننے کے بعد خان بہرام خان نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا..... ''اچھا اگر یہ فرض ہے تو کرتے رہو، یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے اور لاٹ صاحب کو جواب دیا..... ''صاحب ہم تمہارے لئے اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتے۔'' قاری کو یہ سطریں پڑھنے کے بعد اُن پٹھانوں کی سادہ لوحی کا اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔

اسکول کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد گاؤں گاؤں پیدل دورے کرنا شروع کر دیئے۔ جو مدرسے دوران جنگ میں بند ہو گئے تھے۔ اُن کو پھر کھلوایا گیا۔ ایک ایک گاؤں میں لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ اُنہیں دوروں سے پٹھانوں میں نئی زندگی پیدا ہونے لگی۔ حکومت پہلے ہی چوکنا تھی۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور دسمبر 1921ء میں بادشاہ خان کو دفعہ F.C.R40 کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ نیک چلنی کی ضمانت مانگی گئی۔ قاری کو اس نیک چلنی سے غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ انگریزی لغت میں نیک چلنی سے بے چوں وچرا اس غلامی پر راضی رہنا مراد ہے۔ بادشاہ خان نے ضمانت دینے سے انکار کیا اور اُن کو تین سال قید کی سزا دے دی گئی۔ اُس زمانہ میں جب کوئی جیل جاتا تھا تو اُس کو تنہائی کی کوٹھری میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اُس کے پاؤں میں بیڑی گلے میں ایک لوہے کی ہنسلی جس میں ایک لکڑی کی تختی لگی رہتی تھی جس پر قیدی کے جرم کی دفعہ اور میعاد لکھی ہوتی تھی۔ بادشاہ خان ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش کیے گئے۔

یہ انگریز بھی عجیب چیز تھا اور مقدمہ بھی عجیب وغریب تھا۔ اُس نے پولیس سے بادشاہ خان کا جرم دریافت کیا تو پولیس نے بتایا ..... ''اُس (بادشاہ خان) نے ایک تو ہجرت کی اور دوسرے آزاد اسکول قائم کیا۔'' ڈپٹی کمشنر نے پولیس سے پوچھا..... ''جب اُس نے ایک مرتبہ ہجرت کی تو پھر اُس کو اِس ملک میں کیوں آنے دیا گیا؟'' بادشاہ خان نے دُکھتی ہوئی رگ پکڑ لی اور کہا..... ''ایک تو تم نے ہمارا ملک لے لیا اور اب اُس میں ہمیں رہنے بھی نہیں دیتے۔'' یہ بات سن کر ڈپٹی کمشنر آگ بگولہ ہو گیا اور پولیس کو حکم دیا..... ''اِس کو یہاں سے دُور کرو۔ میں نے اِس کو تین سال کی سزا دی۔'' خدارا انصاف سے کہیے، اِس طرح کی عدالت آپ نے کہیں دیکھی ہے۔ یہ اُس قوم کی عدالت ہے جو ہمارے ملک میں تہذیب پھیلانے آئی تھی، جس کی پشت پر یورپ کی تہذیب وتمدن کی گٹھڑی لدی ہوئی تھی۔

بادشاہ خان نے مختلف جیلوں میں اپنی سزا کاٹی۔ جب اُن کی رہائی میں چند دن رہ گئے تو

اسکول والوں نے اُن کے استقبال کی تیاری زور وشور سے شروع کردی۔حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ بادشاہ خان کا استقبال ہو ورنہ پروپیگنڈا ہوگا،اِس لئے مقررہ تاریخ سے چند دن پہلے ہی رہا کر دیا اور پولیس کی گاڑی اُن کو اُن کے گاؤں میں لا کر چھوڑ گئی لیکن اسکول والوں نے اسکول کے سالانہ جلسے کی تاریخ بدل دی اور بڑے جوش وخروش سے جلسہ ہوا جس میں صوبہ سرحد سے ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔بادشاہ خان نے اِس جلسہ میں تقریر کی اور ایک شیر کا قصہ سنایا۔آپ بھی انہی کی زبانی سنیئے۔

''ایک شیرنی تھی۔اُس نے بھیڑوں کی ریوڑ پر حملہ کر دیا۔وہ حاملہ تھی۔ حملہ کے دوران بچہ پیدا ہوا اور وہ خود مر گئی اور اُس کا یہ بچہ ایک بھیڑ نے اپنے پیچھے لگا لیا۔شیر کا بچہ انہی بھیڑوں کے ریوڑ میں پلا اور بڑا ہوا۔اُس نے بھیڑوں کی عادتیں اور خصلتیں سیکھ لیں۔وہ بھیڑوں کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا اور چرتا رہا۔ایک دن ایک شیر اُدھر آ نکلا اور اُس نے اُن بھیڑوں پر حملہ کر دیا۔حملے کے وقت شیر نے دیکھا کہ اِن بھیڑوں میں شیر کا بچہ بھی ہے اور وہ بھی اس سے ڈر کر بھیڑوں کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اور بھیڑوں کے مانند بھیں بھیں کر رہا اور بھیڑ کا سا ڈرپوک ہے۔وہ شیر بچے کے قریب آیا اور اُس نے شیر کے بچے کو بھیڑوں سے علیحدہ کر لیا۔پھر اُسے ایک تالاب پر لے گیا تا کہ وہ پانی کے اندر اپنا منہ دیکھ لے اور اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ بھیڑ نہیں ہے بلکہ شیر ہے۔شیر کے بچہ نے جب پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اُس سے حملہ آور شیر نے کہا..... ''ارے کیا دیکھتا ہے،تو بھیڑ نہیں شیر ہے۔بھیں بھیں مت کر شیر کی طرح دہاڑ۔'' پھر کیا تھا اُس شیر کے بچے کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ زور زور سے دہاڑنے لگا۔ جنگل کانپ اُٹھا اور بھیڑوں کا ریوڑ تو کیا بڑے بڑے جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔یہ قصہ سنا کر میں نے گرج کر کہا...... ''اے پختونوں میں بھی کہتا ہوں کہ تم بھیڑیں نہیں ہو،تم شیر ہو،غلامی میں پلنے کی وجہ سے تم اپنی حقیقی طاقت کو بھول گئے ہو۔اپنے آپ کو پہچانو اور بھیں بھیں مت

کرو اور شیروں کی طرح گرجو۔"

صوبہ سرحد میں ایک بھی قومی اخبار نہ تھا۔ بادشاہ خان نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد 1928ء میں "پشتون" نامی اخبار نکالا۔ اس اخبار کے ذریعہ بادشاہ خان اپنے خیالات عوام تک پہنچاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ اخبار ہر دل عزیز ہوگیا۔ صوبہ سرحد میں اِس اخبار کو وہ درجہ حاصل تھا جو ہندوستان میں قبل آزادی گاندھی جی کے اخبار "ہریجن" کو حاصل تھا۔ دنیا کے جس حصہ میں پشتون رہتے تھے، وہ اُسے منگواتے اور پڑھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ امریکہ میں بھی پشتون منگواتے تھے اور بڑی مالی امداد دیتے تھے۔ تحریک آزادی کے زمانے میں انگریز بہادر نے موقع پا کر اِس کو بند کر دیا۔ اِس اخبار کی مختصری زندگی بھی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔

صوبہ سرحد کے لوگوں کو افغانستان سے بڑی ہمدردی تھی۔ امان اللہ خان کے ملک بدر ہو جانے کا پٹھانوں کو بڑا صدمہ تھا کیونکہ اُن کی طرف سے سرحدی پٹھانوں کو بڑی مدد ملتی تھی۔ جب نادر خان افغانستان میں کامیاب ہوئے اور اپنی کامیابی کا تار بادشاہ خان کو دیا تو یہاں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اِس فتح کی خوشی میں عثمان زئی میں عظیم الشان جلسہ ہوا۔ بادشاہ خان نے معرکہ کی تقریر کی۔ پٹھانوں سے کہا..... "دنیا میں قوموں کی ترقی کے صرف دو ہی راستے ہیں۔ "ایک مذہب نہیں ہے، مگر قومیت کا جذبہ تو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آسمان تک جا پہنچے ہیں اور ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ وہ آباد ہو گئے اور ہم برباد ہو گئے۔ اپنی اور اُن کی زندگی کا موازنہ کرو۔ ہماری تباہی و بربادی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم میں نہ مذہب ہے اور نہ قومیت۔ اِسی لئے میں اِس بات پر زور دیتا ہوں کہ اگر تم پہلے ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہو تو اِس انفرادی زندگی کے بجائے قوم کے اندر اجتماعی زندگی پیدا کرو، اِس کے بغیر قومیں ترقی نہیں کر سکتیں۔" اِس جلسہ عام کا عوام پر بڑا اثر ہوا اور چند پٹھان بادشاہ خان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وہ قوم کی اصلاح اور خدمت کے لئے ایک جماعت بنانا چاہتے ہیں۔ صلاح و مشورہ کے بعد پٹھانوں نے خدائی خدمت گار تحریک کی ابتداء کی جو پہلے ایک سوشل تحریک تھی۔ اِس تحریک کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، لیکن انگریزوں کے ظلم و ستم نے اِس کو سیاست کی گود میں دھکیل دیا، بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود انگریز نے پٹھانوں کو کانگریس سے ملا دیا۔

پٹھانوں میں پارٹی بازی، باہمی دشمنی، بغض و عناد، بری رسمیں، آپسی جھگڑے اور فساد بھی

خوب چلتے تھے۔ جو کچھ وہ کماتے تھے، وہ سب جھگڑے، فساد اور مقدمہ بازی کی نذر کر دیتے تھے، خود اسی طرح بھوکے ننگے اور مفلس رہ جاتے تھے، نہ تجارت کرتے تھے نہ زراعت، میں دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کاموں کے لئے اُن کو فرصت ہی کہاں تھی۔ بالآخر بڑے غور و فکر کے بعد 1929ء میں پٹھانوں نے خدائی خدمت گار جماعت بنائی۔ اِس جماعت کا نام بھی ایک خاص غرض سے رکھا۔ کیونکہ پٹھانوں میں ہم لوگ خدا کے واسطے اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کا خیال اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے، دوسری خاص وجہ یہ تھی کہ پٹھانوں میں تشدد بھرا ہوا تھا، اور یہ تشدد ہمیشہ اپنے بھائی بندوں کے خلاف استعمال ہوتا تھا، اُن کی پوری زندگی تباہ و برباد رہتی تھی، اِس جماعت کی ممبری کے لئے چار شرائط کا حلف لینا پڑتا تھا۔

1- میں خدائی خدمت گار ہوں اور چونکہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں لہٰذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ لہٰذا میں خلقِ خدا کی خدمت بغیر کسی غرض و مطلب صرف خدا کے واسطے کروں گا۔
2- میں تشدد نہیں کروں گا اور نہ کسی سے انتقام یا بدلہ لوں گا، مجھ پر کوئی چاہے کتنی ہی زیادتی کرے، میں اُسے معاف کر دوں گا۔
3- میں باہمی پھوٹ، گروہ بندی اور دشمنی و خانہ جنگی سے دُور رہوں گا اور ہر ایک پختون کو اپنا بھائی دوست سمجھوں گا، میں بری رسم و رواج چھوڑ دوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا اور نیک کام کروں گا اور برائیوں سے جان بچاؤں گا اور یہ کہ میں اپنے اندر اچھے اخلاق و عادت پیدا کروں گا، میں بیکار کی زندگی نہیں بسر کروں گا۔
4- ہر خدائی خدمت گار کو یہ حلف بھی لینا پڑتا تھا کہ چاہے وہ امیر ہوں یا غریب دن میں دو گھنٹہ جسمانی مشقت سب کو کرنا پڑے گی۔

اصول بنا لینا ایک طرف لیکن اُن پر اس طرح عمل کرنا کہ دشمن بھی قائل ہو جائے۔ یہ شرف صرف خدائی خدمت گاروں کو حاصل ہو سکا۔

ہم دعویٰ سے کہہ سکتے تھے آج تک دنیا میں کوئی جماعت ایسے اُصولوں پر نہیں بنائی گئی۔ ایک اصول سے بادشاہ خان کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ 1929ء ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑی اہمیت کا سال ہے۔ اسی سن میں سرحد کے پٹھانوں نے ایک جماعت بنائی جو

آگے چل کر ساری دنیا میں مشہور ہوگئی جس نے جنگ آزادی میں معجزہ دکھایا۔عدم تشدد کو اِس شان سے برتا کہ دنیا انگشت بدندان رہ گئی۔

دسمبر 1929ء میں لاہور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں صوبہ سرحد کے بہت سے لوگ شریک ہوئے، پٹھانوں نے جب یہ دیکھا کہ وہاں مردوں کا کیا ذکر،لڑکیاں بڑی مستعدی سے کام کر رہی ہیں تو اُن پر بڑا اثر ہوا۔اِس اجلاس کو دیکھ کر صوبہ سرحد کے تمام لوگ اکٹھے ہوئے اور آپس میں طے کیا کہ ہم کو بھی ملک وقوم کی خدمت پر کمر کس لینا چاہیے۔

یہ جذبہ کانگریس کا اجلاس دیکھ کر پیدا ہوا۔دوسری بات یہ ہوئی کہ اسی اجلاس میں کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا تھا۔اُس کا بھی پٹھانوں پر بڑا گہرا اثر ہوا۔

لاہور سے جب یہ لوگ واپس آئے تو انہوں نے بڑے زور وشور سے کام کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ خان معہ اپنے ساتھیوں کے گاؤں گاؤں پھرتے تھے، جلسے کرتے تھے، جرگے بناتے تھے اور خدائی خدمت گار بھرتی کرتے تھے۔ یہ تحریک بہت جلد پورے صوبے میں پھیل گئی اور آزاد علاقہ تک پہنچ گئی۔ جس گاؤں میں یہ لوگ جاتے تھے،وہاں فوراً جرگہ بن جاتا تھا اور لوگ خدائی خدمت گار بن جاتے تھے۔ اس تحریک سے سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ پٹھانوں کے دل سے انگریزی حکومت کا خوف جاتا رہا۔اُن کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوگئی۔ جب یہ لوگ دورے پر نکلتے تھے تو پولیس، سی آئی ڈی کبھی کبھی انگریز بذاتِ خود اِن جلسوں کو دیکھنے آجاتے تھے اور سب کو حیرت تھی کہ بادشاہ خان نے آخر کیا جادو کر دیا کہ پٹھان نے اپنی فطرت بدل ڈالی۔

جیسے جیسے یہ تحریک بڑھتی جاتی تھی ،ویسے ویسے انگریز کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا جاتا تھا لیکن حکومت کی یہ مجبوری تھی کہ ایسی پر امن وشائستہ جماعت کو روکیں کیسے۔ آخر میں مجبور ہو کر چیف کمشنر نے بادشاہ خان کے نام حکم جاری کر دیا..... ''یہ تم نے کیا سلسلہ ملک میں جاری کر رکھا ہے، اسے فوراً بند کر دو''۔بادشاہ خان نے کہا یہ تو ایک سوشل تحریک ہے،سیاسی نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں، ملک کی سرکار کو کرنا چاہیے،یہ کام تو حکومت کے کرنے کا ہے،آپ کے کرنے کا ہے،اب اگر آپ کا یا حکومت کا کام ہم کر رہے ہیں تو آپ کو اِس کام میں میری مدد اور تعاون کرنا چاہیے، چیف کمشنر نے کہا.... میں مانتا ہوں یہ سوشل کام ہے اور اگر تم اُن پٹھانوں کو بھی منظم کر لو تو پھر اِس کی دلیل اور ضمانت ہے کہ تم انہیں ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے۔

اب تک سیدھی ٹکر یا خدائی خدمت گاروں کے امتحان کی نوبت نہیں آئی تھی۔ انگریز کی بوکھلاہٹ نے یہ موقع بھی فراہم کر ہی دیا۔ اپریل 1930ء میں عثمان زئی میں خدائی خدمت گاروں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کے بعد بادشاہ خان، میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان، سالاسرفراز خان، حاجی شاہ نواز خان جو جلسہ کے منتظم تھے، سب پشاور جارہے تھے کہ نا کی تھانہ کی حدود میں گرفتار کر لئے گئے۔ اِن گرفتاریوں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ پورے صوبہ سرحد میں آگ سی لگ گئی۔ اِن لوگوں کے ساتھ کوئی خدائی خدمت گار رضا کار نہیں تھا۔ لیکن یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ نا کی تھانہ کے لوگوں نے جب یہ گرفتاریاں دیکھیں تو آگ بگولا ہو گئے اور کہنے لگے ''حکومت نے بادشاہ خان کو ہماری سرحد میں گرفتار کر کے ہماری بڑی توہین کی ہے۔'' انہوں نے اس غم وغصہ کا جواب ایسے شائستہ طریقے سے دیا جو بادشاہ خان کی ہر دل عزیزی اور تعلیم کا آئینہ دار ہے۔ سب نے خدائی خدمت گاری کا اعلان کر دیا۔ سب نے سرخ کپڑے پہن لئے۔ چارسدہ میں ہزاروں نے حوالات کو گھیر لیا۔ چونکہ اُن کو عدم تشدد کی تعلیم دی گئی تھی اور ڈاکٹر خان صاحب بھی موقع پر پہنچ گئے تھے اس لئے کوئی بدنما صورت نہ پیدا ہو سکی۔ اُسی دن پشاور میں بہت سے خدائی خدمت گار گرفتار کر لئے گئے اور ایک عظیم تاریخ ساز حادثہ پیش آیا جس کی مثال جنگ آزادی کی تحریک میں نہیں ملتی۔

کانگریس نے صوبہ سرحد کے حالات کی جانچ پڑتال کے لئے وٹھل بھائی پٹیل کی قیادت میں ایک انکوئری کمیٹی بنادی تھی۔ اُس کی رپورٹ سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> 5-اپریل 1930ء کو مقامی کانگریس کمیٹی نے شراب کی دوکان پر پیکٹنگ کرنے کا اعلان کیا۔ کچھ شراب فروشوں نے کانگریس کمیٹی کو درخواست دی کہ پندرہ دن کی مہلت دے دی جائے تاکہ اِس درمیان وہ اپنا مال بیچ دیں۔ کانگریس کمیٹی نے دوکان دار سے کہہ دیا کہ وہ 23اپریل سے پیکٹنگ شروع کریں گے۔ 22-اپریل کی صبح آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ڈپوٹیشن اٹک کے پُل پر روک دیا گیا اور اُس کو صوبہ سرحد میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ جب پشاور میں یہ خبر پہنچی تو عوام کے غصہ کی حد نہ رہی اور اُسی دن شام کو شاہی باغ میں اس حکم کے خلاف پروٹسٹ کرنے کے

لئے ایک بڑا جلسہ عام ہوا، اسی جلسہ میں 23- اپریل سے پیکٹنگ کا اعلان کر دیا گیا، منہ اندھیرے حکام نے کانگریس کے ہم نوا لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ صبح کو جب لوگ کانگریس آفس میں جمع ہوئے تو معلوم ہوا کہ دو اور لیڈروں کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ پیکٹنگ کے انتظامات ہو رہے تھے۔ پورے شہر میں مکمل ہڑتال خود بخود ہو گئی۔ 9 بجے صبح کو جب کثیر مجمع رضا کاروں کو رخصت کرنے کے لئے جمع ہو گیا تو اتنے میں ایک سب انسپکٹر پولیس بمعہ پولیس لاری آ گیا۔ جیسے ہی اِن دونوں لیڈروں کو معلوم ہوا، وہ فوراً آ گئے اور پولیس کی لاری میں بیٹھ گئے۔ اتفاق سے لاری ہو گئی۔ سب انسپکٹر دوسری لاری لانا چاہتا تھا کہ اِن گرفتار لیڈروں نے کہا ...... ہم خود ہی تھانہ آ جائیں گے، انسپکٹر چلا گیا۔ اِن دونوں لیڈروں کو لے کر جلوس کی شکل میں عوام تھانے کی طرف بڑھے۔ کابلی گیٹ تھانہ کا پھاٹک بند تھا۔ اتنے میں ایک انگریز اسسٹنٹ کپتان پولیس گھوڑے پر آیا، عوام نے قومی نعرے لگائے اور یہ غصہ میں واپس چلا گیا، جس انسپکٹر نے لیڈروں کو گرفتار کیا تھا، اِس نے مجمع سے کہا کہ وہ پُر امن طریقے سے تتر بتر ہو جائے، دونوں لیڈر تھانہ کے اندر چلے گئے۔ مجمع انقلاب زندہ باد اور گاندھی جی کی جے کے نعرے لگاتا ہوا تتر بتر ہونے لگا۔ اِسی اثناء میں دو تین مسلح کاریں بڑی تیزی سے بغیر کسی کی پروا کئے مجمع پر چڑھ گئیں جس کی وجہ سے کچھ لوگ زخمی ہو گئے اور کچھ موقع پر ہی مر گئے۔ مجمع نے بڑی ضبط سے کام لیا۔ نہ لاٹھی، نہ کلہاڑی، نہ اینٹ، نہ پتھر، کچھ لوگوں نے زخمیوں اور لاشوں کو اُٹھانا شروع کر دیا۔ کچھ مسلح کاروں کے سامنے پہنچ گئے اور اُن سے کہا کہ وہ گاڑی گھما کر واپس جائیں۔ گاڑیاں گھمائی جا رہی تھیں ..... کہ ایک انگریز موٹر سائیکل پر بڑی تیزی سے آیا، اُس کی موٹر سائیکل گھومتی ہوئی ایک مسلح کار سے ٹکرا گئی۔ وہ گر گیا اور گاڑی کے نیچے آ گیا، مسلح کار کے اندر سے کسی نے فائر کر دیا۔ اتفاق

سے ایک مسلح گاڑی میں آگ لگ گئی۔ ڈپٹی کمشنر اپنی مسلح گاڑی سے اُتر کر تھانہ جانے لگا، سیڑھیوں پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جیسے ہی ہوش آیا، اُس نے فائرنگ کا حکم دے دیا، اِس فائرنگ میں کئی آدمی مارے گئے اور کئی زخمی ہو گئے۔ مجمع کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ باہر کے لوگ بیچ میں پڑے تاکہ مزید خوں ریزی نہ ہو۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے فوج ہٹانے سے انکار کر دیا۔ اِس کے جواب میں مجمع نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد دوسری فائرنگ شروع کر دی گئی جو نہ صرف قصہ خوانی بازار تک بلکہ گلیوں میں بھی پھیل گئی۔ کئی عینی گواہوں کا بیان ہے کہ دو اور تین سو کے درمیان لوگ مارے گئے اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ خلافت کے رضا کار جو زخمیوں اور لاشوں کو اُٹھا رہے تھے، اُن میں سے پانچ یا چھ جان سے مارے گئے، بہت سی لاشیں نہ اُٹھائی جا سکیں جو لاریوں میں اُٹھا کر پولیس نے ٹھکانے لگا دیں، خلافت رضا کار اور دوسرے بہ مشکل ساٹھ لاشیں گلیوں سے اُٹھا کر خلافت آفس میں لا سکے۔ بہت سے زخمیوں کو ڈاکٹر خان صاحب نے لیڈی ریڈرنگ ہسپتال میں مرہم پٹی کے لئے بھیج دیا۔ حکومت نے زخمیوں کے لئے کوئی انتظام کیا ہی نہیں بلکہ اِس بھیانک فائرنگ پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ شام کو تقریباً چھ بجے فوج نے کانگریس آفس سے جھنڈا اور بیج ہٹا دیئے۔ رات میں فوج نے آفس سے دو لاشوں کو بھی ہٹا دیا جو وہاں لا کر رکھی گئی تھیں۔ اُس کے بعد دو تین دن تک انگریز فوج نے پشاور پر ایسے ایسے مظالم توڑے کہ وہ جہنم کا نمونہ بن گیا۔

اِسی ہنگامے میں خدائی خدمت گاروں کو اپنی ڈسپلن دکھانے کا موقع مل گیا۔ حکومت نے ایک دم سے پولیس اور فوج پشاور شہر سے ہٹا لی تاکہ قبائلی اِس کو لوٹ لیں۔ لیکن خدائی خدمت گاروں اور رضا کاروں نے پورے شہر کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور پہرہ دینے لگے۔ لوٹ مار تو بڑی چیز ہے کسی کی کوئی معمولی چیز بھی نہیں گئی۔ 28 اپریل کی رات کو پولیس آئی اور

خدائی خدمت گاروں سے اپنے شہر کا چارج لے لیا۔ 4 مئی کو ایک بار پھر فوج آگئی، کانگریس آفس پر دھاوا بول دیا، نقدی اور کاغذات اُٹھا کر لے گئی جو والنٹیئر وہاں موجود تھے، اُن کو بے رحمی سے زدوکوب کیا۔ اُس کے بعد تو پشاور میں جیسے مارشل لاء لگ گیا یا کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھے۔ 31 مئی کو جبکہ سلیمان کمیٹی تحقیقات کر رہی تھی، انگریزی فوج نے اس مجمع پر فائرنگ کر دی جو دو معصوم بچوں کو دفن کرنے کے لئے جا رہا تھا جن کو ایک گورے سپاہی نے گولی سے اُڑا دیا تھا، اِس فائرنگ میں دس آدمی مارے گئے اور بیس زخمی ہو گئے۔ پشاور میں دہشت اور بربریت کا راج تھا۔ اپنے دل ہلا دینے والے مظالم کو چھپانے کے لئے پشاور کو ساری دنیا سے الگ کر دیا گیا، نہ وہاں کی کوئی خبر باہر آسکتی تھی نہ کوئی باہر سے آسکتا تھا۔ علاوہ پشاور کے اِن تمام مقاموں پر جہاں کانگریس کا اثر تھا، یہ ظلم کی چکی چلتی رہی۔ ان تمام مظالم کے باوجود نہ تو عوام کے حوصلے پست کئے جا سکے نہ اُن کو عدم تشدد کے راستے سے ہٹایا جا سکا۔''

ہم نے پہلے تاریخ ساز حادثے کا ذکر کیا ہے۔ اُس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

''پشاور کے قصہ خوانی بازار میں حکومت نے بے تحاشہ فوج استعمال کی لیکن گڑھوالی فوج جس کی وفاداری ضرب المثل ہے، اُس کے ایک بٹلیون نے پرامن اور غیر مسلح مجمع پر فائرنگ سے انکار کر کے پوری سلطنت برطانیہ میں مثال قائم کر دی۔ اس سلطنت کی وسعت سب ہی جانتے ہیں، لاتعداد مقاموں پر پولیس اور فوج نے فائرنگ کی، لیکن خدائی خدمت گار اس آن بان سے جان دینے لگے کہ فوج نے خود ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ فوج کا انکار تھا بلکہ تشدد کا عدم تشدد کے سامنے شکست کھا جانا تھا، اِس حادثہ نے ثابت کر دیا کہ عدم تشدد بزدلوں کا نہیں بلکہ بہادروں کا ہتھیار ہے، گاندھی جی کے ایسے عدم تشدد کے علمبردار نے خود تسلیم کر لیا ''میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ عدم تشدد بہادروں کا ہتھیار ہے اور پٹھان ہندوستان میں ۔ سب زیادہ بہادر ہیں۔''

ان فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا، مارشل لاء میں مقدمہ چلا۔ چندن سنگھ گڑھوالی کو بیس برس اور باقی لوگوں کو پندرہ سے لے کر تین سال تک سزائیں ہوئیں۔ ان کا کورٹ مارشل کا بیان یہ ہے:

رہے گا...... ''ہم کبھی اپنے نہتے بھائیوں پر گولی نہیں چلائیں گے، ہندوستانی فوج باہر کے دشمن سے لڑنے کے لئے ہے۔ تمہارا جی چاہے ہم کو توپ سے اُڑا دو۔''

خدائی خدمت گار کا الحاق انگریز نے خود کانگریس سے کرا دیا۔ بادشاہ خان اور اُن کے ساتھی گجرات جیل میں بند تھے۔ انگریز نے صوبہ سرحد کو خود کچل ڈالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسے ایسے مظالم توڑے جن کو دیکھ کر چنگیز و ہلاکو اور ہٹلر کو بھی شرم آ جائے...... ادھر صوبہ جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ اِدھر بادشاہ خان کے دو ساتھی بہ ہزار خرابی دریائے سندھ کو پار کر کے گجرات جیل میں ملاقات کے لئے پہنچ گئے۔ بادشاہ خان کی ملاقات بند تھی لیکن دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ صوبہ سرحد کے حالات بتائے، انہوں نے بتایا کہ تحریک کو چھوڑیئے، انگریز پٹھان کے بچے بچے کو مٹا دینا چاہتا ہے، جس وقت بادشاہ خان اور اُن کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے گجرات جیل میں بند کیا گیا تھا۔ اُس وقت یہ فوج پہنچ گئی، اُس نے اتمان زئی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سب سے پہلے فوجی جوان خدائی خدمت گاروں کے دفتر پر چڑھ دوڑے۔ دوسری منزل کے اوپر سے جہاں دفتر تھا، خدائی خدمت گاروں کو نیچے پکی سڑک پر پھینک دیا جس سے بہت سے زخمی ہو گئے۔ ولی خان جس کی عمر اُس وقت چودہ یا پندرہ سال کی تھی، ڈپٹی کمشنر نے اُن سے پوچھا...''تم کون ہو؟'' اُس نے بتا دیا، ایک گورے سپاہی نے اپنی سنگین اُن کے گھونپنا چاہی، ایک مسلمان صوبے دار نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، اِس صوبے دار نے ولی خان کو کوٹھے سے نیچے سہارے سے اُتار دیا۔ فوج نے دفتر میں آگ لگا دی، سب کچھ جلا دیا، پھر فوج نے گاؤں کا رُخ کیا، جتنے لوگ سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے، اُن کو بری طرح مارا پیٹا اور گرفتار کر لیا۔ اِس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے لوگوں سے مخاطب ہو کر بڑے غصہ اور غرور سے کہا...... ''اب بھی کوئی سرخ پوش باقی ہے''۔ ڈر کے مارے کسی کی زبان نہ کھلتی تھی، اتنے میں اُسی گاؤں کے خان محمد عباس خان جو وہاں کھڑے تھے، ڈپٹی کمشنر کی یہ بات سُن کر بھاگے ہوئے گھر گئے۔ ایک برتن میں سرخ رنگ گھولا، اپنے نوکروں کے کپڑے سرخ رنگے، ابھی کپڑوں سے رنگ ٹپک رہا تھا کہ آ کر کھڑے ہو گئے، محمد عباس خان باقاعدہ خدائی خدمت گار بھی نہ تھے۔ بلکہ بادشاہ خان سے کچھ ملال بھی تھا، گرفتار ہو گئے لیکن اُن کی اس جرات اور قربانی نے پٹھانوں کے اندر وہ دلیری پیدا کر دی کہ انگریزوں کے بے انتہا ظلم اور تشدد کے باوجود سرخ کپڑے ختم نہ ہوئے بلکہ اُن میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اتمان زئی

کے تاریخی جلسہ کے وقت خدائی خدمت گاروں کی تعداد صرف پانچ سو تھی لیکن جب بادشاہ خان چھوٹ کر آئے ہیں تو اُن کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ چکی تھی، واقعہ تو یہ ہے کہ انگریز خود ہی نادانستہ اس تحریک کا پروپیگنڈا کرتے تھے، وہ فوج لے کر گاؤں کو گھیر لیتے تھے، سب کو باہر نکال کر ایک جگہ بٹھا دیتے تھے، شاباش تم انگوٹھا لگا دو، وہ بے چارے کہتے تھے ہم خدائی خدمت گار نہیں ہیں اور واقعی وہ تھے بھی نہیں، لیکن انگوٹھا کوئی نہ لگاتا تھا، انگریز کے اِس سلوک کا صوبہ بھر میں ایسا اثر ہوا کہ اگر کسی نے انگوٹھا لگا دیا تو عورتیں اور بچے تک اُسے ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بادشاہ خان کے گاؤں میں ایک پٹھان نے انگوٹھا لگا دیا، جب وہ گھر آیا تو اُس کی بیوی کپڑے دھو رہی تھی، اُس نے پوچھا ''تم کیسے آ گئے'' پٹھان نے جواب دیا ''مجھ کو انہوں نے چھوڑ دیا۔'' بیوی نے کہا ''اور لوگوں کو نہیں چھوڑا، تم کو ہی چھوڑ دیا، تم اپنا انگوٹھا تو دکھاؤ، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے انگوٹھا لگا دیا ہے۔'' انگوٹھا دیکھتے ہی عورت نے کہا ''اچھا بے غیرت انسان تو نے انگوٹھا لگا دیا ہے، میں جاتی ہوں۔'' بیوی کی اِس پھٹکار نے اُس پٹھان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے، وہ بھاگ آیا اور لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا، انگریز نے اُسے پہچان کر پوچھا ''ارے تم پھر کیوں آ گئے؟'' اُس نے جواب دیا ''صاحب میری عورت مجھے گھر میں نہیں گھسنے دیتی۔''

اسی گاؤں کے حاجی شاہ نواز خان، بادشاہ خان کے ساتھ جیل میں بند تھے۔ انہوں نے ضمانت دے دی اور چھوٹ گئے، جب گھر آئے تو لوگوں کی طعن وتشنیع سے اتنے شرمندہ ہوئے کہ اُن کی زندگی اجیرن ہو گئی اور انہوں نے خودکشی کر لی۔

بادشاہ خان کے جو ساتھی ملاقات کے لئے آئے تھے، اُن سے کہا گیا کہ وہ گاؤں واپس نہ جائیں، بلکہ یہ لاہور، دہلی اور شملہ جائیں اور ہمارے اُن مسلمان بھائیوں سے جو مسلم لیگ میں ہیں ملیں اور کہیں کہ وہ ہماری مدد کریں۔ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم دنیا کو ہماری حالت بتائیں، یہ دونوں ساتھی چلے گئے اور گجرات جیل میں پھر دو مہینے بعد ملاقات کے لئے آئے اور بتایا کہ وہ ہندوستان بھر میں مسلم لیڈروں کے پیچھے گھومتے رہے لیکن کوئی بھی ہماری امداد کو تیار نہ ہوا، ہماری لڑائی انگریز سے تھی، وہ انگریز سے لوہا نہیں لے سکتے تھے، انہیں تو انگریزوں نے ہندوؤں سے لڑانے بھڑانے کے لئے محفوظ کر رکھا تھا۔ اُس وقت تک خدائی خدمت گار کانگریس میں نہیں تھے مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے، جب یہ لوگ مسلم لیگ سے مایوس ہو گئے تو اُن ساتھیوں سے کہا کہ

تم کانگریسیوں کے لیڈروں کے پاس جاؤ۔اگر وہ ہماری مدد کریں تو اُن کا بڑا احسان ہوگا۔ وہ کانگریس کے لیڈروں سے ملے اور ہمارا پیغام پہنچادیا، کانگریس کے لیڈروں نے کہا کہ اگر پٹھان ہمارے ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہوجائیں تو کانگریس اُن کی پوری مدد کرے گی۔ کانگریسی لیڈروں کا پیغام لے کر ہمارے ساتھی پھر آ گرمے اور اُن کا پیغام پہنچایا۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ صوبے واپس جائیں۔ یہ معاملہ خدائی خدمت گاروں کے جرگے میں پیش کریں، انہوں نے جرگہ بلایا اور یہ سب باتیں سامنے رکھ دیں، جرگہ نے کانگریس کی بات منظور کرلی اور فیصلہ کیا کہ اگر کانگریس کے لیڈر ہماری مدد کرتے ہیں تو ہم خدائی خدمت گار اُن کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس میں شرکت کا اعلان کر دیا، انگریز کو جب یہ خبر ملی کہ پٹھان بحیثیت مجموعی کانگریس میں شامل ہوگئے ہیں تو اُن کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا، بادشاہ خان کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم سے صلح کرلو، جو کچھ ہم نے ہندوستان کو دیا ہے، تم کو بھی دیتے ہیں اور آئندہ جو کچھ ہندوستان کو دیں گے تم کو بھی دیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ تم کانگریس کو چھوڑ دو، یہ پیغام پانے کے بعد بادشاہ خان نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا جن میں ہندو اور سکھ بھی تھے اور انگریز کا پیغام بتا کر اُن کی رائے پوچھی۔ کچھ ساتھیوں کی رائے تھی کہ ہم کو یہ شرط منظور کر لینا چاہیے اور ڈپلومیسی سے کام لینا چاہیے، بادشاہ خان نے کہا۔ انگریز ناقابل اعتبار قوم ہے، مجھ کو اُس کی پیش کش منظور نہیں۔ ہم نے کانگریس سے وعدہ کر رکھا ہے ہم اپنا وعدہ نہیں توڑیں گے۔ چنانچہ بادشاہ خان نے حکومت کو جواب دیا کہ چونکہ تم نے ہم پر اعتماد نہیں کیا اسی لئے ہم بھی تم پر اعتماد نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد پٹھانوں نے اگست 1947ء تک کانگریس کا دامن نہیں چھوڑا۔ ہاں کانگریس کے لیڈروں نے پٹھانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جس کا حال آگے آئے گا۔

خدائی خدمت گاروں کے کانگریس میں شامل ہو جانے کے بعد کانگریس نے سرحد کے واقعات کی تحقیقات کے لئے مرکزی اسمبلی کے اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔ یہ کمیٹی جب اٹک کے پل پر پہنچی تو حکومت نے روک دیا اور صوبہ سرحد میں جانے کی اجازت نہ دی۔ کمیٹی کے لوگ راولپنڈی میں رُک گئے اور وہیں سے تحقیقات شروع کر دیں۔ اس کمیٹی نے صوبہ سرحد پر جو انسانیت سوز مظالم کئے، اُس کی ایک جامع رپورٹ تیار کرلی اور خدائی خدمت گاروں کا خوب پروپیگنڈا کیا۔ اس رپورٹ کو انگریزی حکومت نے فوراً ضبط کرلیا، لیکن اس

رپورٹ کی نقلیں کافی تعداد میں انگلینڈ اور امریکہ بھجوا دیں اور وہ شائع ہو گئیں۔ قصہ خوانی بازار کی فائرنگ کے بعد مردان ضلع کے موضع تکر میں خدائی خدمت گاروں پر پھر فائرنگ کی گئی جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ فوج و پولیس نے گھروں کو لوٹا اور جلا دیا۔ خان غلام محمد کالج کلب بھی جلا دیا، بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا، اس کے بعد ہاتھی خیل کے وزیروں کے ایک پُر امن جلسے پر فوج نے فائرنگ کر دی، بہت سے لوگ زخمی ہوئے اور مارے گئے۔ جن کو گرفتار کیا گیا، انہیں چودہ چودہ سال کی سزائیں دی گئیں۔ باوجودیکہ انگریز نے چنگیزی مظالم جاری رکھے لیکن نہ تو جلسے بند ہوئے نہ خدائی خدمت گار تحریک میں کوئی کمی آئی۔ یہ بادشاہ خان کا معجزہ تھا کہ پٹھان ایسا آتشیں مزاج ایسا عدم تشدد کا پیروکار بن گیا کہ انگریز دنگ رہ گیا۔ سرکاری حکام کہا کرتے تھے عدم تشدد پر کاربند پٹھان تشدد کے دیوانے پٹھان سے زیادہ خطرناک ہے۔ آیئے آپ کو ایک لڑکی کا واقعہ سنائیں۔ جب عورتوں میں ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو بس نہ پوچھئے۔ گاندھی اروِن پیکٹ ہو رہا تھا۔ لیکن فوج نے اتمان زئی کے جلسے پر فائرنگ کر دی، یہاں خدائی خدمت گار کا جلسہ ہو رہا تھا، فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور جلسہ برخاست کر دینے کا حکم دیا، جب لوگ منتشر نہ ہوئے تو فائرنگ کر دی گئی، کئی آدمی مارے گئے اور کئی زخمی ہو گئے لیکن جلسہ جاری رہا، جب فائرنگ بہت تیز ہو گئی تو مجبوراً نہتے عوام جلسے سے منتشر ہونے لگے اور بھاگنے لگے۔ جلسہ دیکھنے کے لئے کچھ عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ اُنہی میں خدائی خدمت گار رب نواز خان کی جوان بہن بھی تھی۔ وہ بجائے پناہ ڈھونڈنے کے جس طرف سے زیادہ زوروں سے فائرنگ ہو رہی تھی، دوڑ پڑی۔ جلسہ سے بھاگنے والوں نے آواز دی "ارے بہن کیا کرتی ہو، رُک تو سہی دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے، رُک جا بہن، اِدھر تو قیامت برپا ہے خدارا کیا کرتی ہو، رُکتی کیوں نہیں۔" اس لڑکی نے گرج کر کہا۔ "اسی لئے تو میں نہیں رکتی، تم لوگ اِدھر سے بھاگے چلے آ رہے ہو، مجھے جانے دو تا کہ میں سینہ پر گولی کھا لوں اور زنگی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں کہ پٹھانوں میں کوئی بھی ایسا نہ رہا جو اپنے عقیدے کی خاطر موت کو للکار سکے۔" اس لڑکی کے کردار نے بھاگنے والوں میں نئی جان ڈال دی، سب پلٹ پڑے، فوج گھبرا گئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ فوج کی تلاشی لی کہ وہ کوئی لاش تو نہیں لئے جا رہے ہیں، تب فوج کو واپس جانے کا حکم دیا، اس مقابلے میں بھی عدم تشدد کی ظلم و زیادتی پر فتح ہوئی۔

گاندھی جی اروِن پیکٹ کے ماتحت تمام کانگریسی رہا کر دیئے گئے۔ لیکن بادشاہ خان جیل ہی

میں رہے۔ ایک دن بادشاہ خان نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا کہ سب رہا ہو گئے۔ صرف مجھے کیوں بند رکھا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا یہاں مسلم رہنماؤں کی ایک کمیٹی آرہی ہے جس میں سر فضل حسین، سر صاحب زادہ عبدالقیوم ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ خان نے جواب دیا......"میں اُن لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا جب ہم پر مصیبت کے پہاڑ ے توڑے جارہے تھے تو وہ لوگ دکھائی نہیں دیئے، آج وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، آپ برائے مہربانی اُن کو اطلاع کر دیجیے کہ اگر وہ یہاں آگئے تب بھی میں اُن سے نہیں ملوں گا۔" اب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ انگریز نے کیوں خطاب بانٹے تھے۔ اسی دن کے لئے جب بھی ضرورت ہو، ان وفادارانِ ازلی کو استعمال کرے۔

جب گاندھی جی کو معلوم ہوا تو بادشاہ خان ابھی تک رہا نہیں ہوئے تو وہ لارڈ ارون سے ملے اور کہا عبدالغفار خان کو بھی چھوڑ دیجیے۔ وہ ہماری کانگریس کا ممبر ہے۔ لارڈ ارون نے کہا......"پٹھان اور عدم تشدد ناممکن" آپ کو چاہیے کہ صوبہ سرحد جا کر خود ہی دیکھ لیجیے کہ پشتون کس حد تک عدم تشدد کا قائل ہے۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے بادشاہ خان کی رہائی کا حکم جاری کر دیا۔ بادشاہ خان رہا ہو کر آئے اور چند دنوں کے بعد پھر دورے شروع کر دیئے۔ اُن کو معلوم تھا کہ یہ صلح عارضی ہے۔ بہت جلد ٹوٹ جائے گی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اپنی تقریر میں کہا کرتے تھے فرنگی کی ایک سینگ ٹوٹ گئی ہے، اُٹھو کمر کس لو اور دوسری سینگ بھی توڑ دو، یہ ملک تمہارا ہے۔ خدا نے تمہارے بچوں کو عطا کیا ہے۔ لیکن آج تمہاری نااتفاقی خود غرضی کی وجہ سے انگریز تمہارے ملک کو ہڑپ کر رہا ہے۔ تمہارے بال بچے بھوکے ننگے ہیں اور تمہارے ملک کی بدولت اُس کے بچے گل چھرے اُڑا رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ چند دنوں میں کراچی میں کانگریس کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ اس میں شرکت کی دعوت آئی، یہ پہلی کانگریس کی میٹنگ تھی جس میں صوبہ سرحد شامل ہو رہا تھا۔

بادشاہ خان کے ساتھ علاوہ ڈیلی گیٹ کے سو خدائی خدمت گار ایک سے ایک جوان، لمبا، ایک سے ایک خوبصورت، چوڑے سینے، کشادہ پیشانیاں، سرخ سفید رنگ، دراز قد عزم و استقلال جن کے چہروں سے عیاں، ثابت قدمی جن کے قدموں سے لپٹی ہوئی اُس پر سرخ وردیاں جو پھوٹی نکلتی تھیں، معہ اپنے ساز و سامان کے روانہ ہوئے۔ آج ہندوستان نے انہی پٹھانوں کو دیکھا جن کو انگریز اور اُن کے وفاداروں نے ڈاکو، وحشی، چور، ظالم، سرکش، نہ جانے کن کن القاب سے مشہور کیا تھا۔ خدائی خدمت گاروں نے بھی اس موقع سے خوب فائدہ اُٹھایا۔

جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی، یہ اپنا پروپیگنڈہ کرتے۔ کراچی میں لاکھوں انسانوں نے خدائی خدمت گاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اُن کی خدمات، ڈسپلن ایسی تھی کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انگریزی پروپیگنڈے کا بھانڈا پھوٹ گیا، لیکن بادشاہ خان چند ساتھیوں کو لے کر بذریعہ جہاز بمبئی گئے۔ وہاں بھی خدائی خدمت گار تحریک کا خوب پروپیگنڈہ ہوا۔ ادھر لارڈ اِرون کی جگہ لارڈ ولنگڈن آئے۔ یہ بہ زعم خود یہ طے کر کے آئے تھے کہ ہندوستان سے کانگریس کا نام ونشان مٹا دیں گے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد 24 دسمبر 1931ء کو بادشاہ خان پہلے آدمی تھے جو گرفتار کیے گئے۔ ہندوستان بھر میں اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ صوبہ سرحد میں ہزاروں خدائی خدمت گار گرفتار کر لئے گئے۔ صرف ہری پور جیل میں دس ہزار خدائی خدمت گار قید تھے جن کو ٹھٹھراتے جاڑوں میں صرف ایک کمبل دیا گیا تھا اور صرف ایک روٹی ملتی تھی جو بہتوں تک نہ پہنچتی تھی۔ بڑے لیڈروں کے کوڑے لگائے جاتے تھے، چکی اور کولہو کی مشقت لی جاتی تھی۔ قید تنہائی میں بھی رکھے جاتے تھے۔ کوئی ظلم اور ذلت آمیز سلوک ایسا نہیں تھا جو اُن کے ساتھ نہ کیا جاتا رہا ہو۔ انگریز اپنی سلطنت اور طاقت کے گھمنڈ میں ایسے سرشار تھے کہ عقل کھو بیٹھے، وہ یہی سمجھ بیٹھے کہ طاقت کے بل پر ہم خدائی خدمت گاروں کو کچل دیں گے، ہوا اِس کے برعکس، جتنا ظلم بڑھتا جاتا تھا، اتنا ہی قربانی و ایثار کا جذبہ بھی۔ اگر خدائی خدمت گار تشدد کرتے تو زیادہ تشدد سے دبائے جا سکتے تھے لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ ایک طرف سے ننگا تشدد اور دوسری طرف سے عدم تشدد۔ نتیجہ وہی جو ہونا چاہیے۔ لارڈ ولنگڈن نے ایسے ایسے آرڈی نینس جاری کیے جو آپ اپنی نظیر تھے، ایک آرڈی نینس تو ایسا تھا کہ جس کو دیکھ کر انسانیت کی گردن شرم سے جھک جائے (اگر کوئی جرم کرے تو اُس کے والدین کو سزا دی جاتی تھی)۔

یہ سختی محض اِس وجہ سے تھی کیونکہ سر سائمل ہولر وزیر ہند اور لارڈ ولنگڈن دونوں نے طے کر لیا تھا کہ برطانیہ کی مخالفت کچل دی جائے وہ پُر امن ہی کیوں نہ ہو۔ آرڈی نینسوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے تیرہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ آرڈی نینس ہندوستان کے ہر شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ جائیداد کی ضبطی وغیرہ وغیرہ۔ کانگریس خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ اُس کی تمام جائیداد، اسکول، لائبریری، ہسپتال، قومی ادارے سب کے سب ضبط کر لئے گئے۔ ان آرڈی نینسوں کی سختی کا یہ عالم تھا کہ مسٹر چرچل ۔ ایسا سامراجی اپنے

منہ پھٹ روایتی انداز میں ہاؤس آف کامنس میں کہنے پر مجبور ہوا۔''[1]

حکومت کی یہ پالیسی بن گئی تھی کہ سیاسی قیدیوں کی جائیداد، روپیہ پیسہ، عمارتیں سب ضبط کرلی جائیں۔ اُن کے ساتھ اخلاقی مجرموں سے بھی خراب سلوک کیا جائے۔ جیل حکام کے نام ایک خفیہ گشتی بھیجی گئی کہ سیاسی قیدیوں سے انتہائی سختی برتی جائے۔ بید لگانے کی سزائیں عام ہوگئیں۔ سر سائمل ہور (Sir, Simel Hore) وزیر ہند نے ہاؤس آف کامنس میں بڑے تکبر سے اعلان کردیا کہ اِس مرتبہ وہ کوئی کام اُدھورہ نہیں چھوڑیں گے۔ 1932ء میں انڈیا لیگ نے ایک وفد برٹرنڈ رسل کی قیادت میں بھیجا جس نے ایک رپورٹ ''Condition in India'' میں ایک باب صوبہ سرحد پر لکھا ملاحظہ ہو:

''سرکاری حکام سے گفتگو کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اُن کے نزدیک عارضی صلح (گاندھی اِرون پیکٹ) ایک غلطی تھی۔ اِسی پیکٹ کی وجہ سے خدائی خدمت گار کانگریس میں شامل ہوگئے اور انہوں نے عدم تشدد اختیار کرلیا۔ ورنہ بہت پہلے وہ کچل دیئے جاتے۔ سرحدی حکام اپنے میدانی حکام بھائیوں کی طرح سوراج، آزادی عوام کی تنظیم کو نہ برداشت کرسکے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے ہم سے کہا کہ عبدالغفار خان ہندوستان میں سلف رول نہیں بلکہ پٹھان نشان قائم کرنا چاہتا ہے۔''[2]

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

''حکومت ہند نے ایک گشتی چٹھی چیف سیکرٹری اور چیف کمشنروں کو بتاریخ 16 جنوری 1932ء کو روانہ کی اور حکم دیا کہ حکام دوران گفتگو یا اور طریقوں سے مسلمانوں پر یہ ظاہر کردیں کہ سرخ پوش تحریک کانگریس تحریک کا جزوِ خاص ہے۔''[3]

---

1. Churchill with his characterstics Bluntly said that the ordinance were more Drastic than any that were required Sience that mutny.

2. آپ بیتی: خان عبدالغفار خان

3. آپ بیتی: خان عبدالغفار خان

"حکومت کی سختیوں نے ایک جنگی حالت پیدا کردی ہے۔ حالانکہ برٹش کی طرف سے بہت زیادہ طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن کوئی بھی حاکم یہ نہ کہہ سکا کہ تحریک کچل دی گئی۔ سرکاری حکام کے خلاف عدم تشدد اسی طرح برتا ہے، یہ تشدد ایسے علاقے میں جہاں ہتھیار آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں۔ عدم تشدد کے پیرووں کو خراج عقیدت ہے۔"[1]

اِدھر سرکاری حکام بغلیں بجا رہے تھے۔ ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ وفاداران ان کو مبارک باد دیتے تھے کہ سرخ پوش تحریک دب گئی مگر اندر اندر دل بیٹھا جاتا تھا۔ اِس کا حال اُس وقت کھلا جب ہوم ڈیپارٹمنٹ کی خفیہ فائل نظر سے گذری۔

پشاور ضلع کے باہر کہیں بھی کانگریس یا سرخ پوش تحریک نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ لیکن ضلع پشاور کی تحصیل مردان، چارسدہ، نوشیرہ میں انگلش خدائی کی وجہ سے خدائی خدمت گاروں کو اپنی مزموم طاقت کے مظاہرے کا موقع مل گیا۔ نوشیرہ تحصیل میں 7 اپریل کو پولنگ ہوئی۔ سرخ پوشوں نے چند پولنگ بوتھ پر پکٹنگ کی لیکن سب سے بڑا مظاہرہ پالی کے مقام پر ہوا، دو یا تین سو پٹھان عورتوں نے سر پر قرآن مجید لے کر ووٹرس کو ووٹ ڈالنے سے روک دیا۔ چارسدہ تحصیل میں 11 اپریل کو پولنگ ہوئی۔ ہزاروں سرخ پوش جمع ہو گئے اور صرف نام کو ایک ووٹ پڑا۔ (ہمارا خیال ہے یہ ووٹ بھی کسی خطاب یافتہ کا رہا ہوگا)۔ دوسرے دن مردان تحصیل میں بائیکاٹ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ کٹلا تنگ وہوتی و مردان، کالو خان، رستم میں بڑے زبردست مظاہرے ہوئے۔ اندازہ ہے کہ اِن میں کم از کم تیس ہزار آدمیوں نے شرکت کی۔ 12 اپریل سے مردان اور چارسدہ تحصیلوں میں سکون ہے۔ لیکن خبر ہے کہ جب وائسرے پشاور آئیں گے تو سرخ پوش مظاہرہ کریں گے جس کے لئے حفاظتی تدابیر کرلی گئی ہیں۔

20 اپریل 1932ء کو نیا کانسٹی ٹیوشن نافذ کر دیا گیا۔ وائسرائے نے نئی اسمبلی کا افتتاح کیا۔ پرانے نمک خوار سر عبدالقیوم وزیر بنا دیئے گئے۔ چیف کمشنر کی جگہ گورنر مقرر ہوا۔ گویے جلاد کا نام بدل دیا گیا۔

---

1. آپ بیتی: خان عبدالغفار خان

سرخ پوشوں پر مظالم کی گونج آزاد علاقہ میں بھی پہنچ گئی۔قبائلیوں سے ٹکر ہونے لگی۔ہوائی جہازوں سے بمباری کی جانے لگی۔ایک طرف تو پٹھانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف صوبہ سرحد کو بالکل سیل کر دیا گیا۔نہ وہاں کوئی جا سکتا تھا،نہ وہاں کی کوئی خبر باہر آسکتی تھی۔بڑے بڑے خطاب یافتہ راجے،نواب،اسلام کے فدائی وظیفہ خوار علماء سب موجود تھے۔ لیکن کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ٹھیک ہی ہے"میاں کا تھور" بعض اوقات شاطر سے شاطر ظالم سے بھی چوک ہو جاتی ہے اور بھانڈا پھوٹ ہی جاتا ہے۔یہ اُس وقت ہوا جب 1933ء میں جینوا میں ہوائی ترک اسلحہ کی کانفرنس میں برٹش نمائندہ ایڈن نے کھڑے ہو کر ہوائی بمباری کو امتناع دفعہ نمبر 34 میں بعض دُور دراز علاقوں کو جہاں فوج آسانی سے نہیں پہنچ سکتی تھی،مستثنیٰ کرنا چاہا۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے آزاد علاقے کا نام تو نہیں لیا لیکن کانفرنس نے سمجھ لیا کہ اُن کی کیا مراد ہے،ایڈن کی چونکا دینے والی شرط کے بعد پوری کانفرنس میں بحث ہوئی۔پولینڈ و جرمنی و سوئٹزرلینڈ،ناروے،چین،امریکہ و روس وافغانستان کے نمائندوں نے پوری بحث کی اور طے کر لیا کہ ہر جگہ کی بمباری خلاف قانون قرار دی جائے۔برطانیہ نے استثناء چاہا تھا لہٰذا وہ دنیا کے سامنے کھل کر آ گیا۔

خان برادرز ہزاری باغ سنٹرل جیل میں قید کاٹ رہے تھے۔ڈاکٹر خان صاحب کا لڑکا عبیداللہ خان ملتان جیل میں تھا۔چونکہ وہاں کی آب و ہوا ناموافق تھی۔اُس نے کسی دوسری جیل میں تبدیل کرنے کی درخواست کی جہاں کی آب و ہوا اُس کے موافق ہو۔بھلا لارڈ ولنگڈن کی حکومت کسی کی سنتی بس اُس نے یکم فروری 1934ء سے اس ظلم کے خلاف ہڑتال کر دی،پہلے تو حکومت نے جبراً کھلانے پلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی،بھوک ہڑتال جاری رہی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب سے بڑی بھوک ہڑتال تھی۔78 دنوں کے بعد حکومت جھکی اور اُس کا مطالبہ مان لیا اور عبیداللہ خان کو سیالکوٹ جیل منتقل کر دیا گیا جہاں سے وہ 18 اگست 1934ء کو رہا ہوا۔اس تاریخی بھوک ہڑتال کو مہادیو ڈیسائی گاندھی جی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے اپنے مشہور کتابچہ (دوخدائی خدمت گار) میں قابل تعریف کہا ہے مگر قابل تقلید نہیں ہے،یہ بھی تائید کی ہے کہ خان برادرز ہزاری باغ سنٹرل جیل میں تھے۔اُن کو عبیداللہ کا حال اخبارات سے معلوم ہوتا تھا لیکن زبان نہیں ہلاتے تھے۔جب اخباروں سے معلوم ہوا کہ عبیداللہ خان کا بچنا محال ہے تو جرأت

انگیز اور صبر آزما بردباری کے ساتھ حکومت کے ساتھ درخواست کی کہ جب عبید اللہ کا انتقال ہو جائے تو حکومت برائے مہربانی ہمارے آبائی قبرستان میں دفن کرا دے۔ تصور شرط ہے اپنے جوان و بہادر بیٹے کے لئے سوائے ڈاکٹر خان صاحب کے کون یہ کہہ سکتا تھا؟

27 اگست 1934ء کو اپنی سزا پوری کرنے کے بعد خان برادرز رہا کر دیئے گئے لیکن صوبہ سرحد و پنجاب میں داخلہ ممنوع کر دیا گیا۔ واردھا میں سیٹھ جمنا لال بزاز کی دعوت پر واردھا چلے گئے اور آشرم میں رہنے لگے۔ یہاں گاندھی جی اور اُن کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھا۔ صوبہ سرحد میں داخلہ کی پابندی محض اس وجہ سے تھی کہ وہاں اُن کا شاندار استقبال ہوتا اور روفاداروں میں کھلبلی مچ جاتی۔ حکومت کو یہ ڈر بھی تھا کہ اگر بادشاہ خان کوئی خلاف قانون حرکت نہ بھی کریں لیکن وہ خدائی خدمت گار تنظیم کو الیکشن میں ضرور استعمال کریں گے اور الیکشن جیت لیں گے، جو حکومت کسی قیمت پر گوارہ نہیں کر سکتی تھی۔ بادشاہ خان کے اوپر بمبئی کرسچن سوسائٹی نے ایک تقریر کرنے پر پھر مقدمہ چلایا اور دو برس کی سزا دی گئی۔ آخر کار اپنے صوبہ سے چھ سال جلاوطن رہنے کے بعد اگست 1937ء میں اپنے وطن آئے۔ صوبہ سرحد میں الیکشن میں کانگریس کی کامیابی کے بعد جواہر لال نہرو کانگریس پریذیڈنٹ نے اکتوبر 1937ء میں اپنا پہلا دورہ کیا۔ 16 اکتوبر کو پشاور میں کانگریس پریذیڈنٹ نہرو کا ایسا پرخلوص و جذباتی استقبال ہوا کہ اُن کا دل بھر آیا۔ پلیٹ فارم پر خدائی خدمت گاروں کے ایک دستہ نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ بادشاہ خان وغیرہ نے خوش آمدید کہا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے ممبران اسمبلی کا تعارف کرایا۔ ایک سجی موٹر کار میں بادشاہ خان کے ساتھ بیٹھے۔ جلوس روانہ ہوا۔ جلوس کے آگے دس ہزار خدائی خدمت گار اپنی سرخ وردیوں میں جھنڈ بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ اُس کے پیچھے خاکسار اپنی خاکی وردیوں میں بیلچے لئے ہوئے چل رہے تھے۔ دوسری سیاسی و سماجی پارٹیوں کے ممبران شریک جلوس کو دو گھنٹہ لگے۔ پشاور نہرو کے درشن کے لئے اُمنڈ آیا تھا۔ سڑک کی دونوں پٹریاں اور کوٹھے آدمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کابل گیٹ پر یہ جلوس ختم ہوا۔ وہاں سے نہرو ڈاکٹر خان صاحب کی قیام گاہ چلے گئے۔ پشاور شہر میں ایک عظیم الشان جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے نہرو نے کہا.... "بادشاہ خان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اِن کو صرف فخر افغانستان کہنا ہی غلط ہے بلکہ یہ فخر ہند ہیں۔ ملک بھر میں گاندھی جی کے کوئی دوسرا نہیں جس کا کام اتنا ہمہ گیر ہو اور جو ہندوستان کی

ہمت اور توانائی کہا جا سکے۔ 15 اکتوبر کو عبدالغفار خان اور نہرو عثمان زئی گئے۔ وہاں قرب و جوار سے خلقت اُمنڈ آئی تھی۔ سب نے بڑا پُرخلوص استقبال کیا۔ اس کے بعد نہرو مشہور زمانہ اسکول گئے جس نے 1940ء سے بڑے بڑے مجاہدین آزادی پیدا کیے تھے۔ اسٹاف اور لڑکوں نے کانگریس پریذیڈنٹ کو ایڈریس دیا جس میں صوبہ سرحد کے لوگوں کا کانگریس پر غیر متزلزل اعتماد کا ذکر کیا۔ نہرو نے اپنے جواب میں کہا۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو چھوٹے سے قصبہ اتمان زئی کو نہ جانتا ہو۔ ہر ایک یہاں کے باشندوں کی خدمات جو جنگ آزادی کی ہیں، فخر و مباہات سے یاد کرتا ہے اور کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آپ نے میری قربانی کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کر دیا۔ میری خدمات اِن ہزاروں پٹھانوں کی خدمات و قربانی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔

نہرو کے دورے کے بعد گاندھی جی نے صوبہ سرحد کے دو دورے کیے اور اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ پٹھان کس طرح عدم تشدد پر کاربند ہے۔ اُن کے ڈسپلن کو بھی خوب غور سے دیکھا جس نے پٹھانوں اور ہندوستان کے مابین محبت کو اور مستحکم کر دیا۔ دوران جنگ عظیم جب انفرادی ستیہ گرہ شروع ہوئی تو اس میں بھی پٹھان شریک ہوئے۔ جب انگریز سے آخری لڑائی 1942ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' شروع ہوئی تو صوبہ سرحد میں کانگریس خلاف قانون قرار نہیں دی گئی۔ ستمبر 1942ء سے خدائی خدمت گاروں نے ستیہ گرہ شروع کر دی۔ عدالتوں، سرکاری دفتروں پر چھاپے مارنے تھے اور ہر انگریز کے منہ پر ''ہندوستان چھوڑو، خالی کرو'' کا نعرہ لگاتے تھے۔ آخر میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہندوستان بھر میں تقریباً ساٹھ ہزار کانگریسی گرفتار ہوئے۔ اُن میں سے چھ ہزار سے زیادہ صوبہ سرحد میں گرفتار ہوئے۔ ہری پور جیل میں عبدالغفار خان معہ خدائی خدمت گاروں کے قید تھے۔ یہ جیل ڈاکوؤں، قاتلوں اور سرحد پار کے لوگوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہاں خدائی خدمت گاروں پر انسانیت سوز مظالم ہوئے۔ جاڑے میں وہ ننگے کر کے کوٹھریوں میں بند کر دیئے جاتے تھے۔ بید کی سزا عام تھی۔ کئی خدائی خدمت گار تنہائی کی کوٹھری میں گولی سے اُڑا دیئے گئے۔ کئی سیاسی قیدی اِس بناء پر مر گئے۔ حد یہ ہے کہ بادشاہ خان تک کی جامعہ تلاشی لی گئی۔ اِدھر جاپان نے ہتھیار ڈالے، اُدھر سب قیدی رہا کر دیئے گئے۔ شملہ کانفرنس ہوئی لیکن کچھ طے نہ ہو سکا۔ 26 جولائی 1946ء کو انگلینڈ میں لیبر پارٹی الیکشن جیت گئی، اُس نے ہندوستان میں الیکشن کا اعلان کر دیا۔ 1946ء کا الیکشن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کیونکہ اِسی

الیکشن کی بنیاد پر ملک تقسیم ہوا۔ یہ الیکشن کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان پاکستان اور متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر لڑا گیا، چونکہ ہم یہ باب صرف صوبہ سرحد پر لکھ رہے ہیں لہٰذا وہاں کے الیکشن کا حال لکھتے ہیں۔

کلکتہ میں ورکنگ کمیٹی اور پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ بادشاہ خان اس میں شریک ہوئے۔ بادشاہ خان موجودہ حالات میں صوبہ سرحد کے الیکشن میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے ۔انہوں نے اپنی وجوہات گاندھی جی کو بتا دیں، دونوں میں اتفاق ہوگیا۔ پارلیمنٹری بورڈ نے بادشاہ خان سے بہت اصرار کیا کہ وہ الیکشن میں حصہ لیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئے ۔اپنے گاؤں واپس آگئے اور اپنا کام کرنے لگے۔ دورے کرتے تھے اور عوام سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ حکومت کی مشینری کا بغور مطالعہ کر رہے تھے کیوں کہ وہ الیکشن کے کام سے الگ تھلگ تھے، لیکن جب اُن کو پتہ چلا کہ حکومت نے اسلامیہ کالج پشاور اور اس طرح کے اسکول بند کر دیئے ہیں اور لڑکوں کو مسلم لیگ کی طرف سے پروپیگنڈے میں جھونک دیا گیا ہے اور انگریزوں کی بیویاں بھی میدان میں کود پڑی ہیں لوگوں سے ڈوپٹہ دان میں مانگتی تھیں، وہ ڈوپٹہ ووٹ تھا۔ الیکشن کے پروپیگنڈے میں پنجاب سے بیگم شاہنواز بہت سی لڑکیوں کو لے کر پہنچ گئیں۔ پنجاب کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء اسلامیہ کالج کلکتہ کے لڑکے، ہندوستان کے دوسرے مقامات کے کارکن اور لیگی رہنما بڑی تعداد میں صوبہ سرحد پہنچ گئے تھے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ حکومت اور مسلم لیگ نے پنجاب و سرحد کے گدی نشین پیر، بڑے پرہیزگار سب کو خانقاؤں سے نکال کر الیکشن میں جھونک دیا تھا۔ بادشاہ خان نے جب انگریزوں اور ان میموں کو مسلم لیگ کی طرف سے اتنا سرگرم دیکھا تو اُن کا خیال بدل گیا۔ صوبہ سرحد کے الیکشن کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ یہیں کے فیصلہ پر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے تنہا مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کا دارومدار تھا۔ یہ الیکشن (متحدہ ہندوستان کے عام آخری انتخابات 1945-46) ہندوستان اور پاکستان کے مسئلہ پر تھا۔ ہندو مسلمان کے نام پر تھا۔ مسلم لیگی کہتے تھے مسجد کو ووٹ دیتے ہو یا مندر کو۔ ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح پٹھان (دقیانوسی اور جذباتی نہ تھے) اُن میں سیاسی شعور تھا۔ اُن کو کوئی اسلام کے نام پر دھوکہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ اسلام سے بخوبی واقف تھے، اُس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ صوبہ سرحد میں ایک تحریک تھی، اس تحریک نے ملک و ملت کے لئے بڑی قربانیاں دی تھیں۔

اور شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ ووٹنگ کے وقت حکومت نے مسلم لیگ کے لئے بڑی کوششیں کیں۔ خدائی خدمت گاروں کی بڑی مخالفت کی۔ لیکن مسلم لیگ کو شکست ہوئی اور کانگریس (خدائی خدمت گار) بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئی۔

جولائی 1946ء میں انڈین کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے تین آدمی صوبہ سرحد کی اسمبلی پہنچے۔ ایک بادشاہ خان، دوسرے مولانا آزاد اور تیسرا ضلع کا ایک باشندہ۔ الیکشن میں صرف ضلع ہزارہ میں مسلم لیگ کو ووٹ ملے تھے۔ الیکشن میں اس قدر واضح کامیابی کے باوجود جس میں خدائی خدمت گاروں کا واضح مسائل پر مسلم لیگ سے مقابلہ ہوا تھا اور کامیابی ہوئی تھی، اِس کے باوجود صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کرانے کا حکم اُن پر ٹھونس دیا گیا۔ وائسرائے کا یہ حکم نہ صرف منطق اور دلیل کے خلاف تھا بلکہ ایک امتیازی سلوک بھی تھا جہاں سارے ہندوستان میں ہر ایک صوبہ کے اُن نمائندوں سے جو اسمبلی میں تھے، پوچھا گیا کہ آیا وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں، وہاں صوبہ سرحد کی اسمبلی کو یہ اختیار نہ دیا گیا، صوبہ سرحد کی اسمبلی کے ممبروں کی نمائندگی اور نمائندہ حیثیت کو انگریزوں نے پس پشت ڈال دیا۔ انگریزوں نے اپنے اس حکم سے گویا صوبہ سرحد کو جو آزادی کے لئے قربانیاں دی تھیں، اُس کی سزا دی تھی۔ اس موقع پر کانگریس کا صوبہ سرحد کی مدد نہ کرنا سخت تعجب انگیز اور شرمناک ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ آسام کے بارے میں کانگریس نے ایسا نہیں کیا۔ جب وہاں کے وزیر اعلیٰ گوپی ناتھ بردولی نے گروپ بندی ماننے سے انکار کردیا، یا کرپس لارنس پلان 1946ء بنا اور شور مچایا کہ کانگریس اُڑ گئی اور گروپ بندی کی وہ اسکیم رد کردی گئی ۔بادشاہ خان کی طرف سے اِس بات کا کوئی جواب ممکن نہیں جب انہوں نے کہا۔

یہاں قاری سے عرض ہے کہ یہاں سے کتاب کو خوب غور سے پڑھے تاکہ اُس کی سمجھ میں آجائے کہ ہندوستان کے بٹوارے کا کون کون ذمہ دار ہے۔ اِس بات کی سرخی ہم نے غلط تو نہیں دے دی ہے؟

''گاندھی جی سے ماؤنٹ بیٹن کی کئی ملاقاتیں ہوئیں، پہلی 31 مارچ کو ہوئی، دوسری یکم اپریل کو ہوئی، ان ملاقاتوں میں بادشاہ خان بھی گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ اِن ملاقاتوں میں گاندھی جی نے وائسرائے سے کہا کہ ''وہ جناح کو بلائیں اور ایڈمنسٹریشن اُن کے سپرد کردیں۔''

ماؤنٹ بیٹن نے کہا ''جناح کا کیا ردّعمل ہوگا۔'' گاندھی جی نے جواب دیا۔ ''وہ یہی کہیں

گے کہ یہ گاندھی جی کی چال ہے۔'' ماؤنٹ بیٹن نے مسکرا کر جواب دیا'' کیا یہ غلط ہوگا؟'' گاندھی جی نے کہا'' نہیں میں خلوص دل سے کہہ رہا ہوں۔'' گاندھی جی نے ماؤنٹ بیٹن کو خبردار کیا کہ اُن کو سخت ہونا چاہیے اور اُن کے پیش رووں نے جو کچھ کیا ہے، اُس کا سامنا کرنا چاہیے۔ برٹش چال کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' نے ایسی صورتحال پیدا کردی ہے کہ اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ انگریز رہیں اور نظم وضبط قائم رکھیں۔ ہندوستان میں خون کی ہولی، اب خون کی ہولی کا سامنا کیا جائے اور اِس کو تسلیم کرلیا جائے گا۔ گاندھی جی نے وائسرائے کو جو کچھ تجویز کیا تھا، اُس کا لب لباب یہ تھا کہ جناح کو سینٹر میں حکومت بنانے کا اختیار دیا جائے، وہ چاہے جس کو وزیر مقرر کردے، چاہے وہ سب کے سب مسلمان ہوں، چاہے دوسرے طبقے کے لوگ، کانگریس ہر اُس قدم پر مدد کرے گی جو ہندوستان کے مفاد میں اُٹھائے جائیں گے۔ اِس کارروائی کے جج تنہا لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہوں گے، جب یہ ہوجائے گا تو جناح کو اختیار ہوگا کہ وہ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں اختیارات کی منتقلی ہونے سے پہلے ہی پاکستان کا مطالبہ پیش کریں اور بجائے دھمکی کے سمجھا بجھا کر پاکستان منظور کرالیں۔ جو صوبہ پاکستان میں اپنی مرضی سے شامل ہونا چاہے، ہوجائے، کسی پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔ اگر مسٹر جناح یہ نامنظور کردیں تو یہی چیز کانگریس کے سامنے پیش کی جائے۔ وائسرائے نے گاندھی جی سے کہا کہ'' اُن کی تجاویز میں کافی کشش ہے۔'' گاندھی جی کو یہ خیال ہوا کہ وائسرائے اُن کے ہم خیال ہوں گے، کانگریس کو راضی کرنے میں دیر نہ لگے گی۔ لیکن وائسرائے کے مشیر گاندھی جی سے سمجھوتے کے سخت خلاف تھے۔ اِن مشیروں کی مخالفت کی وجہ سے وائسرائے کی رائے بھی بدل گئی اور انہوں نے کہا کہ دوسری پارٹیوں کا ردعمل بھی جاننا ضروری ہے۔ قبل اِس کے کہ گاندھی جی کانگریس کو اپنے منصوبے پر تیار کریں، نہرو کو اِس کی خبر کردینا ضروری ہے۔ ورکنگ کمیٹی میں یہ تجویز پیش ہوئی۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی لیکن کوئی ممبر بھی علاوہ خان عبدالغفار خان کے گاندھی جی کا ہم خیال نہ ہوسکا۔ نہ وہ لوگ گاندھی جی کو اپنا ہم خیال بناسکے۔ گاندھی جی اور خان عبدالغفار خاں برطانیہ کے زیر سایہ کسی طرح کی تقسیم کے خلاف تھے۔ گاندھی جی کے نزدیک انگریز کے ذریعے پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ اعتراف شکست تھا۔ وہ سرے سے تقسیم کے خلاف تھے۔ تقسیم سے اُن کی کوئی مشکل حل نہ ہوگی بلکہ جو مشکلات آج ہیں، اُن میں کئی گنا اضافہ ہوجائے گا۔ ورکنگ کمیٹی کے اِس رویہ کو دیکھ کر انہوں نے وائسرائے کو لکھ دیا

کہ آئندہ سے اُن کو کسی بھی گفتگو میں شرکت کے لئے نہ کہا جائے۔ 12 اپریل کو انہوں نے ساتھیوں سے بہار جانے کی اجازت لی، سب لیڈر اُن کی طرف سے (BRISQUE) تھے۔ گاندھی جی نے کہا، سردار صاحب سے صرف چند منٹ کی ملاقات ہوئی۔ گاندھی جی نے یہ شکوہ بھی کیا کہ اس پوری کمپنی میں صرف میرے پاس فاضل وقت ہے اور سب مشغول ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سرحدی گورنر سر الف کیرو کی موجودگی میں ڈاکٹر خان صاحب اور نہرو سے 19 اپریل کو دہلی میں ملاقات کی۔ اُس میں یہ طے ہوا کہ سرحدی حکومت سیاسی قیدیوں کو رہا کر دے تاکہ امن وامان قائم کرنے میں آسانی ہو۔ 27 اپریل کو ڈاکٹر خان صاحب نے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بذات خود سرحد گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا جلوس مسلم لیگ کا جس میں تقریباً 70 ہزار آدمی ہیں، گورنمنٹ ہاؤس آرہا ہے تاکہ وہ وائسرائے کے آگے اپنی شکایات پیش کرے، جلوس نعرے لگا رہا تھا، وائسرائے خود ہی اِس جلوس کے سامنے پہنچ گئے، سب جوش ختم ہو گیا اور اب ماؤنٹ بیٹن زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ اِس کے بعد ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ وائسرائے نے کہا کہ میں نے جناح کو گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، ڈاکٹر خان صاحب نے کہا، میں نے بھی بادل ناخواستہ سرخ پوشوں کا مظاہرہ روک دیا۔ وائسرائے نے کہا میں ہندوستان اِس لئے آیا ہوں کہ لوگوں کی رائے معلوم کر کے اختیارات منتقل کر دوں۔ میں نے بنگال و پنجاب میں کام شروع کر دیا ہے۔ لیکن صوبہ سرحد کی وجہ سے مجھ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، میں مسلم لیگ سے صاف کہہ دوں گا کہ میں تشدد کے آگے نہیں جھکوں گا، میں آپ سے خفیہ طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں الیکشن ضروری ہے لیکن میں مسلمانوں سے وعدہ نہیں کروں گا کہ الیکشن ضرور ہوں گے۔ جناح نے وعدہ کیا ہے کہ اگر الیکشن ہوتے ہیں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ آپ مجھ پر یقین کر لیں۔ جناح نے یہ صورت بھی تسلیم کر لی ہے اور اپنے لوگوں سے کہا کہ وہ ستیہ گرہ روک دیں۔ پھر وائسرائے نے مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کے بارے میں پوچھا کہ اُس کا یہاں پر کتنا حکم مانا جاتا ہے۔ جس کے جواب میں کہا گیا کہ مقامی مسلم لیگ نے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔ گذشتہ الیکشن میں یہاں پاکستان کی بنیاد پر مسلم لیگ کو شکست دی گئی ہے۔ سردار عبدالرب نشتر ایسا لیڈر بھی ہار گیا تھا۔

جب ڈاکٹر خان صاحب نے پختونستان کا مسئلہ اُٹھایا تو بحث میں تلخی پیدا ہوگئی۔ اگر یہ تسلیم

کر لیا جاتا ہے تو وہ پاکستان سے الگ ہو جائے گا اور نئی سیاسی سرحد بنانی پڑے گی۔ اِس کے جواب میں ڈاکٹر خان صاحب نے کہا کہ اگر آپ پٹھانوں کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اِس کے نتائج خراب ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا یہاں کیوٹیشن گورنمنٹ کیوں نہ بنادی جائے تو ڈاکٹر خان صاحب نے دوٹوک جواب دیا کہ اگر کانگریس ایسا کرتی ہے تو میں اِس میں نہ رہوں گا، ہم غریب لوگ ہیں، مسلم لیگ یہاں خودغرض اور خاص خاص خان لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ سر الف کیرو نے کہا کہ کانگریس کے بھی بڑے بڑے رئیس ہمدرد ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے دریافت کیا حکومت یہاں کیسی چل رہی ہے تو گورنر نے جواب دیا کہ وزیر اعظم کی طرف سے ناجائز دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے جواب دیا کہ گورنر خود ہر کام میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ہم یہاں فیصلہ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ عوام کی رائے معلوم کر کے اختیارات منتقل کرنے آئے ہیں۔ گورنر نے پوری کوشش کی کہ دفعہ 93 کا نفاذ کر دیا جائے۔ اِسکے بعد الیکشن کرائے جائیں۔ گورنر نے کیبنٹ میٹنگ کی ایک غلط رپورٹ بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیج دی اور اپنے وزیر اعلیٰ کا نوٹ جس میں صحیح بات درج تھی، وائسرائے کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔

بادشاہ خان کا یہ انکشاف آنکھیں کھول دیتا ہے، ابھی حال ہی میں گورنر کیرو نے اپنے وزیروں سے کہا تھا کہ تم پٹھانوں اور ہندوستان میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے، اگر تم لوگ کانگریس چھوڑ دو تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ آخر کیا بات تھی کہ گورنر پھر الیکشن کروانا چاہتا تھا۔ 1946ء کا الیکشن صاف صاف پاکستان کے اُصول پر لڑا گیا تھا اور پچاس سیٹوں میں سے 32 سیٹیں کانگریس نے جیتی تھیں۔ مسلمانوں کی 48 سیٹیں تھیں جن میں سے اکیس سیٹیں کانگریس کو ملی تھیں، تمام ہندو سیٹیں اور تین سکھوں کی سیٹوں میں سے دو کانگریس کو ملی تھیں۔ مسلم لیگ نے کل سترہ سیٹیں جیتی تھیں، اُن میں سے گیارہ صرف ہزارہ میں ملی تھیں جہاں پشتو زبان نہیں بولی جاتی ہے۔ کیرو اپنے پرانے وفاداروں کو جنھوں نے خدائی خدمت گاروں کی مخالفت کی تھی اور انگریز کا ساتھ دیا تھا، اقتدار منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اِس کے علاوہ نئے الیکشن کا کوئی دوسرا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔

17 مئی 1947ء لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے پلان پر سیاسی پارٹیوں کے غور کے لئے مقرر کی تھی لیکن اس دوران برٹش گورنمنٹ نے اِس پلان میں بڑی تبدیلی کر دی جو وائسرائے نے لارڈ اسمے کے ہاتھ مئی کے پہلے ہفتے میں لندن بھیجا تھا۔ اِس تجویز پر کہ صوبہ سرحد میں نئے الیکشن

سے پہلے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت برخاست کردی جائے۔ کانگریس والوں پر بڑا سخت ردِعمل ہوا، انہوں نے خبردار کیا کہ صوبہ سرحد کی وزارت کو اگر ہاتھ لگایا گیا تو کانگریس کا نظریہ برٹش گورنمنٹ کے پلان کے خلاف ہوجائے گا۔ اِس کے علاوہ لندن نے کچھ اور تبدیلیاں بالکل کانگریس کے خلاف کردیں۔ نہرو کا ردِعمل اتنا سخت تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو میٹنگ کی تاریخ بڑھانا پڑی تاکہ اُس وقت میں پلان پھر سے لکھا جائے۔ خاص تبدیلی یہ کی گئی کہ پہلے صوبے کو اپنے مستقبل کے فیصلہ کا حق تھا، اب یہ حق لے لیا گیا (تبدیلی غور طلب ہے) مثلاً پہلے صوبہ سرحد کو یہ اختیار تھا کہ وہ اگر چاہے تو نہ ہندوستان کے ساتھ رہے اور نہ پاکستان کے، بلکہ آزاد ہوسکتا ہے۔ اس تبدیلی نے صوبہ سرحد کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔ خودمختار بنگال کے لئے تبدیلی ہوئی کہ وہ مسلم لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے سے مشروط کردیا گیا۔ وائسرائے کو پھر لندن مشورہ کے لیے بلایا گیا۔ اِس بیچ میں جناح نے ایک پریس کانفرنس منعقدہ دہلی میں اعلان کردیا کہ مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کے لئے ایک ایک انچ کے لئے لڑے گی جس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں پورے کے پورے پاکستان کو دیئے جائیں، مزید برآں ایک سڑک پچھّم سے پورب تک دونوں حصوں کو ملانے کے لئے بھی دی جائے (یہ سڑک ہندوستان سے ہوکر جاتی تھی) لارڈ ماؤنٹ بیٹن 31 مئی کو اپنے پلان کے ساتھ واپس آئے۔ کانگریسی لیڈروں کے اصرار پر گاندھی جی دہلی [illegible] کانگریس کے رویے کی سختی نے گاندھی جی وایب اور موقع دیا [illegible] کانگریس کی [illegible] برٹش گورنمنٹ کو بجائے ماؤنٹ بیٹن کے بٹوارے کے کیبنٹ پلان پر راضی [illegible]۔ گاندھی جی نے ا[illegible] وہی نعرہ دہرایا (تقسیم سے پہلے امن) چونکہ جناح نے بھی مشترک اپیل برائے امن وامان [illegible] کئے ہیں، اُن سے بھی اِس کی پابندی کرائی جائے اور امن وامان قائم ہونے تک وائسرا[illegible] جناح سے کوئی بات نہ کریں، وائسرائے بھی اِس کے پابند ہیں، اگر کانگریس دبی تو مسا[illegible]لیگ مجبوراً کانگریس سے گفتگو کرے گی اور اُس نے روزانہ بڑھتے ہوئے مطالبات جو تلوار [illegible]زور پر پورے کرانا چاہتے ہیں، اُن سے نجات مل جائے گی لیکن کانگریس کے لیڈر (خصوصاً نہرو اور پٹیل) اس مغالطے میں تھے کہ اگر بٹوارہ کا اصول تسلیم کرلیا جائے تو امن وامان قائم ہوجائے گا۔ گاندھی جی کی رائے یہ تھی کہ امن کے لئے بٹوارہ زہر ہلاہل ہوگا۔ جو حالات روز بروز سامنے آرہے ہیں، اُن کی روشنی میں اقلیت بٹوارہ کے بعد پاکستان میں نہ رہ سکے گی، اُس کو بڑی تعداد میں بھاگنا پڑے گا اور

چاروں طرف تباہی پھیل جائے گی (گاندھی جی کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوا) یکم جون کی صبح کو گاندھی جی کی آنکھ کچھ دیر پہلے کھل گئی۔ چونکہ عبادت میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ وہ بستر پر پڑے پڑے خود سے باتیں کرنے لگے۔ آج میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کر رہا ہوں، حد ہے کہ نہرو اور پٹیل بھی کہتے ہیں کہ میرا خیال غلط ہے، وہ اب بھی اِسی رائے پر قائم ہیں کہ اگر بٹوارہ کو تسلیم کر لیا جائے تو امن وامان قائم ہو جائے گا، یہ دونوں یہ نہیں چاہتے کہ میں وائسرائے سے کہوں کہ اگر تقسیم ہونا ہی ہے تو یہ برٹش حکومت کے زمانہ میں نہ ہو، اِن دونوں کو شبہ ہے کہ کہیں میں زیادہ عمر کی وجہ سے سٹھیا تو نہیں گیا ہوں، مجھے صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمارا قدم غلط طرف جا رہا ہے، چاہے آج اِن لیڈروں (نہرو و پٹیل) کو اِس غلط قدم کا احساس نہ ہو لیکن میری حتمی رائے یہ ہے کہ جس قیمت پر ہم آزادی مول لے رہے ہیں، اِس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ (گاندھی جی کی یہ پیشین گوئی بھی لفظ بہ لفظ صحیح نکلی) پھر خود ہی باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں اچھا خیر میں ہی اندھیرے میں وہ لوگ ٹھیک راستے پر سہی، ہندوستان اور اُس کی آزادی کو جو خطرہ ہوگا جس کو میں آج دیکھ رہا ہوں، اُس کو دیکھنے کے لئے میں زندہ نہ رہوں گا، اُس وقت معلوم ہوگا کہ اِس بڈھے کی روح پر اِن خطرات کو سوچ کر کیا کیا گزری، کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے گا کہ میں (گاندھی جی) ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار ہوں، کیا کیا جائے، آج ہر ایک آزادی کے لئے بے قرار ہے۔ میں تو آزادی اور تقسیم کو سوکھی روٹی سمجھتا ہوں۔ اگر کانگریس کے لیڈر اِس کو کھاتے ہیں تو درد قولنج میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر انکار کرتے ہیں تو فاقہ کرتے ہیں۔

بتاریخ 3 جون ورکنگ کمیٹی کا تاریخی اجلاس ہوا..... کمیٹی نے پہلے صوبہ سرحد پر غور کیا۔ نئے پلان نے صوبہ سرحد کے لئے نئی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ خان عبدالغفار خان اور اُن کی پارٹی نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی۔ لیگ خان برادرز کو اپنا جانی دشمن سمجھتی تھی۔ تقسیم نے اُن کو اور خدائی خدمت گاروں کو لیگ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ بادشاہ خان گُم سُم ہو گئے، اُن کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے کہا کہ اگر کانگریس ہمیں چھوڑتی ہے تو اِس کا ردعمل صوبہ کے لوگوں پر بڑا سخت ہوگا، ہمارے دشمن ہمارے ساتھی بھی یہی کہیں گے کہ جب تک کانگریس کو غرض تھی، انہوں نے صوبہ سرحد اور خدائی خدمت گاروں کا ساتھ دیا لیکن جب کانگریس نے مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنا چاہا تو اُس نے بغیر صوبہ سرحد کے تقسیم

کی مخالفت ترک کر دی۔ بادشاہ خان نے بارہا کہا کہ صوبہ سرحد کے لوگ اِس کو دغا بازی کہیں گے کہ اگر کانگریس نے اِن کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا۔ پٹیل اور راجہ جی نے ریفرنڈم پر بڑا زور دیا۔ جب کمیٹی نے یہ فیصلہ کر لیا تو بادشاہ خان نے گاندھی جی اور کمیٹی کے منہ پر کہا، ہم پختون آپ کے شانہ بشانہ رہے اور آزادی کے لئے بڑی قربانیاں دیں لیکن چونکہ آپ نے ہمارا ساتھ ہی نہیں چھوڑا بلکہ بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا، ہم ریفرنڈم کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ ہم نے ہندوستان اور پاکستان ایشو پر فتح حاصل کی ہے اور دنیا کے سامنے پختون کی رائے پیش کر دی ہے۔ ہم ہندوستان اور پاکستان کے ایشو پر ریفرنڈم نہ کریں گے، اگر ریفرنڈم ہونا ہے تو پاکستان اور پختونستان کے ایشو پر ہو، بادشاہ خان کمیٹی سے دل برداشتہ ہو کر باہر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور توبہ توبہ کہنے لگے، ہائی کمانڈ نے بغیر ہم سے مشورہ کئے فیصلہ کیا تھا، پٹیل اور راجہ جی بضد تھے۔ صرف گاندھی جی نے مخالفت کی (نہرو نے ایک لفظ بھی نہیں کہا جو بڑا معنی خیز ہے) پٹیل نے کہا پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ مولانا آزاد جو بادشاہ خان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہا کہ اب مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے (اِس انکشاف سے مولانا کے افکار میں کوئی اضافہ نہ ہوا) کمیٹی کے بعد خان عبدالغفار خان نے گاندھی جی سے کہا، مہاتما جی آپ نے تو ہمیں بھیڑوں کے آگے ڈال دیا ہے، گاندھی جی نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا کہ اگر خدائی خدمت گاروں کے ساتھ مناسب برتاؤ نہ ہوا تو حکومت ہند اُن کی امداد کرے گی، میں خود حکومت کو یہی مشورہ دوں گا، گاندھی جی نے غنی خان کے سامنے پھر یہی کہا، غنی نے سوال کر دیا مہاتما جی آپ تو عدم تشدد کے پیروکار ہیں، گاندھی جی نے کہا کہ "تم میرے عدم تشدد کی پروانہ کرو میں عدم تشدد کا ماننے والا ہوں، حکومت ہند کا نہیں۔"

لیکن گاندھی جی اِس قدر جلد شہید ہو گئے کہ وہ اپنے وعدوں کو پورا نہ کر سکے اور پختونستان آج بھی بھیڑیوں کے پنجوں اور جبڑوں میں پڑا تڑپ رہا ہے اور سسک رہا ہے!!!

کیا آج کے ہندوستان میں کوئی گاندھی جی کے وعدوں کو پورا کرنے والا ہے جو اِن مظلوموں کو دردناک موت سے نجات دلائے!

☆☆☆
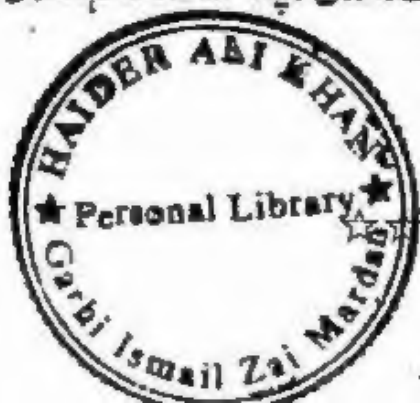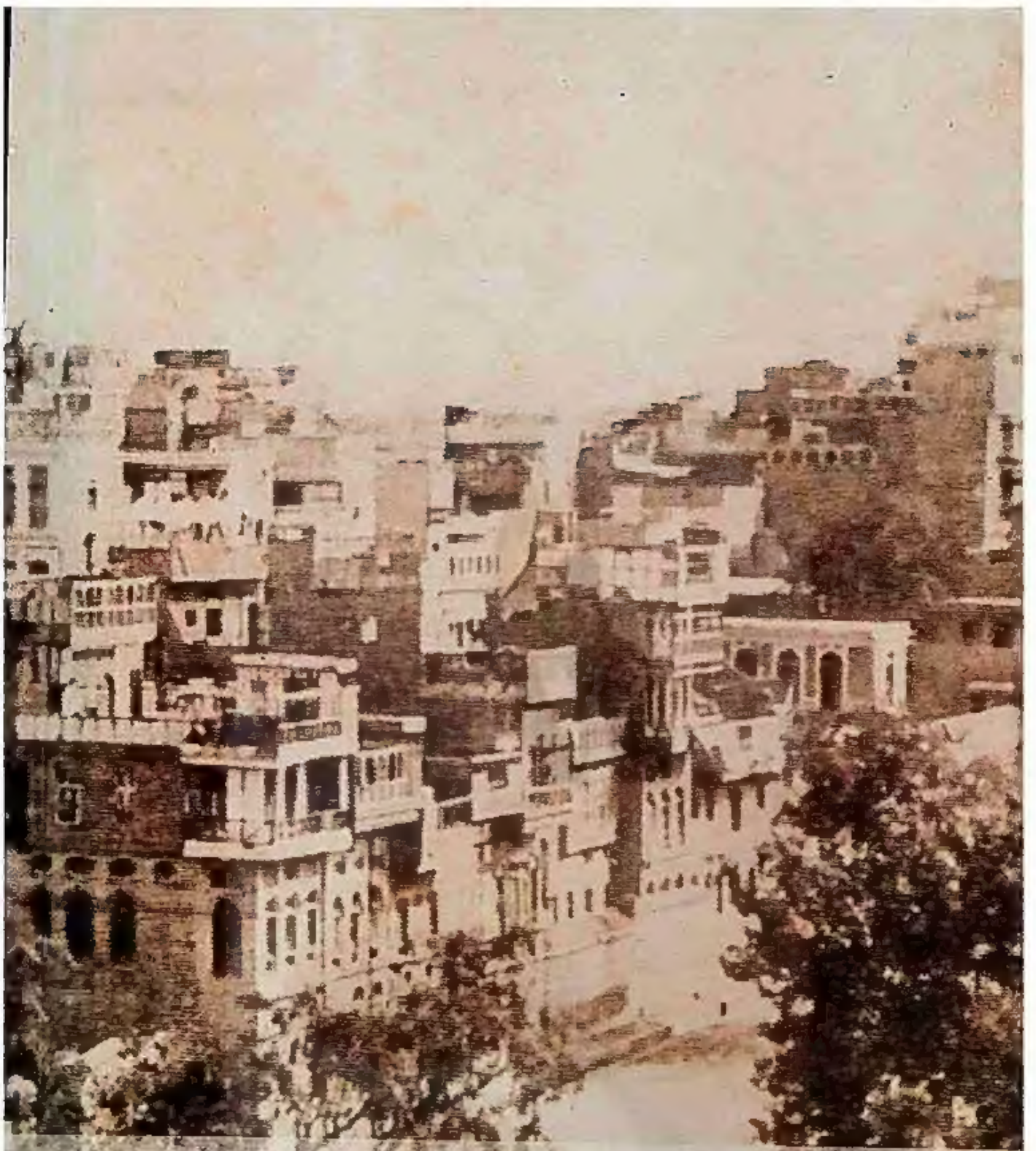
فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ لاہور
E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430
ISBN 978-969-562-053-3